ادھ ادھورے لوگ
ناول
محمد حفیظ خان

اَدھ اَدھورے لوگ

محمد حفیظ خان

یکے از مطبوعات

ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ ملتان

Novel Translated from Sara

"Adh Adhorey Log

written by

Muhammad Hafeez Khan

(Tamgah e Imtiaz)

November 2018

Price: Rs.400

Published by

Multan Institute of Policy and Research

62-B, Sakhi Sultan Colony Multan

Printed by: BPH Printers, Lahore

ISBN: 978-969-9782-17-6

سرائیکی سے ترجمہ کیا گیا ناول

اَدھ اَدھورے لوگ

مصنف: محمد حفیظ خان (تمغۂ امتیاز)

اشاعت: نومبر 2018ء

قیمت: چار سو روپے

ملتان انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ

62-B سخی سلطان کالونی ملتان

raihafeezkhan@gmail.com

(1)

احمد پور بھی عجیب شہر ہے۔ یہاں کے ریلوے اسٹیشن کا نام تو ڈیرہ نواب صاحب ہے مگر
ڈیرہ نواب صاحب یہاں سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ ریلوے اسٹیشن اور اصلی ڈیرے کے
درمیان پہلے احمد پور کا شہری علاقہ آتا ہے، پھر نواب صاحب کی فوجی چھاونی اور چھاونی کے بعد
ڈیرہ نواب کی حد شروع ہوتی ہے جس کے چھوٹے سے بازار کے بائیں جانب صادق گڑھ پیلس
کی پُر وقار عمارت ہے اور دائیں جانب ریاستی دفاتر کے بڑے صاحبوں کی حویلیاں اور بنگلے۔
جب کہ صادق گڑھ پیلس، نواب بہاول پور کا رہائشی محل ہے جس کے اطراف بیس بیس فُٹ
بلند فصیلوں کے سبب پینتیس فٹ اُونچے مرکزی دروازے کے اندر سے دودھ کی مانند سفید عمارت
ہرے بھرے سبز گھنے درختوں میں کہیں چھپی ہوئی اور کہیں اُن میں سے بار بار جھانکتی ہوئی دکھائی
دیتی ہے۔ مرکزی دروازے سے سفید عمارت تک تقریباً ایک فرلانگ طویل سڑک ہے جس کے
دونوں جانب سرو کے اُونچے اُونچے درختوں کی قطاریں اور ہر قطار میں برابر برابر فاصلے پر ہمہ
وقت پہرے پر موجود نواب صاحب کے باوردی مستعد باڈی گارڈ۔ فولادی گاڈر جتنے بلند قامت
اور بل کھاتی ہوئی گھنی مُونچھوں والے یہ پُھرتیلے نوجوان نواب صاحب کا ذاتی انتخاب ہوا کرتے

کہ جن کی اکثریت محل کے قرب میں واقع سب سے زیادہ متمول لوگوں کی بستی محراب والا کے لشاری بلوچوں سے تعلق رکھا کرتی تھی۔

محل کے شرقی جانب کی فصیل طویل ترین تھی، ہوگی یہی کوئی دو میل کے لگ بھگ جس کے اوپر ہر پچاس فُٹ کے بعد ایک بُرجی اور ہر بُرجی میں پہرے پر موجود بیک وقت تلوار اور توڑے دار بندوق کے ساتھ مسلح ایک سنتری۔ توڑے دار بندوق کے ساتھ فائر کرنے کے لیے کپڑے کی واٹویں بتّی کو سُلگانے کے بعد کچھ دیر تک بندوق چلنے کا انتظار کیا جاتا کہ آنچ کارتوس تک پہنچ پائے لیکن اِس دوران اگر کہیں دشمن سر پر پہنچ جاتا تو بندوق پھینک کر تلوار سے خود حفاظتی کا فریضہ انجام دیا جاتا۔ لیکن بُرجیوں میں موجود اِن سنتریوں کی زندگی میں نہ تو کبھی بندوق چلانے کی نوبت آئی اور نہ ہی تلوار کی کیونکہ ریاست بہاول پور کا اَمن امان پورے ہند سندھ میں اپنی مثال آپ تھا۔ نہ تو کسی نے ایک عرصے سے ریاست پر چڑھ ماری اور نہ ہی نواب صاحب مزاجاً حملہ آوری کو پسند کرتے تھے۔ اُنہوں نے پوری ریاست میں اسکول، کالج اور ہسپتال بنوائے۔ ہر شہر کا اپنا پاور ہاؤس لہذا بجلی وافر اور نہری نظام پر کڑے کنٹرول کے سبب زراعت فراواں اور منڈیاں اجناس سے بھری ہوئیں۔ ناں کوئی چوری چکاری اور نہ ہی کوئی قتل یا ڈاکہ۔ سنتے تھے کہ پُلس کے ہتھیاروں کو بار بار زنگ لگ جایا کرتا تھا جسے ہر بار رگڑ رگڑ کر اُتارا جاتا۔

یہ جولائی 1947ء کی کوئی حبس زدہ شام تھی۔ میونسپلٹی کا ہرکارہ کندھے پر اپنے قد برابر سیڑھی رکھے اور ہاتھ میں مٹی کے تیل کا ٹین اُٹھائے گلی محلوں میں سے گزرتا ہوا ڈیرے کے بازار میں تقریباً بیس بیس فُٹ کے فاصلے پر زمین میں دبے ہوئے لکڑی کے کھمبوں میں ٹھوکی گئیں بڑی بڑی لالٹینوں کے شیشے صاف کرنے کے بعد اُن میں مٹی کا تیل بھر کر اُنہیں روشن کیے جا رہا تھا تا کہ اندھیرا ہو جانے کے بعد بھی اندھیرا نہ ہو۔ اِسی طرح صبح سویرے فجر کی اذان سے پہلے لالٹین بُجھانا بھی اُسی کی ذمے داری تھی۔ اُدھر صادق گڑھ پیلس کی بلند فصیلوں پر نصب شدہ شیشے کے چوکور لیمپ بھی ایک ایک کر کے روشن ہونے شروع ہو چکے تھے مگر اِس کے باوجود کچھ عجیب میلا

میلا سا اندھیرے جیسا اندھیرا تھا۔ ڈیرہ نواب صاحب کے مرکزی بازار کے دکاندار وادھو نے اپنی لونی تیلی کی دُکان بند کرتے ہوئے دھچر دھوبی کو آواز دی۔

''او یار...... لگتا ہے کہ بکروال بادل پہنچا سو پہنچا۔''

''ساون ہے تو بکروال بھی آئے گا، کون سی انوکھی بات ہے''..... دھچر نے وادھو کو جواباً آواز دیتے ہوئے مخصوص لہجے میں بُلارا کیا۔ وادھو دُکان کے تمام طاقچے جوڑنے کے بعد دھچر کے پاس آن بیٹھا جو اُمڈتے بادلوں کا موڈ بھانپ کر تیزی سے دُکان کے سامنے استری والے پھٹے پر رکھے ہوئے اَن دُھلے کپڑوں کے انبار کو اندر کی جانب دھکیل رہا تھا۔

''بات صرف بکروال بادلوں کی نہیں، یہ تو آئیں گے اور دو چار بوندیں پانی کی گرا کر ادھر اُدھر ہو جائیں گے، اصل بات تو اِس رولے کی ہے کہ یہ ریاست کہاں جائے گی۔ نئے ملک پاکستان کے ساتھ الحاق کرے گی یا یونہی ہندوستان میں شامل رہے گی۔'' دھچر کے لہجے میں اب چڑاچڑاپن آچکا تھا۔

''یار! تیرا میرا کیا واسطہ اِس گڑدھال سے، بہاولپور پاکستان میں رہے یا ہندوستان میں، میں نے یونہی لونی تیلی کرنی ہے اور تو نے لوگوں کی میل دھوتے رہنا ہے۔ یہ رُولا اگر کسی کے واسطے ہے تو اِس بہن کے بہنوئی حکیم رام لعل کے لیے۔ یہ جو چار چوباروں والی اونچی ماڑی بنا کر بیٹھا ہوا ہے ناں، سب کچھ یہیں چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا اِسے''۔ وادھو نے سڑک کے اُس پار حکیم رام لعل کی دوکان کی طرف دیکھتے ہوئے جان بوجھ کر اونچی آواز میں بھڑاس نکالی کہ جو ابھی تک مریضوں سے بھری ہوئی تھی۔

دھچر نے بوکھلا کر ہولے ہولے کھنگارنے کی کوشش کی..... ''ہولے بول یار، کوئی سُنے گا تو کیا کہے گا، ابھی پاکستان کہاں سے بننے لگا۔ بھلا آدمی ہے بے چارہ حکیم، گھر چاہے احمد پور میں ہے مگر خدمت پورے ڈیرے کی کرتا ہے، ہر وقت حاضر، نہ کوئی لوبھ نہ کوئی لالچ۔ ہاتھ میں شفا کا تو کیا کہنا، اخیر ہے۔''

''لیکن ہے تو کراڑ ناں..... شفا کو کسی نے گھول کے پینا ہے کیا۔'' وادھو نے چڑ کر سر کو جھٹکا دیا مگر فوراً ہی لہجہ بدل کر ہولے ہولے منمنایا....

''یار دَھیر! سنا ہے کہ نہرو اپنی بہن بھیج رہا ہے دولہا صادق سئیں کے پاس۔''

''جاؤ جاؤ.... نہرو کا اب کیا یہی کام رہ گیا ہے''..... دَھیر سامان سنبھال کر دُکان کی چوکھٹ کی جُھری میں دَروازے کے پھٹے جوڑ کر لگا رہا تھا۔

''پوری بات تو سُن...... آج نبی بخش خدمت گار آیا تھا میرے پاس، وہی بتا رہا تھا کہ کوئی لکشمی ہے نہرو کی بہن، دولہا سئیں کو راضی کرنے کے لیے آ رہی ہے کہ ریاست کو ہندوستان کے ساتھ ہی رہنے دیا جائے..... پاکستان کے ساتھ شامل ہو کر کیا ملے گا..... نیا مُلک اور بُھکا مُلک...... جناح صاحب کے پاس تو ملازموں کو تنخواہیں دینے کے پیسے بھی نہیں ہوں گے، مُلک کہاں سے چلے گا۔'' وادھو کا بُلارا پھر سے کُچھ اُچیرا ہو گیا تھا۔

اتنے میں زور کا کڑاکا ہوا۔ بادل گرجا نہیں بلکہ دھاڑا، کہیں بجلی گری تھی اور اِس کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

''اَب پہنچ گئے گھر''...... دَھیر نے کڑھتے ہوئے خود پر طعنہ زنی کے سے انداز میں کلام کیا اور بھیگنے سے بچ رہنے کے لیے دوکان کے اگلے چھپر کی اوٹ میں ہو گیا۔ ''یار بس خوامخواہ کی باتوں میں مجھے لگا لیا..... نِکی کو بخار تھا اور بھابھی تمہاری گالیاں دے رہی ہو گی مجھے۔''

''یہ عورتوں کا کیا ہے، اِنہوں نے کبھی خوش نہیں ہونا ہوتا چاہے باندروں کی طرح اُلٹے بھی لٹک جاؤ..... اِس لیے بھائی میرے حوصلہ رکھو اور من موجی کیا کرو.....'' وادھو برستی بوندوں کی بوچھاڑ تلے ہاتھ پھیلا کر چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔

''اُو وادھو یارا..... عورتوں کے بغیر بھی گھر، گھر نہیں رہتے، رُل جاتے ہیں۔'' دھیر کے چہرے کی پریشانی کَھمن کے لشکارے کی طرح بار بار نمایاں اور کم نمایاں ہو رہی تھی۔

وادھو نے سرد آہ کھینچی اور پاؤں کے بھار بیٹھ گیا.... ''میری عورت بھی تیری عورت کی

طرح منہ متھے والی ہوتی، پتر جن کے بیٹھی ہوتی تو میں بھی اُس سے ملنے کی آس میں ٹھنڈی آہیں بھرا کرتا''۔

''ٹھنڈی آہیں تو تم بھی بھرتے ہو مگر ظاہر نہیں ہونے دیتے، پکے میسنے ہو''۔ دھچر بھی چڑ چڑا پن چھوڑ کر برسات کا مزہ لینے لگ گیا تھا۔ ''اچھا...... یہ تو بتاؤ وہ مائی لکشمی آ کب رہی ہے''.....

وادھو نے زور سے قہقہ لگایا..... ''یار وہ مائی لکشمی جانے یا ہمارا دولہا صادق سیئں، مجھے کیا خبر''.................

''یار وادھو! مجھے تو یہ کوئی چکر لگتا ہے۔'' دھچر نے بارش تھمنے کی آس میں بات بدلنے کی کوشش کی۔

''چکر کیا ہے، بس آپ تڑاپی ہے۔ ریاست بہاول پور دِلی سے لے کر ملتان تک کے اتنے وسیع علاقے کا اَدھوادھ تو ضرور ہے۔ ریاست جاتی ہے ہندوستان کے ساتھ تو پاکستان کے پلے کچھ نہیں رہتا اور اگر شامل ہوتی ہے پاکستان میں تو بس یوں سمجھو کہ نہرو کو کلیجے والا ہاتھ پڑے گا۔ یہ بیکانیر اور جیسلمیر تنکے سے بھی ہلکے ہونگے بہاول پور کے بغیر۔ اِسی لیے تو ہر کوئی چاہتا ہے کہ ہم لے اُڑیں بہاول پور کو اپنی جانب۔'' لمبی بات ختم ہوئی تو وادھو نے بھی لمبا سانس اندر کو انڈیلا۔

''میری بات کا جواب نہیں دیا تم نے''۔ دھچر پر پھر چڑاچڑا پن سوار ہو چکا تھا۔

''اب مجھے کیا خبر کہ کب تشریف لے آئیں گی بی بی لکشمی دولہا سئیں کے ہاں تو جواب کیا دوں۔ جتنی مجھے خبر تھی بتا دی''۔ وادھو بھی جواباً چڑ چڑا ہونے لگا تھا۔ بارش بھی تھمتے تھمتے پھر سے تیز ہو چکی تھی۔ وادھو مایوس ہوا تو دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر پھر سے پاؤں بھار ہو بیٹھا۔ ''یار ناراض نہ ہونا، دن بھر کی دوکانداری نے تو جو حال کیا سو کیا، اِس بارش نے الگ رُلا دیا ہے۔ اب گھر جانا ہوگا تو پھر وہی سوال کہ کسی حکیم کو دکھایا ہوتا تو شاید کوئی بال بچہ ہو جاتا''۔ وادھو کا منہ،

بُتھاڑ بن کر کچھ اور بھی ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

''یار کئی بار تجھے کہا ہے کہ حکیم رام لعل کو تو دکھاؤ، کئی بے اولادوں کی اولاد ہو گئی ہے، پر تو نے تو جیسے قسم اُٹھائی ہوئی ہے نہ دکھانے کی۔'' دھچر موقع دیکھ کر پھر سے شروع ہو گیا۔

''میں اوترک تو مر جاؤں گا مگر اِس کراڑ کو ہاتھ نہیں دکھاؤں گا''۔ وادھو تپ کر کھڑا ہو گیا۔

دھچر ہنس دیا اور وادھو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے بولا ''یار نہ تو دوادارُو کا کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ ہی کسی حکیم کا۔ دوا، دوا ہوتی ہے اور حکیم، حکیم''

''اپنی حجتیں اپنے پاس رکھو۔ ہر چیز کا مذہب ہوتا ہے، دوا کا بھی اور حکیم کا بھی۔ حلال حرام کا فرق ہوتا ہے، جاؤ کوئی اور گھر دیکھو، میرے ایمان کی جڑ مت اُکھیڑو۔'' وادھو نے غصے میں سُتلی والی خالی بوری کی تھیلی سی بنا کر سر پے رکھی اور تیز ہوتی ہوئی بارش کی پرواہ کئے بغیر بھیگتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔
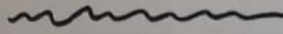
(2)

''اور کھاؤ ناں جندے، اور کھاؤ، جندے پکھی پکھیرو کھاؤ گے تو یہی کچھ ہوگا''۔ حکیم رام لعل ڈیرے نواب کے بڑے بازار کے وسط میں واقع اپنے مطب میں ایک جانب لٹکے ہوئے پردے کی اُوٹ میں بیٹھی ہوئی زنانی کی کلائی پر نبض والی جگہ اپنی دو اُنگلیاں رکھے بیماری کی تشخیص تو کر چکا تھا مگر اب خود اُس کی زبان سے تصدیق چاہ رہا تھا۔ زنانی کی خموشی پر خفا ہونے کی بجائے وہ اُلٹا ہنس دیا۔

''بولو گی نہیں کہ گھر والا ویہوں کا شکار کر کے لایا اور وہی کھائے ہیں۔'' زنانی گو کہ اب بھی چپ رہی مگر شرم سے کچھ اور سکڑ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی خاموشی اور سکڑتے چلے جانے سے لگتا تھا کہ حکیم کی بات سچ ہے۔

''جندے پکھیوں کا اتنا گوشت کھاؤ گے تو پیٹ بولے گا ضرور اور اب اگر پیٹ دھائیں دھائیں کر رہا ہے تو دوائی کھاؤ اور درد کو برداشت کرو، جلدی تھم جائے گا''۔ حکیم نے پرچی پر دوائی لکھی اور بنانے کے لیے چھوٹے کو پکڑانے کے بعد قطار میں بیٹھی پچھلی زنانی سے مخاطب ہوا ''ہاں بی بی، نبض دکھاؤ''۔

حکیم رام لعل ساٹھ کا تو کیا باسٹھ تریسٹھ کا ہو چکا تھا مگر ابھی سٹھیایا نہیں تھا۔ احمد پور کا جم پل اور کئی پشتوں سے پیشہ یہی حکمت۔ صبح سویرے ڈیرہ نواب کے بازار میں اپنے مطب پے آتا اور پھر رات گئے تک یہیں موجود کہ لوگوں کا رش گھٹائے نہ گھٹتا۔ تخت پوش پر براجمان حکیم صاحب کے ایک جانب مردوں کی قطار اور دوسری طرف خواتین کی اور اِن کے درمیان کپڑے کا پردہ ٹنگا ہوا۔ تخت پوش کے اطراف میں چھوٹے خدمت گار جو نسخے کی پرچی پکڑ کر سیدھا دوائی بنانے والے رنگڑے حکیم کو پہنچاتے اور وہ نسخہ پڑھنے کے بعد پُڑیاں بنا کر ہاتھ کے ہاتھ مریضوں کو فارغ کیے رہتا۔ حکیم رام لعل کے ہاں دوا بھی تھی اور شفا بھی مگر مجال کہ اپنی زبان سے ایک دھیلے کا بھی تقاضا کرے۔ کسی نے دے دیا تو سَر آنکھوں پر نہیں تو پرواہ نہیں۔ اِس کے باوجود دن بھر میں اتنا کما لیتا کہ اپنے ساتھ ساتھ کئی اور گھروں کے اخراجات کا بوجھ بھی اُٹھائے ہوئے تھا۔

حکیم رام لعل کا گھر احمد پور کے ہاتھی بازار کے بازو والی گلی میں تھا کہ جو مڑھی کی طرف جاتی تھی۔ دومنزلہ مکان اور چھ کمرے۔ چھوٹا سا دالان اور دالان کے سامنے پوچا لگائی چھوٹی سی رسوئی کہ جہاں نیلے، ہرے اور سُرخ رنگوں کے چھوٹے چھوٹے ٹِکے لگے ہوئے تھے جن میں کچھ ٹِکے دھوپ سندور کے بھی تھے برکت، بخت اور بہتری کے لیے۔ حکیم کے گھر کے چھ کمروں میں سے نچلا ایک کمرہ اُس کی بوڑھی ماں کا تھا کہ جو کب کی جھوک لڈا چکی تھی، دوسرا اُس کا اپنا اور تیسرا مہمانوں کے واسطے تھا جب کہ اوپری منزل پر ایک اُس کی بیٹی ٹُلسی کا، ایک میں ٹرنک اور بستر اور تیسرے میں اُس کی بیوی کا بسیرا تھا۔ گھر آنے والے مریضوں کو حکیم صاحب اکثر مہمانوں والے کمرے میں دیکھا کرتے جس کا ایک دروازہ گلی کی جانب کھلتا تھا۔

ٹُلسی حکیم صاحب کی اکلوتی بیٹی، ہوگی کوئی بیس اکیس برس کی، غضب کی نرم و نازک اور بھرواں بھرواں سی، قامت کشیدہ، رنگت صاف، آگا پیچھا بھرا بھرا اور چال میں لچکیلی شاخ کی طرح کی لوچ اور مستی۔ حکیم کی بیوی ہر وقت ٹوکتی رہتی کہ پچھواڑا چادر میں لپیٹ کر چلا کرے، اگر رُکے بھی تو چہرہ روبرو کر کے، مرد ذات کی دید کا کیا اعتبار، نِرا لوبھ، نِری ندیدگی۔ مگر ٹُلسی کب

تلک اپنا آپ ڈھانپتی، انگ انگ میں جوانی کڑ کے دھمکے تو کوئی کیسے رتھ کو دھیمے دھیمے رواں رکھے، پاؤں میں اپنے آپ سپرنگ سے لگ جاتے ہیں اور دوشیزہ کچھ اس انداز میں اترا کر چلتی ہے کہ جیسے تیز ہوا میں پتنگ بار بار بل کھا کر کچھ اور بلندی کی طلب گار ہوتی چلی جاتی ہے۔ ٹلسی گھر کے کام کاج میں تو پھر بھی اِدھر اُدھر سے چادر لپیٹے رہتی مگر جونہی دھڑ دھڑ کرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھتی تو بہت بڑے گھیر کی چادر بھی اُس کا پچھواڑا ڈھانپنے میں تھوڑی پڑ جاتی۔

ٹلسی نے پانچ جماعتیں تو محلّہ پُھلو رام کے زنانے اسکول سے پڑھ لیں مگر ابھی چھٹی کا آدھ ہی ہوا تھا کہ اسکول سے اُٹھا لی گئی۔ بات یہ نہ تھی کہ کم عقل تھی، اعتراض اُس کے ہونے والے سُسر سوڈھی مَل کو تھا کہ لڑکیوں کے لیے پانچ جماعتیں کافی ہوتی ہیں، اگر زیادہ لکھ پڑھ لے گی تو اُس کو سنبھالے گا کون کیونکہ اُس کا منگیتر وشنو داس تو انتہائی گیا گزرا، بالکل ہی للّن تھا۔ ہونے کی خبر اور نہ ہی نہ ہونے کی۔ منگنی بچپن میں اِس لیے ہوگئی کہ سگا خالہ زاد تھا اور خالہ کو انکار کون کرے۔ وشنو اگرچہ سولہ سترہ برس کا تھا مگر ماں کے مرنے تک ماں کے ساتھ ہی سوتا رہا۔ غضب کا ڈرپوک، نیند میں بھی کچھ ایسا ویسا خواب دیکھ لیتا تو چیخیں نکلنا معمول کی بات تھی۔ اسکول کا منہ تو کیا دیکھنا تھا، دَس گیارہ برس کی عمر ہی میں باپ کی لونی تیلی کی دُکان پر جُڑ بیٹھا۔ چھ سات برس کی محنت کے بعد اتنا تو ہو ہی گیا کہ باپ کی غیر موجودگی میں کسی نہ کسی طور دُکانداری کو ریڑھ سکے۔ ریڑھنا اِس لیے کہ ایک ڈھلڑ لڑکا جسے کسی کا کہا بھی دیر سے سمجھ میں آتا تھا، اِس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا کہ کچھ دیر کے لیے کام چلائے رکھے ورنہ دُکان بند کرنا پڑتی تھی۔ محلے کے لڑکے بالے بھی اِسی تاک میں رہتے کہ کب وِشنو ہَٹی پر بیٹھے اور وہ اُسے ٹِکا ٹِکا کر غاپے لگائیں۔ اِن وارداتوں کی سُن گُن وشنو کے باپ کو ہوئی تو وہ کلھے کلھے بیٹے کے مستقبل سے مایوس ہو کر انتہائی حاجت کے وقت بھی بس آنا جانا ہی کیا کرتا۔ اِس کے باوجود کہ وشنو للّن کسی کام کا نہ تھا مگر سوڈھی مَل کو یقین تھا کہ حکیم رام لعل کی لڑکی کے ساتھ شادی کی صورت میں اُسے گھٹو گھٹ اِتنا جہیز ضرور مِل جائے گا کہ باقی ماندہ زندگی میں وہ روٹی مانی کی فکر سے بچا رہے گا۔ سوڈھی کی کوشش تو

تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے ٹلسی اُس کی بہو بن کر اُس کے گھر آن بیٹھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ وشنو ٹلسی سے پورے پانچ برس چھوٹا اور اُس کے سامنے بالکل بچہ سا لگتا تھا۔ لیکن اس کے ہوتے ہوئے بھی سوڈھی مل کئی بار اپنی سی کوشش کر چکا تھا کہ کسی طور ٹلسی کی رخصتی ہو جائے مگر حکیم صاحب ہر بار ٹال جاتے کہ وشنو ابھی اتنا تگڑا نہیں ہوا کہ گھر اور گھر والی، دونوں کو سنبھال سکے یا اُن کی خبر رکھ سکے۔

دوسری جانب ٹلسی کے لیے بھی یہ سنجوگ اَن بھاتا نوالہ تھا کہ جسے نہ تو نگل سکتی تھی اور نہ ہی اُگل، صرف اُبڑاک کئے جا رہی تھی۔ جب کبھی وِشنو اُس کے ہاں آتا ٹلسی سبھی در دروازے جوڑ کر کوٹھے کی چھت پر چڑھ جاتی اور پرُچھتی میں چھپ کر وہاں پڑی ہوئی پرانی اور بے کار چیزوں کو نئے سرے سے نکھیڑنے لگتی۔ وشنو اُسے کسی زاویے سے بھی جوانمرد نہیں لگتا تھا۔ وہ تو اُس کے واسطے بچونگڑا، جس میں نہ کوئی تیزی اور نہ ہی طراری اُلٹا آلس کی پَنڈ۔ ٹلسی کو رہ رہ کر غصہ آتا کہ خالہ نے آخر اُسے جنا ہی کیوں تھا۔ اور اگر پیدا ہو ہی گیا تھا تو کیا ضروری تھا کہ اُس کے سر منڈھ دیا جاتا۔ مردانگی تو اُسے اپنے باپ میں بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ سُنتی تھی کہ اُس کا باپ بہت بڑا حکیم ہے مگر ایسا حکیم کس کام کا جو اپنی زنانی کی طبعیت نہ ٹھیک رکھ سکے۔ یونہی خوامخواہ ہر وقت اُبلتی رہتی۔ شوہر کے گھر میں داخل ہوتے ہی پورا گھر سر پر اُٹھا لیتی۔ ٹلسی کو غصہ آتا کہ یہ کیسا مرد ہے جو واپسی ٹکور کرنے کی بجائے اپنے کمرے میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ٹلسی کی سمجھ سے یہ بھی بالاتر تھا کہ جونہی اُس کا خالو سوڈھی اُن کے گھر کی چوکھٹ پھلانگتا ہے اُس کی ماں کا غصہ نجانے کہاں دم دبا کر بھاگ جاتا ہے اور اُس کی بجائے ہنسی مسکان کے بھرے بھرے کٹورے اُس کے گالوں سے رِسنے لگتے ہیں۔ سمجھ سے تو یہ بھی ماورا تھا کہ سوڈھی صرف اُسی وقت اُن کے گھر کیوں آتا ہے جب اُس کا باپ اپنے مطب پر ہوتا ہے۔ اُس کی ماں کا من بھاتا ہوتے ہوئے بھی سوڈھی اِس لیے ٹلسی کو نہیں بھاتا تھا کہ اُس کی نگاہیں اُسے اپنے بدن میں سوئی کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اُسے یوں لگتا کہ اُس کا آگا پیچھا غیر ملبوس حالت میں کسی چوک میں پڑا ہوا ہے اور سوڈھی نام کا قصائی سرِ عام اُس کی کھال اُتار رہا ہے۔

ثلسی کو شاید مرد ذات کے نام سے ہی نفرت ہو جاتی اگر اُسے فیاض نہ دکھائی دے جاتا۔ فیاض دو برس پہلے اُس کے ابّا کے مطب پر دوائی کی پڑیاں بنانے کے لیے ملازم ہوا تھا مگر اپنی عقلمندی اور ایمانداری کے سبب تھوڑے دنوں میں ہی پورا مطب سنبھال کر چھوٹے حکیم کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ پنساری سے اصلی ادویات کی خریداری، اُن کی پسائی اور پھر بڑے مرتبانوں میں منتقلی ایسا کام تھا کہ جس کا براہ راست تعلق حکیم رام لعل کے نسخے کی تاثیر اور شفا سے جڑا ہوا تھا۔ جس دن سے یہ کام فیاض نے سنبھالا حکیم بالکل ہی بے چنتا ہو گیا۔ حکیم کبھی کبھی کے لیے اِدھر اُدھر ہوتا تو مریض بنی اُتاولی دوشیزاؤں کی یہی کوشش ہوتی کہ وہ فیاض کو ہی ہاتھ دکھا لیں۔ پہلے پہل تو فیاض نے اپنے آپ کو کُل حکمت تک محدود رکھا اور حکمت سے کتراتا رہا مگر جب حکیم صاحب نے اُس کی سُرت شناس دیکھ کر خود ہی تھپکی دے دی تو جوان دُلکی چال پر آ گیا۔ شروع شروع میں مریضوں پر فیاض کا اعتبار جمانے کے لیے حکیم رام لعل نے یونہی اُسے آواز دے کر بُلا لینا۔

''فیاض حسین او فیاض حسین...... ذرا دیکھنا .... کیا تکلیف ہے اِس بچی کو۔''

فیاض حسین نے تیزی سے حکیم صاحب کی دائیں جانب آن بیٹھنا اور پردے کی دوسری اُور بیٹھی دوشیزہ کی، پردے کے اِس طرف آئی کلائی کو اِس طرح تھامنا کہ اُس کے دائیں ہاتھ کی دونوں اُنگلیاں نبض پر ٹِک جاتیں۔ اُس نے غور کرنے کے سے انداز میں اپنی نگاہیں اوپر کو اُٹھانی اور چند لمحے توقف کے بعد پورے تیقن کے ساتھ بولنا...... ''سئیں ڈکھوترے (حبسِ بول) کی شکایت ہے.....''

حکیم صاحب نے خوش ہو کر فیاض کا کندھا تھپتھپانا اور اُٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہنا

''اب جاؤ اور جا کر تین دن کی دوائی بنا کر لاؤ۔''

فیاض ایک طرف ہوتا تو حکیم نے لڑکی کی ماں کو بلا لینا اور ہولے ہولے اُس کے کان میں نہایت رازداری کے ساتھ منمنانا کہ چھوٹی کو مثانے کی گرمی ہونے لگی ہے، اب شادی کر ڈال

اِس کی۔ ابھی تو قطرہ قطرہ پیشاب آ رہا ہے اور علاج بھی ہو جائے گا، مگر ہو گا عارضی...... پکا علاج اِس کی رخصتی میں ہے۔

فیاض دوائی بنالاتا تو حکیم صاحب نے ایک بار پھر لڑکی کی ماں کے کان میں منمناہٹ کرنی ”یہ لو تین دن کی دوائی، ایک پُڑی دن میں تین بار تین منگر پانی کے ساتھ اور یہ ہے قلمی شورہ مثانے پر ہولے ہولے بہانے کے لیے، باقی اُس کی ذات کرم کرے گی“۔ اِس طرح دن میں دو تین بار فیاض کا امتحان لینے کے بعد حکیم رام لعل نے باقاعدگی کے ساتھ گدی سے اُٹھنا شروع کر دیا تا کہ اِس دوران وہ مریضوں کو دیکھ سکے۔ لیکن اِس کے باوجود حکیم کا دھیان اِدھر ہی رہتا کہ فیاض کے گدی پر بیٹھتے ساتھ ہی عورتوں میں بے چینی کی لہر کیوں دوڑ جاتی ہے۔ بن داس بیٹھی دوشیزائیں بھی کھلبل ہو کر اِسی کوشش میں کیوں ہوتی ہیں کہ حکیم رام لعل کے دوبارہ سے گدی پر بیٹھنے سے پہلے ہی وہ فیاض سے ہی اپنی حقیقت کر کے دوائی لے لیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر حکیم رام لعل مُسکرا دیتا۔ اُسے اپنی جوانی کے دن یاد آ جاتے کہ جب دوشیزائیں بِنا کسی بیماری کے صرف اپنی نبض پر اُس کی انگلیوں کا لمس محسوس کرنے کے لیے مطب میں جھمگٹا لگائے رکھتیں۔

فیاض حسین حسیناؤں کے لیے یونہی باعثِ کشش نہیں تھا۔ وجیہہ اور تنگڑی کاٹھی کا پھرتیلا نوجوان، چھ فُٹ قد، گندمی جھال کی سلونی رنگت، گھونگریالے بال، گھنی موچھیں، کبھی نہ مونڈھی گئی جَت کی نرم و ملائم داڑھی اور بلوچ تھا محراب والے کا۔ اِسی لیے چیروِیں آنکھ اور آنکھ میں ہلکا سائسُرما جس کے سبب اِن کے گوشے کچھ کچھ سیاہ ہو کر اور بھی تیکھے ہو گئے تھے۔ فیاض حسین کا والد نذیر حسین نواب صاحب کے باڈی گارڈ دستے میں شامل تھا جس کے سبھی جوان اپنے جانے مانے قد کاٹھ کے سبب گاڈر جوان کہے جاتے تھے۔ نذیر حسین کی آرزو تو یہی تھی کہ اُس کا بیٹا بھی باڈی گارڈ دستے میں بھرتی ہو جائے مگر اُس کا روح رجوع فوج میں جانے کا تھا ہی نہیں۔

شروع شروع میں نذیر حسین نے بہت کوشش کی کہ کسی طور فیاض کو فوج کی ملازمت کی طرف راغب کیا جائے۔ وہ نور حضور کے ویلے پریڈ کے لیے جاگتا تو بیٹے کو بھی ساتھ لے جاتا۔

جونہی فوجی بینڈ پہلی جنگ عظیم کے ریاستی ترانے ''کھڑی ڈیندی آں سِنھیڑے اناں لوکاں کوں اللہ آن وساوے ساڈیاں جھوکاں کوں'' کی دُھن چھیڑتا تو باڈی گارڈ دستے کے جوانوں کے قدموں کی مستی سے پریڈ گراؤنڈ کی زمین ہل زدہ سی ہو جاتی مگر اس کے باوجود فیاض حسین اُکھڑا اُکھڑا سا اور اُچاٹ ہی رہتا۔ نذیر حسین الگ دل گرفتہ کہ اُس کا بیٹا دس جماعتیں پاس کرنے کے بعد بھی روٹی روزگار کی طرف نہیں آ رہا تھا۔ یوں لگتا کہ وہ کوئی بے چین روح ہے جو اسی اُلجھن میں غلطاں کہ اُسے کرنا کیا ہے۔ نذیر حسین نے اُسے کوئی ہُنر سکھانے کی بھی ترکیب کی مگر ہر کام کا پہلا دن ہی آخری دن ثابت ہو رہا تھا۔ باپ بیٹے کے درمیان اِسی کشمکش کے دنوں میں ایک روز فیاض کو بخار ہو گیا۔ پہلے تو جوان نے پرواہ ہی نہ کی مگر جب بیماری نے پورے طریقے سے لپیٹے میں لے لیا تو نذیر حسین اُسے حکیم رام لعل کے پاس لے گیا۔ حکیم کا مطب دیکھ کر فیاض کو اپنی بیماری بھول گئی ۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ تو کئی برسوں سے اِسی جگہ کی تلاش میں تھا۔ نہ صرف تلاش بلکہ یقین سا ہونے لگا تھا کہ رَب نے باقی کی زندگی میں اُس کا نصیب یہیں کہیں لِکھ رکھا ہے۔

حکیم رام لعل کو مطب کی اُچیری گدی پر بیٹھا دیکھ کر فیاض کو یوں لگا جیسے کوئی راجہ ہے اپنے تخت پہ بیٹھا، رعیت میں شفا تقسیم کر رہا ہے۔ فیاض کو اُس کا مریضوں کی نبض پر دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں رکھ کر بیماری بوجھنا بھی جادو کا کوئی منتر لگتا تھا، ایسا منتر کہ جس میں کوئی رمز بھی چھپی چھپی سی تھی۔ فیاض کے لیے یہ سبھی کچھ بھی حیران کُن تھا کہ وہ خواتین جن کی صورت تو کیا اُن کی پرچھائیں بھی کوئی نہیں دیکھ پاتا تھا، وہ حکیم کے ہاتھ میں اپنی کلائیاں پکڑا بیٹھتی تھیں چاہے پردے کے پیچھے سے ہی کیوں ناں۔ یہ دیکھنے کے بعد تو فیاض مداری کی بانسری کی مانند سحر زدہ اور ساکت سا ہو کر رہ گیا۔ بیماری شِماری یوں غائب ہوئی کہ جیسے کبھی ہوئی ہی نہ تھی اور دوسرے دن ہی فیاض چنگا بھلا اور نواں نرویا ہو کر باپ کے سامنے آن بیٹھا یہ کہنے کے لیے کہ بابا سئیں میں تو بس حکمت سیکھوں گا اور وہ بھی حکیم رام لعل سے۔

نذیر حسین نے ہڑبڑا کر پہلے تو غور سے بیٹے کو دیکھا اور پھر یقین نہ کرنے والے انداز

میں اسے مخول سمجھتے ہوئے زور کا قہقہہ لگا دیا۔ ایک طویل قہقہہ مسکراہٹ میں بدلا تو حیرت سے اُس کا منہ تکتے بیٹے کو ایک بار پھر ہنسی میں یوں اُڑانے کی کوشش کی کہ بھَل بھئی جوان بھَل، دو لہے صادق سئیں کے باڈی گارڈ نذیر حسین کا شیر جیسا بیٹا اب حکمت سیکھے گا اور وہ بھی اُس کراڑ سے۔

''بابا سئیں! اگر وہ کراڑ دوا دارُو کر سکتا ہے تو اُس سے حکمت سیکھنے میں مجھے کس بات کا لحاظ یا کس بات کی شرم۔'' فیاض کی آواز میں بھلے اُترے بخار کی نقاہت تھی لیکن اُس کی آواز میں پنہاں عزم سے صاف لگ رہا تھا کہ جو وہ طے کر چکا ہے اُس سے پیچھے نہیں ہٹنے والا۔

''مگر بیٹا حکیم رام لعل صرف کراڑ ہی نہیں، سخت گیر اور خبطی بھی ہے، وہ تمہیں کیونکر شاگرد بنائے گا۔'' نذیر حسین نے ایک بار پھر راستہ روکنے کی اپنی سی کوشش کی۔

''چھوڑیں ..... نہ کہیں آپ ..... میں خود ہی بات کر لیتا ہوں حکیم صاحب سے''۔ اتنا کہہ کر فیاض حسین اُٹھ کھڑا ہوا مگر نذیر حسین حیرت زدہ سا سوچتا ہی رہ گیا کہ آخر لڑکے کو ہو کیا گیا ہے۔ بیٹے کو ہاتھوں سے نکلتا دیکھ کر اُس نے فیاض کو آواز دی ''ٹھہر اُو پُتر ٹھہر.... میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ، تو کرا کے چھوڑے گا مجھ سے تَرلے اُس کراڑ حکیم کے''۔
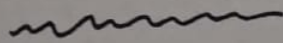
(3)

حکیم صاحب کے گھر کے بیرونی دروازے کی کُنڈی کھڑکی تو چھت پر دھلے کپڑے سوکھنے کے لیے ڈالنے کے بعد سیڑھیاں اُترتی تُلسی کو یوں لگا کہ یہ ٹھک ٹھک دروازے پر نہیں بلکہ اُس کے دل کے کواڑوں پر ہوئی ہے۔اُس نے جلدی میں دو دو قدم ایک ساتھ پھلانگنے شروع کر دیے اور پاؤں زمین سے لگتے ہی وہ دروازے کی طرف لپکی مگر ڈیوڑھی تک پہنچتے پہنچتے ایکدم پیروں کو روکنا پڑ گیا کہ اُس کی ماں برا سامنہ بنائے کپڑے کے ایک تھیلے کو اُس کی ہتھیوں سے اِس طرح لٹکائے چلی آتی تھی جیسے کسی ناپاک چیز کو اُٹھائے آ رہی ہو۔

تُلسی کا دِل بیٹھ سا گیا۔ضرور اُس کے باپ نے فیاض کے ہاتھ کوئی چیز گھر بھیجی ہوگی مگر اُس کی ماں کو کسی مسلمان کی چھوئی ہوئی چیز سے اِس طرح نفرت تھی کہ جیسے اُس کا سب کچھ بد بودار کچرے کی رُوڑی بن گیا ہو۔

''اماں! فیاض ہے؟...... تُلسی نے پھر بھی پوچھ ہی لیا

''اور کون...... وہی ہے مویا مسلا..... ہزار بار کہا ہے تمہارے باپ کو کہ اِس کے ہاتھ گھر کوئی شے نہ بھیجا کرو مگر وہ پھر بھی اُسی کو بھیج دیتا ہے..... بڑا حکیم بنا پھرتا ہے، پاکی پلیطی کی

سندر ہی نہیں''۔ ٹلسی کی ماں تھیلا اُٹھائے بڑبڑاتی جا رہی تھی۔

''اماں ہولے بول..... وہ سُن لے گا''..... ٹلسی دانتوں کو بھینچ کر بولی۔

''تو سُن لے، میری جان تو چھوٹے گی''...... یہ کہہ کر رادھی نے تھیلے کو تخت پوش پر پھینکا اور خود سقاوے کے باہر رکھی پانی کی ولٹوئی میں سے پانی منگر میں نکال کر ہاتھوں پر بہانے بیٹھ گئی۔

ٹلسی تین دنوں سے فیاض کے آنے کا انتظار کر رہی تھی اور وہ آج آیا بھی تو اُس کے کس کام کا۔ معلوم نہیں فیاض کو دیکھتے ہی اُسے کیا ہو جاتا تھا۔ یوں لگتا کہ جس مرد کا ہیولہ اُس کے ذہن میں ہے وہ فیاض کو سامنے بٹھا کر مصور کیا گیا ہے۔ سال سوا سال پہلے جب اُس نے پہلی بار فیاض کو اپنے والد کے ساتھ گھر آتے دیکھا تو بالکل ہی تصویر بن کر رہ گئی تھی۔ پہلے تو بدن میں سُن ہونے جیسی کیفیت اُبھری مگر چند لمحوں ہی میں چھوٹی چھوٹی چنگاریوں نے قیامت برپا کر دی۔ ٹلسی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کرے بھی تو کیا کرے۔ اب تک تو اُس نے اپنے باپ کے علاوہ صرف دو مردوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ اُس کا منگیتر وِشنو اور دوسرا اُس کا ہونے والا سُسر سوڈھی مَل۔ مگر ٹلسی کے نزدیک اِن تینوں میں کوئی بات بھی ایسی نہیں تھی کہ جس کے سبب وہ مرد گردانے جا سکتے۔ جب کہ فیاض کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ تو وہ، اُس کا سایہ بھی اچھا بھلا ئر جوان لگتا تھا کہ جس کا محض سوچ کر بھی ٹلسی کے بدن میں مستی کی لہریں ہچکولے لینے لگتیں اور اُس کا مسام مسام پسینے میں شرابور ہو جاتا۔ اُس کا جی چاہتا کہ فیاض اُسے ہاتھوں کے ساتھ چبائے، چمٹائے، جھنجھوڑے کچھ اِس طرح سختی سے کہ اُس کی ایک ایک پسلی کئی کئی جگہوں سے تڑخ تڑخ جائے۔

اتنا تو ٹلسی بھی جانتی تھی کہ فیاض مُسلا ہے اور ایک مُسلے اور ہندوانی کا کیسا سنجوگ۔ مگر کیا کرتی کہ سنجوگ کے امکانات نہ ہونے نے ہی اِس نامعلوم سانجھ میں کچھ ایسی کشش گوندھ رکھی تھی کہ جس نے اُسے سَر سے پاؤں تلک ''فیاض'' بنا رکھا تھا۔ ٹلسی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ہوا کیا ہے؟ فیاض نے تو پہلی بار آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ اِس گھر میں کسی جوان لڑکی کا نام و نشان

بھی ہے۔ ٹُلسی نے اپنی دادی سے سُن رکھا تھا کہ جوان لڑکے کو جوان لڑکی کی خوشبو سات جُھگے پار سے بھی آجاتی ہے مگر یہ کیسا گبھرو تھا کہ جس نے وَتر پر آئی ہوئی دوشیزہ کو بھال کی نگاہ سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ لیکن اِس کے باوجود ٹُلسی کو اپنے جسم میں سُن ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی سنسناہٹ بھی جاگتی ہوئی محسوس ہوتی کہ جس کا احساس کسی عورت کو مرد کے بھرویں انداز میں دیکھنے میں ہی ہوتا ہے۔ کئی دنوں تک ٹُلسی اِسی اُدھیڑ بن میں رہی کہ یہ کیسا مرد ہے جس نے اُسے پوری طرح دیکھا بھی نہیں مگر پھر بھی پورے کا پورا دیکھ لیا ہے۔ ٹُلسی کو اپنے قیاس پر اس لیے بھی یقین تھا کہ عورت کی زبان تو جھوٹ بول سکتی ہے مگر جسم نہیں۔ جسم کی گواہی تو سات پردوں میں سے بھی صاف پہچانی جاتی ہے۔ سب سے برتر سب سے سچی۔

کچھ دن گزرے، عین دوپہر کے وقت حکیم صاحب کے گھر کی کُنڈی کھڑکی۔ رادھی سقاوے میں نہا رہی تھی اس لیے ٹُلسی یہ سوچ کر کہ کہیں بابا نہ ہو، تیزی سے دوڑی اور دروازے کی کُنڈی کھول کر اُس کی اوٹ میں ہوگئی مگر باہر سے نہ کوئی اندر آیا اور نہ ہی کوئی آواز۔ ٹُلسی سمجھ گئی کہ کوئی اجنبی ہے اِسی لیے ریاستی رواج کے مطابق تین بار ہولے ہولے تالی بجائی یہ بتانے کے لیے کہ اِس وقت گھر میں کوئی مرد موجود نہیں۔ تالی کی آواز سُن کر باہر سے کوئی بولا ''فیاض ہوں میں..... حکیم صاحب نے کچھ سامان بھیجا ہے، لے لیں''۔

فیاض کی آواز سُن کر ٹُلسی کا دل پہلے تو ایکدم دُلکی چال پر آیا مگر پھر اِس طرح سرپٹ دوڑا کہ اُسے اپنے کانوں میں دھماکے ہوتے محسوس ہونے لگے جیسے دھڑکن کی آواز سینے کی بجائے کانوں سے آنے لگی ہو۔ ٹُلسی اُتاولی ہو کر ڈیوڑھی کی اوٹ سے نکل کر فیاض کے سامنے آ گئی۔ فیاض نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں اوپر کو اُٹھائیں مگر فوراً ہی گردن جھکا کر بدستور نیچے دیکھتے ہوئے کپڑے کا تھیلا اُس کے سامنے کر دیا۔ اِس طرح نظر انداز کیے جانے پر ٹُلسی کا دل چاہا کہ وہ یہ تھیلا اُٹھا کر فیاض کے منہ پر دے مارے کہ وہ اُسے دیکھتا کیوں نہیں۔ لیکن جونہی وہ آگے ہوئی اُس کے سَر کی چادر معلوم نہیں کس چیز میں اُلجھی اور اُلجھ کر وہیں رہ گئی۔ ٹُلسی کے ہاتھوں

میں صرف تھیلا ہی بچ گیا۔ آن کی آن میں اُس کا سرولی آم جیسا سراپا فیاض کے سامنے تھا۔ ٹُلسی گھبرائی تو اُلٹے قدموں اندر کی طرف دوڑی۔ بس یہی یاد رہا کہ فیاض اُسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہ گیا تھا۔ کچھ آگے جا کر ٹُلسی کو اپنے جسم کے پُشتیلے حصوں پر بہت سی بھوری چیونٹیوں کے ایک ہی ہلے میں کاٹنے جیسا احساس ہوا تو اُس نے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ فیاض وہیں کا وہیں جامد سا ہوا اُسے حیرت سے تکے جا رہا تھا۔ ٹُلسی کو اپنی ماں کی آواز نیم سوختہ چوانتی کی مانند سماعت کو داغتی محسوس ہوئی جو کہا کرتی تھی کہ اپنا آگا پیچھا ڈھانپ کر رکھا کرو، کسی ندیدے نے دیکھ لیا تو جوٹھا کر چھوڑے گا۔

ٹُلسی تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو پھولی ہوئی سانس قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ اُسے فیاض کا یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھنا کسی طور بھی نہ تو ندیدگی لگا اور نہ ہی وہ کہیں سے جوٹھی ہوئی۔ بس ایک سرشاری تھی، سرور تھا جو کسی مور کو اپنے پر پھیلا کر والہانہ رقص کے بعد محسوس ہوتا ہے، کسی گوّیے کو اپنی زندگی کی سب سے اونچے سُروں والی گائیکی، کسی مصور کو اپنی خوبصورت ترین تصویر کی نمائش اور کسی فاسٹ باؤلر کو مخالف بیٹس مین کی وکٹیں اُڑانے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔

چند لمحوں کے بعد ٹُلسی کی سانس میں سانس آئی تو وہ نِوار والے رَنگلے پلنگ کی جس سمت بیٹھی ہوئی تھی اُسی جانب پیچھے کی جانب اِس طرح دَبک کر کے گری کہ پنڈلیاں ہوا میں معلق ہلی جا رہی تھیں۔ ”کیا ہر دوشیزہ اسی طرح اپنا آپ کسی من چاہے مرد پر ظاہر کر کے بے جان سی ہو جاتی ہوگی۔ کیا وہ سبھی کچھ جو ماں چھپا کر رکھنے کو کہتی رہتی ہے، لڑکیوں کی فطرت کے خلاف کیوں ہوتا ہے۔ اگر یہ سب کچھ اِسی طرح سے ہے تو ہم انسانی فطرت کی مخالف سمت ہی کیوں بھاگتے رہتے ہیں۔ کیا یہ بُڑھاپا اور نت نئی بیماریاں ہمارے لیے فطری تقاضوں کے برعکس زندگی گزارنے کا عذاب تو نہیں ٹُلسی حیران تھی کہ یہ سبھی باتیں اُسی وقت ہی کیوں اُس کے ذہن میں آئے چلی جا رہی تھیں۔ معلوم نہیں کب اُس نے ابو کی کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ ماہواری کی بندش والی عورتیں

شکل سے بدشکل ہو کر بالکل ہی بُجڑ جاتی ہیں۔

''اور اگر یہ بندش عورت کے اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور اُس کے اپنے آپ کے اظہار پر لگا دی جائے تو ایسے میں کیا وہ عورت، عورت رہ سکے گی''...... ٹلسی کو اپنی بات کا جواب نہ ملا تو اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ دل چاہ رہا تھا کہ پھر کہیں سے کوئی کُنڈی کھڑکے، وہ دوڑ کر دروازہ کھولے اور سامنے فیاض کو موجود پائے، اور پھر.... اور پھر وہ اُسے اپنی پلکوں میں چھپالے، اپنا سبھی کچھ دکھانے اور اُس پر آشکار کرنے کے لیے۔ کسی بھی بندش کے بغیر کیونکہ وہ فطرت کو اپنے خلاف کر کے بدشکل نہیں ہونا چاہتی تھی۔

اُدھر فیاض بھی کسی نئی کھڑاند میں پاؤں پاؤں اُترتا جا رہا تھا۔ آج اُس نے ایک لڑکی کے جسم کو بھرپور عورت کا جسمانی روپ پہنتے دیکھا تھا۔ وہ ابھی تک حیران وششدر اپنے آپ سے پوچھے جا رہا تھا کہ عورت کے جسم میں یہ مستی کہاں سے آتی ہے ۔خون کے بہاؤ میں ہوتی ہے یا ماس میں؟ اگر خون میں ہوتی ہے تو اُسے بار بار چھمکاں مار مار مہمیز کون کرتا ہے اور اگر یہ ماس میں ہوتی ہے تو اِسے جُھلاتا کون ہے، تھڑکاتا کون ہے؟ کیا کسی دوشیزہ کا جسم اِس طور کا جادوگر بھی ہو سکتا ہے کہ دیکھنے والے کو سَرتاپا مُسخر کر لے، منجمد کر دے؟ کیا اُس کا یوں مُسخر ہو جانا کسی گمشدہ چیز کی تلاش تھی یا زندگی کی کوئی نئی رمز اُس پر کھلنے جا رہی تھی؟ اگر یہ تلاش تھی تو کس شے کی تھی؟ کیا کسی شناخت کی تلاش؟....... مگر کیسی شناخت اور کیسی رمز....... نہ کسی کا شروع نہ کسی کا اخیر!

کیا کہیں ٹلسی اور فیاض اپنی اپنی شناخت کی تلاش میں تو نہیں تھے! ایک کا جسم اُس کا ہوتے ہوئے بھی اُس کا ہونے نہیں دیا جا رہا تھا اور دوسرا اپنے ہونے یا نہ ہونے کے درمیان معلق تھا۔ ٹلسی اور فیاض دونوں اپنے اپنے ہونے کی شناخت میں من مرضی کرنا چاہتے تھے اور شاید یہی شعوری بحران اُنہیں ایک دوسرے کے قریب کھینچے چلا آ رہا تھا۔ مگر دونوں اپنے اپنے گھر والوں کی کھینچا تانی میں سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ یہ کیسی شناخت ہے جو پہچانی ہی نہیں جا رہی۔ شناخت جسموں سے ہوتی ہے یا جسم اپنی شناخت خود تلاش کرتے ہیں، یہ ایک ایسی اُلجھی ہوئی گرہ تھی کہ جو

دونوں سے کھولے نہیں کھل رہی تھی۔

اُس روز تو فیاض کو پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کیسے پیدل چلتا ہوا احمد پور سے ڈیرہ نواب عید گاہ تک پہنچ گیا۔ تین میل کا یہ سفر عام طور پر گھوڑے تانگے پر کیا جاتا تھا جو گلو آلی چُنگی سے دستیاب ہوتے کہ جہاں اُن کا چھوٹا سا اڈہ بنا ہوا تھا۔ مگر آج تو یہ فاصلہ کچھ اِس طرح سے سُکڑا کہ سُکڑ کر اُس کے پاؤں میں آ گیا۔ حکیم رام لعل کا مطب تو عید گاہ سے محض دو چار منٹوں کے فاصلے پر تھا۔ اتنا پیدل چلنے کا سوچ کر پہلے تو فیاض کی ٹانگوں میں تروڑ سا محسوس ہوا، پھر درد کی ٹیسیں اور سنسناہٹ۔ آخر کار وہ ایکدم عود کر آنے والی تھکن کے سبب ڈیرہ نواب کا بازار شروع ہونے سے پہلے ہی چھوٹے سے ٹی چوک میں بنے ہوئے فوارے کی منڈیر پر بیٹھ گیا کہ جہاں سے بائیں جانب ایک پکی سڑک نواب صاحب کے محل کے غربی سمت والی فصیل کے ساتھ ساتھ رواں ہوتی ہوئی مرکزی دروازے کے مقابل شاہراہ سے جُڑ جاتی تھی۔

فیاض کے گھومتے دماغ کو اپنے اطراف میں گرد ہی گرد دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ششدر تھا کہ یہ ہوا کیا ہے اور کیا ہونے جا رہا ہے۔ کیا کسی دوشیزہ کا وجود دیکھنے والے پر اِس طور بھی اثر انداز ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے موجود سے ناموجود میں دھکیل دیا جائے؟ وہ تو اپنی منزل کی تلاش میں تھا مگر اُس کی منزل ہے کہاں! کیا اُس نے حکیم صاحب کے مطب پر لوگوں کی نبض کے راہیں اُن کے امراض کھوجنے تھے یا تُلسی کے جادوگر جسم میں سے جینے کی کوئی رَمز تلاش کرنا تھی؟ ابھی تک تو اُسے یہ سُدھ بھی نہیں تھی کہ اصل تُلسی ہے کون سی، وہ جس کا اُس نے آگا دیکھا تھا یا پھر وہ جو اُسے پیچھے بھر دوڑتی ہوئی دکھائی دی تھی۔ سوچتے سوچتے اُس کی سُرت جواب دے گئی کہ عورت ہے کیا، کیسی مخلوق ہے جو صرف دیکھنے ہی میں ہوش سے بیگانہ کر دیتی ہے، حواس گھما دیتی ہے؟ کیا ہے اِس میں، کس چیز کی بنی ہوئی ہے؟ اِس کا لطف و مزہ کیسا اور یہ اِس قدر دل کش کیوں ہے؟

فیاض کافی دیر تک دونوں ہاتھوں سے سَر پکڑے گردن جھکا کر بیٹھا رہا۔ کچھ دیر کے بعد اُس کے دماغ میں ایکدم ایک نیا خیال چکرانے لگا۔ ''یہ سب کچھ اب تک اُس کے ساتھ کیوں

نہیں ہوا؟ اُس نے لاتعداد لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں، کتنی دوشیزاؤں کی ماسلی کلائیاں اپنے ہاتھ میں لے کراُن کی نبض کو کھوجا ہوگا مگر نہ تو کسی کے دیکھنے نے اُس کے اندر کولرزاں کیااور نہ ہی کسی کی نبض کی چال نے اُس کے دل کی دھڑکن کے ساتھ اٹھکیلیاں کیں۔کیا ہر جوان لڑکی تُلسی نہیں ہوتی اور اگر ہر جوان لڑکی تُلسی نہیں ہوتی تو تُلسی میں ایسا خاص کیا ہے، ایسا الگ کیا ہے دیکھنے والا گھبرو اپنی شناخت بھول کر محض اپنی تلاش میں، اپنی جستجو میں نکل کھڑا ہوتا ہے؟''

فیاض کے بدن میں زندگی نے جیسے پھر سے حلول کیا۔اُس نے آسمان کی اُور دیکھا ۔شام ہونے لگی تھی اور آتی سردیوں کی خوشبو لیے ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا نے اُس کے جسم میں میٹھی میٹھی بے چینی اُنڈیلنی شروع کر دی تھی۔اُس نے اُٹھ کر فوارے میں سے اُڈتی پھوار کو دونوں ہتھیلیوں کی کٹوری میں بھر کر منہ پر چھینٹے مارے تو یوں لگا جیسے ابھی ابھی جل بُجھے اینٹوں کے بھٹے کی راکھ پر کسی نے پانی کا ایسا سوکھا چھڑکاؤ کیا کہ جس میں سے ٹھاڈِل کی بجائے تپش نکل رہی ہو۔دو تین بار کے چھینٹوں کے بعد اُس کے ذہنی کھولاؤ کو تھوڑا سا قرار آیا تو وہ پھر سے فوارے کی منڈیر پر چڑھ بیٹھا۔''کیا اب تک جس شناخت کی تلاش میں وہ گھبرایا سا سرگرداں تھا وہ صرف تُلسی کی تلاش تھی؟ کیا تُلسی اُس کا کوئی بچھڑا ہوا انگ ہے جسے تلاشنے کی جستجو نے اُسے نواب صاحب کی فوج کی ملازمت ہی نہ کرنے دی اور نہ ہی کوئی اور کام، سیدھا کسی مقناطیس کی مانند کھینچ کر اُسے اپنے والد کے مطب میں لا کھڑا کیا؟ کوئی عورت کس طرح کسی مرد کا بچھڑا ہوا وجود ہو سکتی ہے اور وہ بھی تُلسی طرح کی دوشیزہ جس کے ساتھ نہ تو کوئی تعلق نہ ہی کوئی واسطہ؟ وہ کہاں پیدا ہوئی اور میں کہاں! اُس کا مذہب الگ اور میرا جدا۔

اور اگر تُلسی میری جستجو، میری تلاش نہیں تو میری تلاش کون ہے، میں کسے ڈھونڈ رہا ہوں؟ میری پہچان اور میری شناخت کیا ہے، مجھے کوئی کیوں نہیں پہچانتا؟ یہ کیسی گرد ہے جو میرے وجود کو لپٹی ہوئی ہے کہ جس کے گھیر میں، میں اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان پا رہا۔

(4)

اَج تو وادھو گھر میں طیش کا ٹوکرا سَر پر اُٹھائے ہوئے داخل ہوا تھا۔ آتے ہی کوئی کان قصور نہ ہوتے ہوئے بھی دو تین بُجو اپنی بیوی مہراں کے منہ پر جڑ دیے۔ ''گندی رَن آ...... اب تک کوئی بال بچہ پیدا کر لیتی تو مجھے دھیلے دھیلے کے لوگوں سے ٹکے ٹکے کی باتیں نہ سُننی پڑتیں''۔

مہراں تو بُجو کھانے کے بعد تکلیف سے بل کھاتی چلی گئی مگر وادھو کی ماں نے گُو کا راڑا مچادیا۔

''کچھ تو شرم کرو وادھو! کیوں مار رہے ہو بے چاری کو۔ نہ حکیم کے پاس لے جاتے ہو اور نہ ہی رب کی رضا تسلیم کرتے ہو۔ اب خود ہی کہو کہ یہ بے چاری جائے تو جائے کہاں'' .... وادھو کی ماں بہو کو سینے سے چمٹا کر ہانپنے لگی تھی۔

''اماں تو طرفداری نہ کیا کر اِس بانجھ کی...... یہ اگر کسی کام کی ہوتی تو اب تک دس بار گبھن ہو چکی ہوتی...... سارا قصور اِسی حرامزادی کا ہے۔'' وادھو بار بار مہراں کی جانب لپک رہا تھا کہ ایک دو ہاتھ اور جڑ سکے۔

''خبردار میرے مرے ہوئے ماں باپ کو گالی نہ دینا۔'' وادھو کی بیوی ساس کی گرفت

سے نکلتے ہوئے سینہ تان کر اُس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ ''مان لیا کہ میں بانجھ ہوں، دفع کر مجھے اور لے آ کوئی دوسری اِس گھر میں........ میں بھی دیکھوں ناں کہ کتنے دنوں بعد تمہارے بچے کھیلتے ہیں اِس دالان میں''۔

''دیکھ دیکھ اماں دیکھ تو ذرا چڑھتیاں اِس گندی رَن کی...... ماش کے آٹے کی طرح آکڑ دکھا رہی ہے......'' وادھو نے پھر سے مہراں کو دو چار تھپڑ رسید کر دیے۔

وادھو کا بیوی پر جسمانی تشدد کوئی نئی بات نہیں تھی، آئے روز کی وہی کہانی مگر آج کی چوٹ مہراں کو کچھ ہٹ کے لگی تھی کہ جس نے اُس کے بدن کے ریشے ریشے میں کسی باؤلے جن کو گھسا دیا تھا۔ پہلے تو وہ صرف اکڑ کر اُس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی مگر اب تھپڑ کھانے کے بعد اُس نے ہانپتے وادھو کو گردن سے پکڑا اور اُس کو نیچے کی طرف دُہرا کرتے ہوئے پیٹ میں گھٹنے کی ایک ہی کاری چوٹ سے کچے آنگن میں پُشت کے بل گرا کر سینے پر چڑھ بیٹھی۔ وادھو کی گردن اب اُس کے دونوں ہاتھوں میں تھی جسے وہ بل دینے کے انداز میں دبائے جا رہی تھی اِس طرح کہ ہر بل کے ساتھ وادھو کی آنکھیں ڈھیلوں سے باہر آ جا رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کوئی جن ہے جو اُس کے بدن میں حلول کرنے کے بعد ظاہر ہو گیا ہے۔ وادھو کی ماں پہلے تو ہکی بکی ہوئی یہ سب کچھ دیکھتی رہی کہ کرے بھی تو کیا کرے مگر جب بیٹے کے گلے سے خرخراہٹ کی آوازیں نکلنا شروع ہوئیں تو وہ پاگلوں کی طرح مہراں کی جانب لپکی اور اُس کی پُشت سے لپٹ کر اُسے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ کچھ نہ بنا تو مہراں کی دونوں باہوں میں اپنی باہیں اَڑا کر وادھو کا جکڑا ہوا گلا چھڑانے کی کوشش کی مگر کون ہو جو مہراں کی گرفت میں آئے ہوئے وادھو کو چھُڑا سکے! اب تو یہ عالم تھا کہ وادھو کی آخری سانس نکلی سو نکلی۔

بیٹے کو مرتا دیکھ کر وادھو کی ماں نے چولہے میں سے اَدھ جلی لکڑی نکالی اور اُس کے دو تین وار مہراں کی پُشت پر کیے مگر سب غیر موثر۔ مہراں کے گلا دبانے کی وجہ سے وادھو جیسا جوان بھی کسی اَدھ موئے پکھی کی مانند اُس کی ٹانگوں کے درمیان پھڑ پھڑا رہا تھا۔ وادھو کی ماں کو اور کچھ

نہ سوجھا تو وہ باہر گلی کی طرف بھاگی کہ کسی آتے جاتے کو مدد کے لیے بلائے مگر بارش کے بعد تو گلی بھی سنسان پڑی تھی۔ بجلی کی گرج چمک اگرچہ کم ہو چکی تھی مگر بارش رکنے کے آثار ابھی تک دکھائی نہیں دے رہے تھے کیونکہ آسمان سے اُترنے والی بوندوں کی پھوار کبھی تیز اور کبھی مدھم مگر تھمی نہیں تھی۔ وادھو کی ماں نے پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر آوازیں دیں مگر کسی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ بڑھیا کو یقین ہو گیا کہ وادھو اب نہیں بچ پائے گا۔

اِس سے پہلے کہ وہ منہ سَر پیٹتی کچھ اور کُدھت کرتی، اُس کے گھر سے دو گھر چھوڑ کر گلی کے موڑ سے کوئی نوجوان بڑی سڑک پر جاتا ہوا دکھائی دیا۔ وادھو کی ماں تیز تیز قدموں سے اُس کی طرف دوڑی اور اُسے بازوؤں سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتی ہوئی آن کی آن میں گھر لے آئی۔ بوکھلائے ہوئے نوجوان کو اُس کی چیخ و پکار سے اتنا سا اندازہ ہوا کہ گھر میں کوئی ایسا مسئلہ ضرور ہے کہ جس کے واسطے اُس کی فوری ضرورت تھی۔ جونہی وہ نوجوان گھر میں داخل ہوا تو گھر کے اندر کا منظر دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ ہاتھوں پیروں کی مضبوط ایک دوشیزہ ایک اچھے بھلے جوان کے سینے پر کسی شیرنی کی طرح سوار دونوں ہاتھوں سے اُس کا گلا دبائے ہوئی تھی اور وہ کسی چمگادڑ کی مانند اُس کی ٹانگوں کے درمیان پڑا ہوا پھڑک رہا تھا۔

باہر سے آئے نوجوان نے اپنے دونوں ہاتھ مہراں کی کلائیوں کے گرد وِینی پکڑنے کے انداز میں رکھے اور اچھی بھلی طاقت سے نیچے پھنسے ہوئے جوان کی گردن چھڑانے کی کوشش کی مگر دوشیزہ کی پکڑ اتنی بھی کمزور نہیں تھی۔ باہر سے آئے ہوئے نوجوان نے ایک بار پھر اپنی گرفت کی پکڑائی سے زنانی کی طاقت کا اندازہ لگایا اور دو تین بار پورے جسم کی طاقت کو اپنے ہاتھوں میں مرکوز کرتے ہوئے ایک ہی جھٹکے میں وادھو کی گردن سے اُس کے ہاتھ اُکھڑوا کر اِس طرح پیچھے کی طرف دھکیلا کہ وہ پُشت کے بَل جا گری۔ وادھو کی ماں کی آہ و بکا کبھی اونچی اور کبھی نیچی ہوئے جا رہی تھی۔

''اوے یہ تو وادھو ہے''......... باہر سے آئے ہوئے نوجوان نے تقریباً موئے ہوئے وادھو کی نبض پر ہاتھ رکھا تو وہ ہولے ہولے ٹمک رہی تھی۔ ''ناں رو اَماں ناں رو.... بچ

گیا ہے تمہارا بیٹا۔'' باہر سے آیا نوجوان وادھو کے ہاتھوں کی تلیاں مَسلنے لگا تھا۔ ابھی اُس نے ہتھیلیاں مسلنی شروع ہی کی تھیں کہ پُشت کے بَل گری مہراں نے پھر سے سانس مجتمع کی اور چھلانگ لگا کر وادھو کے سینے کو اپنی دونوں ٹانگوں پھنساتے ہوئے ابھی اوپر بیٹھنے ہی لگی تھی کہ نوجوان نے اُسی طراری سے ایک ہاتھ میں اُس کی گُت کو دبوچا اور دوسرا اُس کی بائیں بغل میں دبا کر اِس طرح اوپر اُٹھایا جیسے کڑکی میں پھنسے ہوئے چوہے کو چمٹے سے اُٹھایا جاتا ہے۔ اب مہراں اُس کی گرفت میں آ کر بھی آزاد ہونے کی جستجو میں پھڑکیاں مارے جا رہی تھی۔ مہراں کے مسلسل پھڑکنے سے جہاں باہر سے آئے نوجوان کا بائیاں ہاتھ بار بار اُس کی بائیں چھاتی سے رگڑ کھا رہا تھا وہیں اُس کا دیگچے جیسا پیچھا بھی کسی چکی کے دو پاٹوں کی طرح اُسے دانہ دانہ پیسے جا رہا تھا۔ کچھ لمحے اور گزر گئے مگر مہراں ابھی تک اُس نوجوان کے قابو میں نہ آنے کے لیے پورے جسم کی طاقت کو داؤ پر لگائے ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ نوجوان نے بھی اپنے اوپر پاگل پن سوار کر لیا ہے۔ ایک طرف جوان لڑکی کے ماسلے بدن کی تپش اور دوسری جانب غضب کی وحشت، اِن دونوں کی امتزاجی حملہ آوری نے اُس کے ذہن کو گھما دیا۔ اُسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ اِس صورت حال میں وہ کیا کرے۔ مٹھاس کی اَنت تک آئے ہوئے گنے کی طرح بھرے بھرے رَس بھرے نسوانی جسم کی چسولی چَس اُٹھائے یا اُس میں حلول کئے ہوئے وحشی جن کو قابو کرے۔

اِس دوران مہراں نے ایک بار پھر زور آزمائی کرتے ہوئے باہر سے آئے ہوئے نوجوان کے گال کو دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کی۔ نوجوان کا گال تو مہراں کے دانتوں میں نہ آسکا مگر نوجوان نے اُس کی گُت کو پیچھے کی طرف کھینچتے ہوئے اُس کی گردن کو اِس بے دردی سے نیچے کی طرف جھکایا کہ مہراں کے ہونٹ نوجوان کے ہونٹوں سے قریب تر ہو گئے۔ اتنے قریب کہ نوجوان مہراں کی تیز تیز چلتی ہوئی سانس کے شُکارے تو کیا اُس کے لبوں کی حدت تک محسوس کرنے لگا تھا۔ شاید یہ اِس کیفیت کا اثر تھا یا مہراں کے وجود میں کسی نامعلوم کمزوری کی کوئی دراڑ کہ اُس کی وحشت اپنے آپ ہی ماند پڑتی گئی اور کچھ دیر کے بعد وہ بے سُدھ ہوئی اُس کے بازوؤں

میں جھول رہی تھی۔نوجوان نے اُسے اپنی بانہوں پر اُٹھا کر چارپائی پر لٹایا اور پھر سے وادھو کی خبر گیری کرنے لگا جو اُٹھ کر بیٹھ تو گیا تھا مگر بدستور زمین پر بیٹھا ہوا تھا اور اُس کی ماں اُس کے تلوے ملے جا رہی تھی۔باہر سے آئے ہوئے نوجوان نے ایک بار پھر مہراں کی طرف دیکھا مگر وہ تو بالکل مری مری سی چارپائی پر پڑی اُس کی جانب تکے جا رہی تھی۔عورتوں میں اتنی طاقت بھی ہو سکتی ہے اِس کا اندازہ اُس نوجوان کو پہلی بار ہوا تھا۔

نوجوان نے ایک بار پھر وادھو کے قریب جا کر اُس کی نبض دیکھی۔نبض پہلے کی نسبت کچھ تیز ہو چکی تھی۔"سب خیر مہر ہے مگر پھر بھی اسے آدھا سیر دودھ گرم کر کے پلا دیں۔"

"میں نے تجھے کہیں دیکھا ہوا ہے۔"وادھو کے حلق میں سے باریک سی آواز نکلی۔

نوجوان مسکرا دیا۔"لیکن میں تو تمہیں روزانہ دیکھتا ہوں وادھو کا کا۔تمہاری دُکان کے سامنے تو ہوتا ہوں حکیم رام لعل کے مطب میں۔نام میرا فیاض ہے۔"

وادھو نے فیاض کو پہچاننے کی کوشش میں غور سے دیکھا جس میں تجسس سے زیادہ ناگواری تھی۔وہ بھلا اُس کے سامنے کیسے اِس حالت میں رہنا گوارا کر سکتا تھا۔لہذا اسکی کو جرات میں بدل ڈالنے کے لیے نہایت تیزی سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر اِس قدر پھرتی کے ساتھ اُٹھا نہ جا سکا اور وہ پھر سے زمین پر آ رہا۔فیاض نے مسکراتے ہوئے اُسے وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

وادھو نے فیاض کو جاتا دیکھ کر ایک بار پھر مہراں کی طرف دید گھمائی جو اپنے سَر کے بال بکھیرے اُسی طرح چارپائی پر اُٹھے بیٹھی تھی جیسے کوئی جن زدہ عورت جن کھیلنے کے بعد بے سُرت ہوئی بیٹھی ہوتی ہے۔وادھو کے بدن میں خوف کی کئی لہریں یکے بعد دیگرے سنسنائیں کہ جن کے سبب وہ جیسے تیسے اُٹھ کر فیاض کے پیچھے پیچھے گھر سے باہر نکل گیا۔اُسے یقین ہو چکا تھا کہ مہراں پر ضرور کسی جن کا سایہ ہے ورنہ کوئی عورت کیسے اِس طرح کسی جوان مرد کا گلا دبا سکتی ہے؟

(5)

فیاض گھر پہنچا تو عشاء کی نماز ہو چکی تھی ۔محراب والے کی بڑی مسجد میں سے آخری نمازی بڑھاپے کی آخری حدوں کو چھونے کے سبب آہستہ آہستہ باہر نکل رہے تھے۔گھر کے دالان میں اُس کے والد نذیر حسین اور چاچے محمد حسین کے ساتھ ساتھ اُن دونوں کے چچازاد جان محمد کا اُونچابُلارا صاف بتا رہا تھا کہ تینوں نماز پڑھنے کے بعد نماشی کی چوکڑی جمائے بیٹھے تھے۔اِن کا چوتھا ساتھی فیاض کا ماموں محمد مراد ہوا کرتا تھا مگر جب سے صادق گڑھ محل کے بڑے دروازے پر اُس کی رات کی ڈیوٹی لگی، محفل میں باقی تین رہ گئے تھے۔

فیاض نے اِن سب کو سلام کیا اور خاموشی سے چولہے کی سمت چلا گیا جہاں اُس کی اماں اُس کے انتظار میں بُجھ چکے چولہے کی راکھ بار بار کریدے جا رہی تھی کہ کب فیاض گھر آئے اور وہ اُسے بھاجی پُھلکا گرم کر کے دے۔نذیر حسین، محمد حسین اور جان محمد ریاستی سیاست کی باتوں میں اِس قدر محو تھے کہ نہ تو کسی نے فیاض کو آتے دیکھا اور نہ ہی اُس کے سلام کا جواب دیا۔ فیاض کی اماں نے بیٹے کو دیکھا تو اِس طرح اطمینان کی سانس لی کہ جیسے جان میں جان آگئی ہو۔

''کہاں رہ گئے بیٹا آج .... میری تو جان اَٹکی ہوئی تھی''۔

''اماں اب یہ بادل اور برسات تو میرے بس سے باہر ہیں''۔ فیاض نے چوکی گھسیٹی اور چولہے کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا اور اماں چولہے پر توا رکھ کر پھلکا سینکنے لگی اور بھاجی والی کٹوری کو اَدھ بجھے انگارے لال کرنے کے بعد اُن کے اوپر دھر دیا۔

''اماں روٹی کھلانے لگی ہو تو میں ابا کو حقہ تازہ کر کے نہیں دے سکوں گا۔''

''نہ کرنا تم تازہ، میں پہلے کر کے دیئے بیٹھی ہوں۔''

''اچھا..... دیر سے آنے کا کچھ فائدہ تو ہوا.....'' فیاض بے چنتا ہو کر گرم ہوتی ہوئی روٹی بھاجی کو تاڑنے بیٹھ گیا کہ توّے سے اب اُتری سو کب اُتری۔

دوسری جانب نذیر حسین، محمد حسین اور جان محمد میں حُقے کی باری پر یہی بحث چل رہی تھی کہ پاکستان بننے کی صورت میں ریاست کس کے ساتھ الحاق کر سکتی ہے اور کس کے ساتھ کرنے جا رہی ہے۔ نواب صاحب کے بارڈی گارڈ دستے کے ملازم ہونے کی حیثیت سے تینوں اپنے اپنے اندازوں کو برحق سمجھ رہے تھے۔ نذیر حسین اور جان محمد کو اِس بات کا یقین تھا کہ ریاست بہاول پور پاکستان میں شامل ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتی کیونکہ اِس کا فطری سنجوگ ہے بھی پاکستان کے ساتھ اور ہو گا بھی پاکستان کے ساتھ۔ دوسری جانب محمد حسین کی رائے بھی نظر انداز کرنے کی نہیں تھی کہ اگر ریاست نے پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا ہوتا تو پھر نواب صاحب نے مائی لکشمی کو اِس طرح کیوں بلایا ہوا ہے۔ آخر کوئی بات تو ہو گی ناں۔ اگر انکار ہی کرنا ہوتا تو بندہ دور ہی سے کر دیتا ہے، اپنے ہاں آنے نہیں دیتا۔ مگر ایک تگڑی دلیل ہونے کے باوجود محمد حسین کے پاس کوئی ایسا ٹھوکواں ثبوت نہ تھا جو اُس کے تجزیے کی ضمانت بن سکتا۔ یہی حال نذیر حسین اور جان محمد کا تھا کہ جن کے پاس بھی محض دل کی بھڑاس تھی اور کوئی ایسی بو خوشبو نہیں تھی جو ریاست کی پاکستان میں شمولیت کی دلیل بَن سکتی۔

ریاست بہاول پور کی گلیاں بازار تو ایک طرف کوئی گھر بھی ایسا نہ تھا کہ جہاں آئے روز یہی ہنگامہ نہ برپا ہوتا کہ پاکستان بننے کے بعد نواب صاحب کا فیصلہ کیا ہو گا۔ فیاض کے گھر میں

دن بھر تو پھر بھی خاموشی رہتی مگر عشاء کے بعد کم وبیش دو گھنٹے تک یہ بحث مباحثہ تو روز کا معمول بن کر رہ گیا کہ جس کا حتمی جواب کہنے کی حد تک نواب صاحب نے ریاستی عوام پر چھوڑ رکھا تھا۔ لیکن عوام سے کون پوچھتا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ اُس وقت تک تو جو کچھ بھی تھا نواب صاحب کی جیب میں تھا۔

کھانا کھانے کے بعد فیاض کو یوں لگا کہ جیسے اُس کے بدن کے ایک ایک ریشے میں ہڈیوں سمیت غضب کی تھکاوٹ ہولے ہولے اُتر رہی ہو۔ وہ اُٹھا تو اُس سے اُٹھا نہ گیا۔ پھر بھی پورے بدن میں موجود سبھی توانائی کو لپیٹ لپاٹ کر وہ کسی نہ کسی طور اُٹھا اور بحث مباحثے میں اُلجھے باپ چچاؤں سے قدرے بچ بچا کر نو تعمیر شدہ سالہہ اور سُہانجنے کے درخت کے درمیان کھلی جگہ پر بچھے ہوئے ماچے پر جا گرا جہاں اُس کی اماں نے تکیہ اور کھیس پہلے ہی رکھ چھوڑا تھا۔ اِس جگہ بارش کے بعد کی ٹھنڈی ہوا کچھ زیادہ تیز اور زیادہ بھلی لگ رہی تھی۔ ٹھنڈک نے نشہ کیا تو تکیے پر سر رکھتے ہی فیاض کی آنکھیں ملہاریاں ہونے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگا۔

نیند نے اپنی جھوک آباد کی تو خواب کیوں نہ مسافر ہوتے۔ پہلے پہل تو فیاض کے لیے وہی نت کا رُولا، اندھیرے میں تھبا کے اور اپنے ہونے یا نہ ہونے کا عذاب۔ وہی پُرانا خواب۔ اگر وہ ہے تو کہاں ہے، نہیں ہے تو کیوں نہیں۔ اگر ہے تو اپنے آپ کو ملتا کیوں نہیں اور اگر نہیں ہے تو اُس کا ہونا اب تک محسوس کیوں ہو رہا ہے۔ خواب میں ڈھیروں خوابوں کا گڑ دھال اور خواب کے اندر خواب۔ گم ہو چکی پہچان کی تلاش اور ہر بار، بار بار پھر وہی ایک ہی سوال کہ اُس کی کوئی پہچان ہے بھی سہی یا نہیں۔ کیا یہی چھوٹی سی بستی محراب والا ہی اُس کی شناخت ہے۔ اگر یہ بھی نہیں تو کیا یہ ریاست بہاول پور اُس کی شناخت بنے گی کہ جس کی اپنی شناخت ہی ایک بہت بڑا سوال بنی ہوئی ہے۔ پاکستانی بہاول پور یا پھر ہندوستانی بہاول پور۔ ہونہہ! جہاں نواب صاحب کی مرضی، جہاں نواب صاحب کا حکم، وہیں کا بہاول پور۔

فیاض کے خواب کیا تھے بھنور کے اندر بھنور تھے..... گھیریاں ہی گھیریاں، چکر ہی

چکر اور جب یہ چکر اُس کی چار پائی کو اُٹھا کر گھمانا شروع کرتے تو کوئی گداز سا ہاتھ آ کر اُس کی گھومتی ہوئی چار پائی کو روک لیتا۔ کئی عرصے تک تو یہ سمجھ بھی نہیں آتی تھی کہ یہ ہے کون اور ہاتھ کس کا ہے۔ کسی وقت کسی دوشیزہ کا بدن کہ جس پر رنگ ہی رنگ اور اِن رنگوں میں سے کسی رنگ کا بُلاوا فیاض کو اپنی طرف اُکساتا رہتا۔ مگر آج تو اِن رنگوں نے اپنے وجود کو تِلسی کے جوبن کا پہناوا پہنا دیا تھا۔ فیاض کو یہ نسائی رنگ نہ تو کبھی اتنے دِلکش لگے اور نہ ہی کبھی ان کی جنس سمجھ میں آئی۔ ایک دھنک سی تھی، ایک دوسرے میں خلط ملط، اِک جان ہوئے، سانس لیتے اور جاگتے اِن سبھی رنگوں کو محسوس کرتے ہوئے جہاں عقل حیران کہ کون سے رنگ کو نَر کہا جائے اور کسے مادہ۔ اِن رنگوں میں سے کوئی رنگ کسی وقت فیاض بن جاتا اور کسی وقت تِلسی جس کا ماسلا پیچھا چکی کے پاٹن کی مانند جھوجھتا جھومتا، رقص کرتا کسی اور جہان کا سندیسہ دکھائی دیتا۔ مگر جب اِس راند میں فیاض کو اپنے آپ کے ہونے کا بھرواں احساس نہ ہوا تو اُسے اپنی سانس بند ہوتی ہوئی اور دل ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ بارش کے بعد کی غیر محسوس پھوار کے ساتھ کہیں تیرتی اور کہیں رقصاں ہوا کچھ اور بھی مدھر ہو چکی تھی اور اُس کی ماچے نما چار پائی کی بائیں جانب اونچے سہانجنے کا گھنا درخت ہلکا ہلکا ڈولنے کے بعد اب جُھولنے لگا تھا۔ فیاض نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا، دور دور تک دالان میں کچھ بھی تو اجنبی نہیں تھا، گھر کے سبھی افراد اپنی اپنی جگہ سوئے ہوئے تھے۔

فیاض نے آسمان کی جانب آنکھ اُٹھا کر وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر بادلوں کے سبب کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا تو پھر سے تکیے پر سَر رکھ کر سوچنے لگا کہ خواب میں کیا دیکھ رہا تھا۔ خواب تو یاد نہ آ سکا مگر نیند نے پھر سے آنے میں کچھ زیادہ دیر نہ کی۔ نیند کیا آئی، نئے سرے سے خوابوں کی ایک لامتناہی قطار اور قطار کے آخر میں کچھ اور خوابوں کا انبار۔ مگر اب کے تو ہر خواب میں صرف ایک ہی مورت، ایک ہی صورت مہراں کی مورت، مہراں کی صورت۔ اُسے اپنے بائیں ہاتھ میں عجیب سی بے چینی، عجیب سی سنسناہٹ کا احساس ہوا۔ یہ جلول یہ بے چینی کیا تھی، لطف ہی

لطف اور سواد ہی سواد۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر رنگوں بھرا جھولا اور جھولے میں سے ہر ایک رنگ کی الگ الگ پھوار اُس کے بدن کو سہلاتے ہوئے سُرور کی لہریں جگا رہی تھی۔ یہ لطف اور یہ سرور جو مہراں کے گرفت میں آئے ہوئے جسم نے اس کے جسم میں جگایا تھا، فیاض کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ کیا سبھی عورتوں کا قُرب اتنا ہی لذیذ اور چسولا ہوتا ہوگا؟ کیا سبھی دوشیزائیں اپنے آپ میں کسی میٹھے اور رسیلے آم کا رَس لیے پھرتی ہوں گی؟ اُسے مہراں کے ہونٹ یاد آئے جو اُس کے اتنے قریب آ گئے تھے کہ اُن میں پڑی ہوئیں میٹھے مالٹے کی ڈلی جیسی دراڑیں بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ فیاض کو یوں لگا کہ اِن دراڑوں میں سے میٹھا رَس رِس کر اُس کے ہونٹوں کو سیراب کر دے گا مگر اُس کے ہونٹ اتنے قریب آ کر بھی اتنے قریب نہ آ سکے۔

یہ عورت کا کیسا وجود تھا کہ جس میں سانپ پھنکار رہے تھے اور سانپ بھی کیسے کہ جن میں زہر کی بجائے عجیب سی مستی، اوس کے چھوٹے چھوٹے قطروں کی صورت فیاض کے جسم میں جذب ہو رہی تھی۔ یہ اوس جہاں جہاں گرتی تھی وہیں وہیں اُس کے ماس کو اِس طرح پھاڑے جا رہی تھی کہ جیسے مِٹھاس کی شدت سے کھیتوں میں لگا کماد پھٹ جاتا ہے۔ لیکن اِس طرح پھاڑے جانے میں بھی کسی درد کی بجائے ایسی چَس تھی کہ جس کے سامنے اپنا ہونا یا نہ ہونا بے معنی لگ رہا تھا۔ عورت کا یہ روپ اُس نے پہلی بار دیکھا تھا کہ جس میں نزاکت اُس کے ماس میں تو تھی مگر احساس میں عنقا۔ نسوانیت اُس کے جُثے میں تو تھی مگر غصہ اُس سے عاری۔ عورت پر یہ کیفیت شاید اُس وقت طاری ہوتی ہے کہ جب وہ رگڑے جانے کی بجائے رگڑ دیتی ہے، مطلوب ہو کر بھی طلب گار اور مفتوح ہوتے ہوئے بھی فاتح بن جاتی ہے۔ کہاں چھپائے رکھتی ہے اپنی طاقت کو۔ شاید اپنی نزاکت کی اوٹ میں! آنسوؤں کے پردے میں نہ سہی تو ناز و ادا میں۔ شے کیا ہے؟ گُند ہو کر رہے تو اطاعت کی انتہا ورنہ قیامت اُٹھا دینا محض لمحوں کا کھیل۔ اِس طرح داؤ میں جکڑے کہ گردن توڑ کے رکھ دے۔

فیاض آج خوابوں میں بھی اپنی شناخت کی تلاش کو بُھل بُھلا کر تلسی اور مہراں کے

جسموں کی ست رنگیوں میں ڈوب رہا تھا اور نہ ہی تیر پا رہا تھا۔ کہیں ٹھنڈی چھاؤں تھی اور کہیں آگ کا کھیل۔ کہیں رنگوں کے دائرے بناتی چوڑیوں کی کھنک تھی تو کہیں مکھن ماکھی میں گندھا ہوا گنک کی روٹی کا چسولا بھورا۔ فیاض کو یوں لگا کہ اِس لذت کی آڑ میں عورت تو خود ایک ایسی عمل انگیز طاقت ہے جو پوری زندگی مرد کو جلاب دیے رہتی ہے مگر پھر بھی اِس مخفی سرکش طبع کے باوجود ہمیشہ اپنے سے بالا طاقت کے طواف میں رہنا چاہتی ہے، اُس کے چودھار، صبح شام رات، ہر وقت، اُس کی کمزوری بن کر۔ اور یہی عکس مرد کے اطرف گھما گھما کر اُسے جتلاتی رہتی ہے، اِٹھلاتی، رِجھاتی اور اپنے آپ سے بے خبر کیے رکھتی ہے۔

فیاض کو محسوس ہوا کہ وہ نیند میں ہوتے ہوئے بھی جاگ رہا ہے۔ اُس نے تُلسی کے چسولے عکس اور مہراں کے رسیلے بدن میں اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر کہیں سے محسوس نہ ہوا کہ وہ بھی کوئی وجود رکھتا ہے۔ اُس نے اِدھر اُدھر تھبا کے مار کر اپنے آپ کو تلاشا مگر وہ کہیں ہوتا تو خود کو محسوس ہوتا۔ اُس نے دیکھا کہ تُلسی کا رنگلا عکس اور مہراں کا گرولا بدن، دونوں اُس کے نہ ہونے پر مسکرا رہے تھے۔ فیاض کے ہاتھ پاؤں چلانے میں جنون سا آئے جا رہا تھا۔ اگر اُس کا کہیں وجود نہیں تو یہ کون ہے جو اپنے آپ کو تلاش کر رہا ہے۔ یہ سوچ کر اُسے جھرجھری سی آئی اور وہ پھر سے گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

لمبی لمبی سانس لینے سے اُس کی سانس میں سانس آئی تو اُس نے اپنے آپ کو، اپنے ہونے کو پھر سے محسوس کرتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھری اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے چاروں اُور نگاہ دوڑائی۔ ابھی فجر ہونے کو اچھی بھلی دیر تھی۔ دور دالان کے دوسرے سرے پر اُس کے ماں باپ بڑے ماچے پر کھیس اُوڑھے ایک دوسرے کی جانب پُشت کیے یوں سو رہے تھے جیسے قبرستان میں پاس پاس بنی ہوئی دو قبروں پر چادریں چڑھی ہوئی ہوں۔ فیاض اپنے خوابوں کی گردش سے ابھی تک باہر نہیں آ سکا تھا۔ کیا یہ دونوں بھی عورت مرد ہوں گے یا رہے ہوں گے؟ کیوں نہیں ہوں گے؟ اور اگر یہ اب تک عورت مرد ہوں گے تو اِن کے رنگ کہاں گئے؟ اِن کی

چس رَس کیوں بے چسی ہوگئی؟ ان کا وجود ایک دوسرے کو اپنی طرف متوجہ کیوں نہیں کرتا؟ کیا ایک خاص عمر کے بعد دونوں کے بدن اپنی جنسی شناخت کھو دیتے ہیں؟ اور اگر یہ سچ ہے تو وہ اپنی پہچان کی تلاش میں اس قدر دیوانہ کیوں ہوا پھرتا ہے؟ دفع کیوں ناں کیا جائے ایسی شناخت کو جو اَنت آدمی کو اپنے آپ سے بھی بیگانہ کر دیتی ہے۔ وہ تو ایک انسان کے طور پر اپنی شناخت چاہتا تھا مگر اِس عمر کا کیا جائے جو اُسے بنیادی جنسی شناخت سے بھی بے بہرہ کئے جا رہی تھی۔

فیاض کھاٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ٹھنڈی ہوا کچھ اور بھی ٹھنڈی ہوگئی تھی مگر اب اِس میں ہلکی بارش کی مہین بوندوں کی پھوار شامل نہیں تھی۔ نم سے جدا خشک ہوا کہ جس میں سپیدہ سحر ہونے سے پہلے کے نندرا کے نے ملہار کی جاگ لگا رکھی تھی۔ اُسے یوں لگا کہ تلسی اور مہراں آ کر اُس کے دائیں بائیں بیٹھ گئی ہیں۔ دونوں طرف ایک جیسا احساس تھا، گداز میں ملائمت آمیز حدت کا، جس کے جسم میں اُترتے ہی اُس کی آنکھیں خود بخود ملہاریاں ہوتی چلی گئی۔ اِس سے پہلے کہ فیاض کی آنکھیں پھر سے موندتیں، اُسے محسوس ہوا کہ مثانہ ابھی پھٹا سو پھٹا۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور دالان کی دوسری نکڑ میں بنے ہوئے پاخانے کی بجائے سوہانجنے کے گھنے درخت کی دوسری جانب دیوار کے ساتھ سَر ٹکرا کر کھڑے تڑے پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ طمانیت کا ایک طویل احساس تھا کہ جس کے مول کا لگایا جانا ممکنات میں سے نہیں تھا۔ طبع کے فطری تقاضوں کو تسکین ملی تو کھنچا ہوا سارا بدن ڈھیلا پڑتا گیا اور فیاض پھر سے کھاٹ پر دھب کر کے گر گیا۔

(6)

دَھچر صبح سے پوچھ پوچھ کر تھک گیا تھا مگر وادھو نے تو جیسے چپ کا روزہ رکھ لیا۔ نہ کوئی بول نہ کوئی چال۔ نہ کوئی حال احوال نہ کوئی اِدھر اُدھر سے تا کا جھانکی۔ یہ سب کچھ وادھو کی طبع کے خلاف تھا، اِس لیے تو دھچر کو چُبھ رہا تھا۔ دونوں بچپن کے دوست تھے، ایک دوسرے کی اونچی آواز تو کیا سانس تک کو محسوس کر لیا کرتے تھے۔ مگر آج تو وادھو نے کمال کر دیا، گردن کے چفیر بڑا سا رومال لپیٹے ہوا تھا اور بولتا بھی نہیں تھا کہ ہوا کیا ہے۔ پہلے تو وادھو نے سمجھا کہ شاید بخار چڑھا ہوا ہے مگر ہاتھ لگانے پر لِنگ ٹھنڈے کے ٹھنڈے۔ کوئی سَر درد نہ کوئی دانت درد۔ پھر ایسا کیا تھا جو وادھو بتانا نہیں چاہتا تھا۔

عام طور پر ہوتا یہی تھا کہ اِن دونوں کی بَٹ کڑاک بھی چلتی رہتی تھی اور کام کاج بھی۔ وادھو کی دوکان تو کریانے کی تھی، آئی چلائی لگی رہتی لیکن اِس دوران دھچر دھوبی کپڑوں کے پچیس چھبیس جوڑے استری کر لیتا۔ مگر آج تو اُس سے شام تک پانچ جوڑے استری کرنا بھی مشکل ہو گئے کیونکہ نہ تو یار کا بُلارا اور نہ ہی کوئی ڈانٹا یا کھنگورا۔ شام ہوئی تو وادھو دُوکان بند کرنے کی بجائے چمنی روشن کر کے گدی پر بیٹھا رہا۔ دھچر کا دل پسیجا تو وہ بھی گرم استری کے جلتے ہوئے کوئلے تا سلے

میں اُلٹا کر وادھو کی دُکان کے آگے رکھے چھوٹے موڑھے پر آن بیٹھا۔ کچھ دیر تو وہ خاموش رہا کیونکہ وادھو کی دوکان کھلی دیکھ کر ایک آدھ گاہک کا آنا جانا ابھی لگا ہوا تھا مگر جب فرصت ہوئی تو اُس نے ایک بار پھر وادھو سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اُس نے جواب دینے کی بجائے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

پہلے تو دھچر چڑ سا گیا۔ دِل چاہا کہ دُوکان بند کر کے گھر کی راہ لے مگر جب وادھو کے چہرے پر دکھ کی انتہائی کیفیت دیکھی تو رہ نہ سکا اور آگے بڑھ کر گدی پر پاؤں کے بھر بیٹھے وادھو کو گلے سے لگا لیا۔ وادھو دھچر کے سینے سے کیا لگا، سسکیوں کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ آنسو تھے کہ چہرہ بھگوئے جا رہے تھے۔ دھچر سمجھ گیا کہ یار کو دکھ کسی نقصان کا نہیں بلکہ کوئی اندر کی چبھن ہے۔ وادھو اِس حال میں بھی کچھ بتانے کو تیار نہیں تھا بس چُپ چاپ روئے جا رہا تھا۔ اب تو دھچر کو یقین ہو گیا کہ دکھائی نہ دینے والی چوٹ وَلی وارث نہ ہونے کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔

''صبر کر وادھو خان....... اللہ کی ذات جوڑا بیٹوں کا دے گی، اور وہ بھی دراز عمر والا .... بس تم اُداس نہ ہو اور نہ ہی دل پر لو''..... دھچر نے ایک بار پھر وادھو کو گلے سے لگا لیا مگر یہ دلاسہ بھی کچھ کام نہ آیا، اُلٹا وادھو کے آنسو کچھ اور بھی تیزی سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

''یار کئی بار تم سے کہا ہے کہ حکیم رام لعل کو نبض دکھاؤ مگر تم نے تو قسم اُٹھا رکھی ہے میری بات نہ ماننے کی''...... دھچر نے ڈرتے ڈرتے ایک بار پھر گُھس مُس کرنے کی کوشش کی کیونکہ ایسی باتوں پر وادھو کا بری طرح اُلجھنا ایک معمول تھا۔ مگر آج تو وادھو نے شاید سُنی ان سُنی کر دی تھی ، بس چُپ چُپتا ہچکیاں لیتا رہا۔ دھچر سمجھ گیا کہ بات کچھ اور ہے وگرنہ وادھو اِس طرح رونے والا نہیں۔

''اُو یار تیری عورت نے تو بُرا بھلا نہیں کہا؟'' دھچر نے ایک بار پھر پینترا بدلا۔ وادھو کے چہرے کی بدلتی کیفیت نے بتا دیا کہ تیر نشانے پر لگا ہے۔ اُس نے جَھٹ دونوں ہاتھوں کی اُلٹی ہتھیلیوں سے آنکھیں پونچھیں اور اکڑ کر بولا ''ایسی جرات ہے اُس گندی رَن میں''...... دھچر نے

جان لیا کہ جھگڑا گھر سے شروع ہوا ہے اسی لیے تو وہ دوکان پر ڈیرہ لگائے بیٹھا تھا۔

''میں چاہتا تو چیر کر رکھ دیتا اِس بانجھ عورت کو مگر جنات کی راند میں کون ہاتھ ڈالے''۔

وادھو ایک بار پھر ہتھے سے اُکھڑا ہوا لگ رہا تھا۔

''جنات کی راند؟''..... دھچر نے حیران ہو کر پوچھا

''مادر چود..... اور کچھ نہیں سوجھا تو جن کھیلنے لگی ہے گشتوڑی کہیں کی..... جن منہ پر ظاہر کیا ہوئے میرا گلا دبا کے رکھ دیا اُس کے جن نے۔''

''کب؟''......

''کل شام کو...... یہ تو خیر گزری کہ حکیم کا ملازم وہاں سے گزر رہا تھا جس نے مجھے چھڑا لیا وگرنہ وہ عورت میرا منکا توڑ دیتی''۔ وادھو کے سینے سے غصے کا بوجھ اُترا تو آسودہ سا لگنے لگا۔ مگر دوسری جانب یہ بوجھ دھچر کے دماغ میں گھس کر بیٹھ گیا۔ وہ تو حیران تھا کہ وادھو کی بیوی پر جنات کا سایہ کیسے ہو گیا۔ ''یار اپنی عورت کو کسی بھوپے کے پاس لے جا... میں نے سنا ہے کہ مڑیچی والے بھوپے کو آٹا گھٹا دینے کے بعد اگر جمعرات کی شام کو جن کھلاؤ تو سخت سے سخت گیر سایہ بھی جان چھوڑ دیتا ہے''۔

''دفع کرو گندی رَن کو..... میں تو ویسے بھی صبح اُسے کاغذ دے رہا ہوں''۔ وادھو نے دھوتی جھاڑی اور گدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اُو عقل کو ہاتھ مار اور چھوڑ اِس کاغذ شاوز کو۔ کیوں رولتے ہو بے چاری کو، یتیم چھوہر ہے، کہاں جائے گی وہ''...... دھچر بھی یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کاغذ تو اب ہو کے رہے گا..... میں نہیں رہ سکتا اب اِس سنڈھ کے ساتھ''... وادھو بھی دن بھر کی بیوسیت چھوڑ کر جلدی جلدی دوکان بند کرنے لگا تھا۔

''اچھا یار جیسے تو راضی...... جو دِل میں آئے کر...... مگر یہ تو بتا کہ گھر جا رہا ہے ناں؟''۔ دھچر بھی اپنی دوکان کے پھٹے جوڑنے میں لگ گیا۔

''میں تو شکل دیکھنے کا روادار بھی نہیں ہوں اُس منحوس عورت کی...... مسجدیں بہت ہیں ڈیرہ نواب میں، سو جاؤں گا کسی مسجد میں۔'' لگ یوں رہا تھا کہ وادھو صرف مہراں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ پوری آبادی سے ناراض ہے۔

اِسی اثنا میں یوں لگا کہ جیسے کئی موٹریں احمد پور کی جانب سے آتے ہوئے صادق گڑھ محل کی سمت مُڑ گئی ہوں۔ وادھو اور دیگر سب کچھ بھلا کر اپنی دوکانوں سے باہر نکل آئے اور آواز کی جانب کان دھرنے لگے کہ کتنی موٹریں تھیں اور اِس وقت آئیں کہاں سے اور کس سبب۔ کچھ دیگر دوکان دار بھی سُن گُن لینے بازار کے وسط میں آ کر کھڑے ہو گئے اور آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھنے کی خاطر خود مجسم سوال ہو گئے۔ حکیم صاحب کی دوکان میں سے کچھ مریضوں کے ساتھ ساتھ حکیم صاحب کے ملازم لڑکے بھی باہر نکل آئے جن میں فیاض بھی تھا۔ فیاض اور وادھو نے ایک ہی ساعت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر دونوں کے چہروں پر الگ الگ تاثرات واضح طور پر محسوس کئے جا سکتے تھے۔ وادھو نے بظاہر نفرت سے گردن جھکا تو لی مگر کچھ اِس طرح بوکھلایا کہ بلاوجہ گردن کے اطراف ہاتھ پھیرنے لگا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ شرم سے زمین میں گڑنے سے خود کو بچا رہا ہے جب کہ فیاض کی آنکھوں میں اُس کے لیے لحاظ تھا، صلہ رحمی تھی۔ وادھو کو دیکھ کر فیاض اِس واسطے اُس کی جانب لپکا کہ خیر خیریت معلوم کرے لیکن فیاض کو اپنی جانب آتا دیکھ کر پہلے تو وادھو اپنے آپ ہی میں چھپنے لگا مگر پھر نجانے کیا سوچ کر جلدی سے دوکان کی تَھلی پر چڑھ گیا۔ فیاض کو ملنے سے آخر وادھو کتراتا نہ تو بھلا اور کیا کرتا۔

یہ سب کچھ دیکھ کر دل گرفتہ ہوا فیاض انہیں قدموں رُک گیا اور آس پاس اکٹھے ہو چکے لوگوں کی سُن گُن لینے لگا جو شام ڈھلے ڈیرہ نواب میں آنے والے موٹر کاروں کے قافلے کے بارے میں من چاہے اندازے لگا رہے تھے۔ کچھ کا خیال تھا کہ ضرور قائداعظم اور اُن کے ساتھی ہوں گے جو نہرو کی بہن وجے لکشمی پنڈت کی آمد سے قبل ہی نواب صاحب سے ملاقات کر کے ریاست بہاول پور کے پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کرانا چاہ رہے ہوں گے مگر اکثریت کو

یقین تھا کہ ہوناں ہو یہ ضرور وجے لکشمی پنڈت ہی ہے جو رات کے کھانے پر نواب صاحب سے ملنے آئی ہے۔ اِتنے میں وَسو چڑھویا بھی بوہڑ والے چوک سے تقریباً دوڑتا ہوا آیا اور دور ہی سے چلانے لگا کہ بھی مال اسباب سنبھال لو سمیٹ لو، ضرور کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔

اجناس کا بیوپاری نَبو کُلیار حواس باختہ ہوکر آگے بڑھا اور وَسو کو روک کر پوچھنے لگا کہ کیا ہونے والا ہے اور کس قسم کا مال اسباب سانبھ سنبھال کر رکھنا ہے۔

''پورا پتہ تو مجھے بھی نہیں مگر محل کے بڑے دروازے میں پوری پانچ موٹریں داخل ہوئی ہیں، کیا کہا ہے میں نے پوری پانچ موٹریں''۔ وَسو نے پھولی ہوئی سانس میں ہاتھ کی پانچ انگلیوں کا بُجا بناتے ہوئے بتایا۔ ''میرا خیال ہے ضرور انگریز وائسرائے کا کوئی افسر ہے جو نواب صاحب کو یاد دہانی کرانے آیا ہے کہ ریاست چاہے جو کرے مگر پاکستان میں شامل نہیں ہونی چاہئے۔'' وَسو چڑھوئے نے تیز تیز لہجے میں ایک اور لمبی سی چھوڑ دی۔

''کیوں ناں شامل ہو ریاست پاکستان میں..... ہائیں کیوں ناں۔ کیا قصور کیا ہے پاکستان نے۔ مسلمان ہوتے ہوئے بھی الحاق کریں ہندوؤں کے ساتھ، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ریاست یا توں یونہی رہے خودمختیار امن امان کے ساتھ، نہیں تو پھر پاکستان ہی ٹھیک ہے''۔ نَبو کُلیار داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا یکدم بھڑک اُٹھا۔

''اُو میاں جانتا تو کوئی ہے نہیں کہ آیا کون ہے؛ قائداعظم، وجے لکشمی یا وائسرائے کا کوئی افسر اور غوغا مفت کا یونہی کیا ہوا ہے۔ مسائل کو عقل سے سوچا جاتا ہے، یونہی ہر شے کو دبڑ دوس نہیں کیا جاتا..... جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ فیصلہ دولہا سئیں نے کرنا ہے، وہ جو بھی کرے گا ٹھیک کرے گا، ریاست اور ریاستی عوام کے حق میں کرے گا۔ چلو اب چہرہ گم کرو اور گھر کا راستہ ناپو، بال بچہ راہ دیکھتا ہوگا''۔ مولوی نورالحق نے آخری ضرب اتنی کاری لگائی کہ مجمع خود بخود چھٹتا چلا گیا۔

فیاض نے بھی حکیم صاحب کی دوکان میں واپس جاتے ہوئے ایک بار پھر وادھو کی

طرف دیکھا جو آنکھ کانی کیے شرمندہ شرمندہ اُسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ فیاض، وادھو کے اِس رویے پر حیران ہونے کے باوجود مسکرا دیا کہ کل کی درگت کے بعد بھی جوان اونچی ہواؤں سے نیچے آنے کو تیار نہیں تو کیا کیا جا سکتا ہے۔

(7)

ٹلسی کا حال کئی دنوں سے عجب سا تھا۔ نہ کوئی بھوک نہ کوئی پیاس۔ آلس ہی آلس تھی کچھ اِس طرح کہ بالکل ہی گھیل ہو کر رہ گئی۔ نہ کپڑے بدلنے کی سُرت اور نہ کسی کام کاج کی طرف روح رجوع۔ بس صرف جماہیاں اور بدن میں تروڑ۔ ماں کے جھڑکنے پر اُٹھ کر تو بیٹھ جاتی مگر بدن میں گھومری کی طرح گھومتے بیٹھے جلول کا کیا کرتی جو ہر خواہش کو ایک طرف کرتے ہوئے ایک ہی تقاضے کا متقاضی تھا کہ کوئی تو ہو جو اُسے وکیڑ میں لے کر گوندھے، نچوڑے، چھچھولے اور پھر چھنڈ کا مار کر ساری آلس نکالتے ہوئے باہر کسی کپڑے سُکھانے والی تڑاں پر ڈال دے پھر سے توازن میں لانے کے لیے۔

ٹلسی جب بھی اِس ''کوئی'' کے بارے میں سوچتی تو اُس کے تصور میں ایک ہی چہرہ اُبھرتا...... فیاض کا چہرہ۔ اُسے یوں لگتا کہ وہ فیاض ہی ہے جو اُس کے بدن کے چھکے کو ڈاون ڈالتے ہوئے اُس کی ساری آلس نچوڑ کر اُسے پھر سے مستعد کر سکتا ہے۔ ٹلسی کچھ کچھ سمجھتی تھی کہ اُس کے جسم کی بے چینی کو اگر کوئی شانت کر سکے گا تو وہ فیاض ہی ہے۔ مگر وہ یہ نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ فیاض کے ساتھ دل کی بات کرے تو کیسے کرے؟ وہ تو کئی کئی دنوں کے بعد نگاہ نیچی کیے آتا ہے

اور بنا آنکھ اوپر کو اُٹھائے واپس چلا جاتا ہے۔ لیکن اِس ساری راند میں فیاض کا آخری بار حیران ہو کر اُسے ٹُرٹُر دیکھنا وہ ابھی تک بھلا نہیں پائی تھی۔ ٹُلسی کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ فیاض کو بلوائے تو کیونکر اور کس بہانے! اُسے اچھی طرح ادراک تھا کہ وہ اوّل آخر ہندوانی ہے اور ہندوانی رہے گی مگر پھر بھی جان نہیں پا رہی تھی کہ دِل ہر وقت فیاض کے گرد منڈلاتے رہنے کی رضا کیوں رکھتا ہے۔ پہلے پہل تو ٹُلسی کو مرد کی ذات میں موجود اِس کشش کا احساس ہی نہیں تھا۔ کیونکہ گھر میں ایک باپ تھا جو صبح کا گیا رات گئے واپس آتا تھا اور آتے ہی اپنے کمرے میں گھس جاتا۔ اُس کی عدم موجودگی میں سوڈھی ہی اُن کے ہاں کسی نہ کسی بہانے ہر وقت ڈیرہ جمائے رہتا اور ٹُلسی کی ماں اُسی پر صدقے واری ہوئی رہتی۔ سو ٹُلسی کے لیے مرد ذات کا تصور ایک ایسے اَن بھاتے نوالے کی صورت تھا جسے کھانا نہ بھی ہو تو منہ میں لیے چبولتے رہنا عورت کی سماجی مجبوری ہوتی ہے۔ اُسے یہ سوچ کر ہی اُبکائیاں شروع ہو جاتیں کہ بیاہی تو وہ جائے گی بھلے وِشنو کے ساتھ مگر سوڈھی سے کیسے بچ پائے گی جو بیٹھتا تو تھا تنہائی میں اُس کی ماں کے ساتھ لیکن اُس کی نظریں کسی برے کی مانند اُس کے اَنگ اَنگ میں سوراخ کیے رہتیں۔

دو مَردوں کا عورت کو دیکھنا کس قدر مختلف ہو سکتا تھا اِس کا احساس ٹُلسی کو اُس دن ہوا کہ جب اُسے آخری بار فیاض نے دیکھا تھا۔ وگرنہ اُس سے پہلے سوڈھی کا دیکھنا تو یوں لگا کرتا کہ جیسے بھرے بازار میں ملبوس ہوتے ہوئے بھی وہ برہنہ ہو لیکن فیاض پر اُس کے جسمانی خطوط کا وضاحت سے واضح ہو جانا بھی ٹُلسی کو مکمل مُلبس ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔ ایک کا دیکھنا نِری اذیت اور دوسرے کا تکنا کمال محبت۔ ٹُلسی حیران ہوا کرتی کہ اُس کے محسوسات کے بالکل برعکس چاچا سوڈھی اُس کی ماں کو اتنا کیوں پسند ہے اور فیاض جو اُسے پسند ہے اُس کا آنا اُس کی ماں کو پسند کیوں نہیں۔ کیا یوں بھی ہوتا ہو گا کہ ایک ہی مرد دو عورتوں میں سے ایک کو کچھ اور لگے اور دوسری کو کچھ اور۔ آخر وہ کیا شے ہو گی کہ جو ایک کے لیے تو ماکھی یعنی شہد ہو اور دوسری کے واسطے کڑوی رَتَوِل۔ وہ کچھ کچھ سمجھنے لگی تھی کہ ضروری نہیں عورت اُس مرد کے لیے ہی بنی ہو کہ جس کے ساتھ وہ

بیاہی جاتی ہے یا جس کے بچے جنتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اُس کے جسم کی تخلیقی شبیہہ کسی اور مرد کی شبیہہ کی ماپ کے مطابق منقش کی گئی ہو، ایسا مرد جس کے ساتھ اُس کا سماجی مُکلاوا تو نہیں ہو پاتا مگر وہ اَنت اُسی کی ہو کر رہتی ہے۔ ایک دوسرے کی تخلیقی ساخت پر بنائے گئے عورت مرد بھلے جہاں بھی پیدا ہوں، کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی وہ ایک نہ ایک دن ضرور آپس میں مل ہی جاتے ہیں، جسمانی سنجوگ کا فطری تقاضا پورا کرنے کے لیے۔ ٹلسی کو لگا کہ یہ تقاضا قدرت کی امانت کی مانند ہوتا ہے جو امانت دار کو اُس کی امانت پہنچانے تک مسلسل بے چین کئے رکھتا ہے۔ شاید تخلیقی ماپ کی بنیاد پر ہونے والی جُوت، سماجی جُوت سے برتر ہوتی ہوگی۔

ٹلسی نے اسکول کے زمانے میں کسی اُستانی سے سُنا تھا کہ عورت مرد کے جوڑے تو آسمانوں پر بنائے جاتے ہیں مگر اب احساس یہ ہورہا تھا کہ آسمانوں پر بننے والے جوڑے وہ نہیں ہوتے جو سماجی بیاہ کی صورت زمین پر بنائے جاتے ہیں بلکہ یہ تو آسمانوں سے بنے بنائے آتے ہیں اور زمین پر ایک دوسرے کی تلاش میں اپنا اپنا راستہ بھال کرنا پسندیدہ سماجی جڑت کو رد کرتے ہوئے کسی نہ کسی شکل میں اپنا تخلیقی جوڑ، جوڑے رہتے ہیں۔

ٹلسی کو شاید اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا کہ کسی عورت کا من چاہا مرد کسی دوسری عورت کے لیے ناپسندیدہ کیوں ہوتا ہے؟ اُس کی ماں کی شادی بھلے حکیم رام لعل کے ساتھ ہوئی تھی اور اِس سماجی جبر کے نتیجے میں ایک بچی بھی پیدا ہوگئی لیکن حقیقت یہی تھی کہ اُس کے جسم کی تخلیقی شبیہہ چاچے سوڈھی کی ماپ پر کندہ کی گئی، تراشی گئی تھی۔

''تو کیا میری ماں اپنے فطری سنجوگ کے واسطے میرے باپ سے بے وفائی کر رہی ہے؟''، ٹلسی اپنے آپ سے مکالمہ کرنے کی کوشش میں کچھ اور بھنور در بھنور پھنستی چلی جارہی تھی۔

''کیا سماجی سنجوگ میں رہتے ہوئے فطری سنجوگ کا اُدھار چکانا بے وفائی ہوگا؟ اگر یہ بے وفائی ہے تو کیا میرے باپ کو اِس کا علم نہیں یا اُس نے جان بوجھ کر آنکھ موندر کھی ہے؟ کیا اِن دونوں صورتوں میں قصور میری ماں کا ہے یا باپ کا''۔ ٹلسی گردن جھکا کر بیٹھ گئی۔ اُسے دونوں

صورتوں میں قصوروار اپنا باپ ہی لگ رہا تھا۔ اگر شوہر ہوتے ہوئے بھی اُسے اپنی بیوی کی جسمانی ضرورتوں کا علم نہیں اور اگر ہے بھی اور وہ اپنی ذمہ داری کسی دوسرے پر چھوڑ کر خود ایک طرف ہو بیٹھا ہے تو ایسے میں اُس کی ماں کو پورا حق حاصل تھا کہ اِس قسم کے شوہر سے اِسی قسم کا ہی سلوک کرے۔ یہ سوچتے ہوئے ٹُلسی کو اپنے ذہن میں موجود چاچے سوڈھی کے خلاف نفرت کے نکاس کا رُخ اپنے باپ کی طرف ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

''ایک لمحے کے لیے اگر یہ بے وفائی ہی ہے تو میں خود کون سی راہ پر چل نکلی ہوں؟ کیوں ناں چلوں میں اِس راہ پر؟ اگر چہ میری شادی وِشنو کے ساتھ طے ہو چکی ہے مگر میرا جسم تو فیاض کی تخلیقی ماپ برابر تراشا گیا ہے۔'' یہ سوچ کر اُس نے ایک بھرپور نگاہ اپنے آپ پر ڈالی اور پھر اپنے آپ سے ہی شرما گئی۔ ٹُلسی کو یوں لگا جیسے وہ فیاض کے سراپے کا میچا دیکھ رہی ہے۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے آپ کو ٹٹولنا شروع کیا تو پورے بدن میں مستی کی لہریں جاگنا شروع ہو گئیں۔

''ہوں تو یہ جسم فیاض کا میچا ہونے کے سبب فیاض کی تلاش میں ہے....... تبھی تو وہ مجھے اپنی جانب کھینچے چلا جا رہا ہے''..... ٹُلسی کچھ اور بھی شرما گئی۔ ''اگر میرا یہ وجود فیاض کی امانت ہے تو کیوں ناں یہ امانت اُس تک پہنچا کر ہلکی پھلکی ہو جاؤں''۔ ٹُلسی چارپائی سے اُتر کر چھَم چھَم چلتی ہوئی بڑے آئینے کے روبرو جا کر کھڑی ہو گئی۔ پہلے تو یونہی اپنے آپ پر ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی مگر پھر کچھ غور کے ساتھ اور پھر انتہائی غور کے ساتھ۔ اُسے اپنا سبھی کچھ اُوپرا اُوپرا سا لگنے لگا تھا۔ جیسے اُس کی روح کسی اور بدن میں آ گئی ہو۔ ٹُلسی نے ایک بار پھر اپنے بدن پر ہاتھ پھیرا۔ یہ جو بھی تھا، جس کا بھی تھا، مگر تھا بہت ہی چسولا۔ وہ مسکرا دی۔ ''اب آنکھیں موند رکھنے کی باری وِشنو کی ہوگی۔''

کہیں سے ٹُلسی کے کانوں میں ہلکی سی سرگوشی ہوئی۔ ''ہو نہ ہو یہ کھیل تم اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے کھیل رہی ہو۔'' وہ اپنے آپ ہی ہنس دی۔ ''کمزور کا بدلہ کون لیتا ہے۔ میرا باپ

تو کمزور انسانوں کی اُس نسل سے ہے کہ جو اپنا سبھی کچھ چاچے سوڈھی کے حوالے کرنے کے بعد جگ جہان کا دوا دارو تو کر رہا ہے مگر اپنی گھر والی کی نبض ہاتھ میں نہیں آ رہی۔'' یہ سب کچھ سوچ سوچ کر ٹلسی کو جہاں اپنے باپ سے نفرت ہوتی جا رہی تھی وہیں اُسے اب چاچے سوڈھی کا تاڑنا بھی اتنا بُرا نہیں لگ رہا تھا کہ جتنا پہلے لگا کرتا تھا۔ اُس کے کانوں میں پھر کہیں ہلکی سی سرگوشی ہوئی کہ جو مرد کسی عورت کو اپنی گرفت میں گرفتانے کی رَمز جانتا ہے، اُسے پورا حق ہے کہ اپنے میچے برابر ترشی ہوئی عورت کو رَج رَج سنبھالے اور گج وَج چھوڑے، نچوڑے۔

اِسی اُدھیڑ بن میں دروازے کی کُنڈی کھڑکی تو ٹلسی کا دل دھڑچ ہوا۔ ''ضرور فیاض ہوگا''...... دِل کی آواز پر وہ ویسے ہی تَھل تَھل کرتی ہوئی باہر کی طرف اِس طرح دوڑی کہ نہ تو سَر پر دوپٹہ اور نہ ہی پیروں میں جوتی۔ ابھی اُس نے آدھا دالان بھی عبور نہیں کیا تھا کہ اُس کی ماں نے دروازے پر پہنچ کر کُنڈی کھول دی۔ یوں لگا کہ عورت پہلے ہی سے کسی کے آنے کی منتظر تھی۔ ٹلسی کے قدم تو وہیں کے وہیں تھم گئے لیکن دھڑکتے دل کو کون روکتا، ویسے ہی دَھک دَھک دھڑکے جا رہا تھا۔ ٹلسی کو خدشہ تو اِس بات کا تھا کہ کہیں اُس کی ماں فیاض کو وہیں سے ہی اُلٹے پاؤں واپس نہ بھیج دے۔ مگر جونہی رادھی ڈیوڑھی سے باہر نکلی تو سوڈھی اُس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ دونوں کے چہروں پر ایک عجیب سی خوشی کی گُلالی نے ٹلسی کا رَنگ بالکل ہی پھکو ہَڑ کر دیا اور وہ وہیں کی وہیں ساکت ہو کر رہ گئی۔ رادھی کو بھی قطعی طور پر توقع نہیں تھی کہ اتنی احتیاط کے باوجود ٹلسی اِس طرح اُن کے سامنے آ جائے گی۔ اِس صورت حال میں پھر بھی رادھی نے سُرت سنبھالی اور ٹلسی سے پوچھ ہی لیا کہ خیریت تو ہے! اور تمہیں ہوا کیا ہے، جاؤ اندر جاؤ اور منہ متھا سنوارو''۔

مگر اِس کے باوجود ٹلسی حیران و ششدر وہیں کی وہیں کھڑی رہی۔ اُس کی ماں کے پیچھے پیچھے چلتا چاچا سوڈھی ہلکے ہلکے مسکراتا ہوا اُسے ایسے تکے جا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو ''تو کہاں جائے گی ٹلسی! میرے ماپ اور میچے کی رَن صرف تمہاری ماں ہی نہیں، اب اگلی باری تمہاری ہو گی۔'' اُس کی نظریں بوریاں سینے والے سوئے کی نوک کی مانند اُس کے بدن کے گوشے گوشے

میں چھید کرتی ہوئیں برامدے کی اُوٹ میں دور ہوتی چلی گئیں۔

تھوڑی دیر پہلے اُس کے دل میں جگہ بناتا ہوا چاچا سوڈھی پھر سے ایک ایسے گدھ کی صورت پر پھیلائے ہوئے اُس کے سامنے آ گیا جو ایک مُردار کا گوشت کھاتے ہوئے دوسری لاش کا ایک آدھ ٹکڑا اپنے پنجے میں پھنسائے رہتا ہے۔ تُلسی کا جی متلایا تو وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی اور رنگلے پلنگ پر بیٹھ کر ایک بار پھر سوچنے لگی کہ اِس قسم کی بے وفائی کا ذمہ دار کون ہے..... آسمانوں پر ہونے والی کوئی راند..... یا پھر زمین پر ہونے والا کوئی اَن بھاتا، اجنبی فیصلہ جس کی کوئی دلیل اور نہ ہی کوئی اپیل۔

(8)

تیسرے دن کی شام ڈھلنے لگی تو وادھو کی ماں بہو کو ساتھ لے کر دھچر کے گھر جا پہنچی۔ دھچر بھی ہاتھ منہ دھو کر روٹی مانی کھائے بغیر بیوی کو ساتھ لیے اُن کی تکریم کی خاطر گردن جھکائے روبرو بیٹھ گیا۔ اگر چہ دونوں عورتیں پردے کی خاطر گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھیں مگر پھر بھی وادھو کی ماں کی آنکھوں سے بار بار بہتے ہوئے آنسو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اِس سے پہلے کہ وادھو کی ماں کچھ کہتی دھچر خود ہی بول پڑا ''اماں! بے غیرتی تو وادھو نے کی ہے مگر شرمسار میں ہوں۔'' یہ سنتے ہی وادھو کی ماں کا مجتمع کیا ہوا حوصلہ جواب دے گیا۔ ''پُتر تم تو صرف شرمسار ہو مگر ہماری خبر کس نے رکھنی ہے۔ تمہارے دوست کو تو غیرت نہیں آئی کہ گھر میں دو عورتیں تین دنوں سے تن تنہا پڑی بھوک پیاس سے مر رہی ہیں۔ نہ گھر میں کھانے کو کچھ ہے اور نہ ہم کہیں جا سکتی ہیں مگر اُس مہان غیرت مند کو پرواہ ہی نہیں۔ میرا پیغام دے دو اُس کو، اگر وہ گھر نہیں آئے گا تو میں بھی اِس لڑکی کو ساتھ لے کر کسی مسجد کے دروازے پر جا بیٹھوں گی بھیک مانگنے کے لیے''۔

یہ سب کچھ کہتے ہوئے وادھو کی ماں کے چہرے سے گھونگھٹ تو اُترا سو اُترا، مہراں کا گھونگھٹ بھی کچھ کچھ چہرے سے ہٹ گیا جو اپنی ساس کے برعکس نکھری نکھری اور تر و تازہ لگ

رہی تھی؛ نہ کوئی آنسو نہ کوئی آہ۔ دھچر کی نگاہ اچانک اُس کے چہرے پر پڑی تو وہیں جم گئی۔ ''اتنی خوبصورت عورت ...... اِس کے سامنے تو مہان ریاستی شاعر مُرم سَیں کی محبوبہ حیدر باندی کا حسن بھی ماند کہ جس کی خاطر پورا ہندسندھ پاگل ہوا پھرتا ہے۔ اُسے افسوس ہوا کہ وادھو کیوں بات بے بات اپنی حور جیسی بیوی کو بدصورت اور جگ جہان کی بدصورت عورتوں کو خوبصورت کہتا رہتا ہے۔ کیا اُس کا دماغ چل گیا ہے یا پھر کہیں اپنی کوئی خامی چھپانے کے لیے بیوی کو رُسوا کئے رہتا ہے۔'' دھچر کا دماغ تیزی سے گھومنے لگا تھا۔ ''اِس کا مطلب یہ ہوا کہ وادھو کا بال بچہ نہ ہونے میں قصور وادھو کا ہے، اُس کی عورت کا نہیں۔ یہ بھڑکی ہوئی آگ کی طرح جوان لڑکی کس طرح بانجھ ہوسکتی ہے۔''

دھچر کے اِس سوچ بچار میں مہراں کو یوں لگا کہ وہ اُسے کافی دیر سے مسلسل تاڑے جا رہا ہے۔ اُس نے آنکھیں اُوپر کو کیں تو دھچر کی دید اُسی پر مرکوز تھی مگر مہراں نے نہ تو آنکھوں کو نیچے کیا اور نہ ہی گھونگھٹ کو پھر سے ٹھیک کرنے کی کوئی کوشش کی۔ اُلٹا وہ غیر ارادی طور پر دھچر کو اُسی بے باکی سے دیکھنے لگی کہ جیسے وہ اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ دھچر اُس کے اِس طرح دیکھنے کی تاب نہ لا سکا اور گھبرا کر گردن جھکا لی۔ مہراں ساری صورتِ حال سے قطعی لاتعلق اپنے آپ ہی مسکرادی ''ہونہہ! مرد بنے پھرتے ہیں۔ عورت کا دیکھنا تو دیکھا نہیں جاتا اور خواہش رکھتے ہیں اُسے باندھ کے رکھنے کی۔'' دھچر کی حالت دیکھ کر مہراں کو اُس گھبرو فیاض کے بازوؤں کی جکڑن یاد آ گئی کہ جس میں جکڑے جانے کے بعد وہ کھسکنے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔ ''یہ سبھی نوجوان فیاض کی مانند کیوں نہیں ہوتے۔'' فیاض کا سوچ کر ہی مہراں کا اَنگ اَنگ خود بخود پھڑکنے اور تھرکنے لگ گیا۔ اُس نے گھبرا کر خود کو دیکھا مگر دیکھنے میں تو کچھ بھی انوکھا محسوس نہ ہوا۔ کپکپی کا صرف احساس تھا، اصل میں اُس کی روح تک میں کچھ ٹوٹ رہا تھا، اِس ٹوٹنے نے اندر و اندر ہی دراڑیں ڈالنی شروع کر رکھی تھیں اور مہراں کو دھچر کے گھر اُس کی بیوی کے سامنے بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔

دوسری جانب دھچر بھی اِسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ اتنی خوبصورت لڑکی کا یہ حال کر کے

وادھوخود گھر سے کیوں کنارا کئے ہوئے تھا۔ اگر وہ مہراں کے جوبن کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تو چھوڑے اُسے طلاق دے۔ لفظ طلاق ذہن میں آتے ہی دچھر کو یاد آیا کہ وادھوتو خود ہی مہراں کو طلاق دینے کا فیصلہ کئے ہوئے ہے۔ اَپنی دھج بنانے کے واسطے فوراً بولا'' وادھوتو بے وقوف ہے، کہتا ہے کہ میں تو بیوی کو طلاق دے کر رہوں گا۔ یہ تو میں نے اُسے سمجھایا ہے کہ اتنی اچھی بیوی کو طلاق دے کر برباد کرو گے تو تم خود برباد ہو گے۔ اور پھر رشتہ بھی کسی نے نہیں دینا۔''

دچھر کا خیال تھا کہ اُس کی بات سن کر مہراں روئے دھوئے گی، اُس کا منت ترلا کرے گی کہ وہ وادھو کو کاغذ دینے سے منع کرے مگر مہراں کا رویہ تو ایسے تھا کہ جیسے اُس نے کوئی بات سنی ہی نہ ہو۔ مہراں کی لاتعلقی اور بے توجہی سے قطع نظر وادھو کی ماں نے بیٹے کی جان کو رونا شروع کر دیا کہ اُس نے مہراں کو طلاق دینے کا سوچا کیسے ہے۔ ''کہاں جائے گی بے چاری یتیم لڑکی، نہ ماں سَر پر اور نہ ہی باپ۔ اگر ہوتے بھی تو میں پھر بھی یہ ظلم نہ ہونے دیتی۔ مہراں تو میری بہن کی بیٹی ہے، میرا خون ہے، میں بھلا کیسے ہونے دوں گی اِس کو کاغذ۔''

''اماں میری تو وہ نہیں مانتا''۔ دچھر نے ایک اور پینترا بدلا۔ ''تم ہی کچھ سمجھاؤ کہ بھابھی ہماری کو حکیم رام لعل کو دکھائے۔ چنگا بھلا سیانا ہے۔ اللہ مالک ہے، بیٹا نہ دے گا تو نہ دے، بیٹی تو کہیں نہیں گئی۔''

''وہ خود کیوں نہیں دکھاتا حکیم کو''۔ مہراں نے پہلی بار لب کھولے تو آواز میں گھن گرج تھی بن برسے بادلوں والی۔ ''کیا صرف میں رہ گئی ہوں حکیموں کو دکھانے کے واسطے۔ اَدا کہہ دو اپنے دوست کو کہ دے مجھے طلاق۔ پھر وہ بھی شادی کرے اور میں بھی کرتی ہوں، دیکھتے ہیں کہ کس کے ہاں بچہ پہلے پیدا ہوتا ہے۔''

مہراں نے تو جو بات کرنی تھی کر دی مگر وادھو کی ماں حیرت اور شرمندگی کے مارے گھونگھٹ ہی میں ادھ مری ہو کر سکڑ گئی۔ دچھر اور اُس کی بیوی کا بھی عجب حال تھا۔ اُن کی آنکھیں مہراں کی جانب اَٹک کر رہ گئی تھیں۔ وادھو کی ماں نے دچھر کو اِس طرح مہراں کو تاڑتے دیکھا تو

ہاتھ بڑھا کر اُس کا گھونگھٹ جوڑنے لگی کہ اُس کا پردہ بے پردگی کی جانب جا چکا تھا مگر مہراں کی جانب سے کسی قسم کا کوئی تاثر سامنے نہ آیا بس خاموشی سے دھچر کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ دیکھنے والوں کو سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ کون کس کو تاڑ رہا ہے۔ اِس صورتِ حال میں دھچر اتنا حواس باختہ ہوا کہ کچھ نہ سمجھ میں آتے ہوئے بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ دھچر کھڑا ہوا تو اُس کی بیوی بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور آنکھوں آنکھوں میں پوچھنے لگی کہ اِن کو کھانا بھی کھلانا ہے کہ نہیں۔

دھچر کی بدحواسی اتنی بڑھی کہ وہ بیوی کا واضح اشارہ بھی نہ سمجھ سکا۔ ''اماں تم بھابھی کو لے کر گھر چلو میں وادھو کو تلاش کر کے ابھی لے آتا ہوں۔'' دھچر تیز تیز بولتا ہوا کوٹھے میں گھس گیا مگر اُس کی بیوی وادھو کی اماں اور بیوی کو رخصت کرنے کے لیے وہیں کھڑی رہی۔ پتہ نہیں کیوں وادھو کی ماں کو ایسے لگا کہ دھچر نے اُس کی بات محض سُننے کی حد تک سُن لی ہے اور وہ وادھو کو گھر لے کر آنے والا نہیں۔ پھر بھی جاتے جاتے اُس نے اونچی آواز میں دھچر کو سُنا ہی دیا کہ بیٹا اگر وادھو گھر نہ بھی آنا چاہے تو مجھے بتا ضرور جانا، میں اَجائی انتظار نہ کرتی رہوں۔

جیسے ہی اُن دونوں نے گھر کی چوکھٹ عبور کی دھچر کی بیوی شوہر کے گلے پڑ گئی۔

''تمہیں لحاظ نہیں آئی اِس طرح دوست کی بیوی کو تاڑتے ہوئے..... ہوش کھو بیٹھے تھے کیا؟ ہونہہ! آج تو تم نے انتہا کر دی، نہ اُس کی ساس کا لحاظ اور نہ کوئی میرا حیا۔ آخر کون سی انوکھی بات تھی اُس میں جو کسی اور میں نہیں۔ کبھی نہیں دیکھا کسی جوان لڑکی کو........؟

دھچر کی بیوی نے قیامت تو برپا کر دی مگر اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اِس کا جواب کیا دے۔ ''جوان لڑکیاں تو بہت دیکھی ہیں مگر اِس طرح کی پکی پکی اور اپنے ہی زور سے دراڑ و دراڑ نہیں دیکھی۔'' دھچر گھڑونجی پر جا کر، گھڑے کو ٹیڑھا کرتے ہوئے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار مار خود سے ہی گفتگو کیے جا رہا تھا۔

''کیا بُڑ بُڑ لگائی ہوئی ہے ...... ندیدگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اُن میاں بیوی میں تو صلح ہو جائے گی، آج نہیں تو کل، مگر تمہاری عزت کیا رہ گئی کہ گھر آئے مہمانوں کو پانی کانجی کا بھی

نہیں پوچھا۔'' بیوی کی باتیں دھچر کے سر کے اوپر سے گذر رہی تھیں۔ وہ تو اب تک اسی مخمصے میں تھا کہ وادھو اُس سے جھوٹ کیوں بولتا رہا ہے؟ کیا بیوی کو بدصورت گردان کر اُس کی کسی محرومی کو تسکین ملتی تھی یا وہ نہیں چاہتا کہ اُس کی اِس حالت میں کوئی بھی دوسرا مرد اُس کی بیوی میں دلچسپی لے یا اُس کی جانب پیش قدمی کرے؟ شاید یہی بات تھی کہ وادھو اپنی بیوی کو حکیم کے پاس بھی نہیں آنے دیتا تھا۔ یہی سوچ سوچتے وادھو قریب رکھی چارپائی پر جا بیٹھا اور کندھے پر رکھے رومال سے منہ پونچھنے لگا۔

''وادھو کر کیا رہا ہے اپنے ساتھ اور اُس بے چاری لڑکی کے ساتھ۔ اب بھی وہ اِس کا گلا نہ دبائے تو اور کیا کرے۔ میرے نزدیک تو یہ مہراں کی شرافت ہے کہ اُس نے اب تک اِدھر اُدھر منہ نہیں مارا ورنہ اُس میں کوئی کمی تو نہیں۔ خوامخواہ ذلیل کیا ہوا ہے۔ علاج کرائے تو اپنا کرائے نہیں تو جان چھوڑے اُس کی، کاغذ دے۔'' یہ سبھی سوال دھچر کی صورت سے صاف پڑھے جا رہے تھے مگر اُس کی بیوی کہاں تک بولے جاتی، آخر چُپ کر کے گھر کے کام کاج میں جُت گئی تا کہ بروقت نمٹا کر چھوٹے کے اُٹھنے سے پہلے ہی فارغ ہو بیٹھے۔ مگر ایک پریشانی اُس کی جان سے چمٹی ہوئی تھی۔ آخر عورت ذات تھی، اپنے شوہر کا کسی غیر عورت کو گرم شیرے کے کڑاہ میں سے نکلتی تازہ جلیبی سمجھ کے دیکھنا کیسے بھول سکتی تھی۔ خاص طور پر اُس دل شکستہ عورت کو جو جذباتی لحاظ سے ابھی تازہ تازہ کچلی گئی ہو، مَسلی گئی ہو۔ اُس نے کوٹھے کی جانب جھانکا، دھچر آئینے کے سامنے کنگھی کرتے ہوئے کھڑا ہو کر مانگ نکالنے کی کوشش میں تھا۔ وہ شاید وادھو کو منانے جا رہا تھا۔ اُس کی بیوی نے کچھ سوچ کر ٹانگ اڑانے کو کوشش کی۔

''کھانا تو کھاتے جائیں........''

''وادھو کو لیتا آؤں...... دونوں مل کر کھاتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے دھچر گھر سے باہر نکل گیا۔
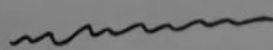
(9)

1947ء کے آغاز کے ساتھ ہی ریاست بہاول پور میں سیاست اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی ہونے کے باوجود ریاستی مستقبل کے بارے میں سیاسی اُتھل پتھل زور پکڑتی جا رہی تھی۔ 1942ء میں نافذ کئے گئے پبلک سوسائٹیز ایکٹ کی رو سے نہ صرف سیاسی پارٹی بنانے کی ممانعت تھی بلکہ یہاں کسی ہندوستانی سیاسی جماعت کی کوئی برانچ بھی قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن پھر بھی ریاستی حکومت کی چشم پوشی کے سبب کئی انڈین سیاسی جماعتیں ریاست میں اپنا اپنا دفتر بنائے ہوئے تھیں لیکن اجنبی ناموں کے ساتھ۔ مجلس احرار کا نام حزب اللہ، مسلم لیگ بنی جمات المسلمین اور انڈین نیشنل کانگریس کا ریاستی نام خدامِ وطن سبھی کو معلوم تھا۔ اِس پس منظر میں ہندوستان کی تحریک آزادی کسی نہ کسی شکل میں عملی طور پر آگے بڑھ رہی تھی۔ تین جون 1947ء کا منصوبہ سامنے آنے کے بعد سیاست گلی محلوں میں سے نکل کر چوک چوراستوں تک آن پہنچی۔ غوغا صرف ایک ہی تھا کہ نواب صاحب کا فیصلہ کیا ہوگا؛ پاکستان، ہندوستان یا پھر آزاد حیثیت؟

ریاست بہاول پور پنجاب اور سندھ کے وسط میں ہونے کے باوجود قدرتی طور پر اپنا الگ وجود رکھتی تھی۔ ستلج دریا اِسے پاکپتن، ملتان، وہاڑی اور لودھراں سے الگ کرتا تھا تو ستلج اور

چناب مل کر مظفر گڑھ سے حد بندی کرتے تھے۔ یہ دونوں دریا دریائے سندھ سے ملنے کے بعد بہاول پور کو راجن پور اور گھوٹکی سے جدا کر کے روہی (چولستان) سے جوڑ دیتے تھے جو بیکانیر، جیسلمیر اور سندھ میں تھر کے ساتھ جڑ جاتی ہے۔ اگرچہ ریاست میں کوئی پہاڑی سلسلہ نہ تھا مگر پھر بھی یہاں کے میدان اور پانی کی فراوانی نے چاروں جانب ہریالی بکھار رکھی تھی۔ لوگ خوشحال اور کھاتے پیتے، جرائم نہ ہونے کے برابر اور یہاں کے بازار سامان سے لدے پھندے اور گاہکوں سے بھرے ہوئے۔ مذہبی رواداری کے ہوتے ہوئے بھی ریاست کی مجموعی شناخت اسلامی تھی اور خود نواب صاحب اسلامی تعلیمات اور روایات کے سب سے بڑے پرچارک۔ ریاستی آبادی میں مسلمان اگرچہ اِکیاسی فیصد اور ہندو، سِکھ، عیسائی وغیرہ اُنیس فیصد مگر پھر بھی ہندوؤں کے سمیت سبھی غیر مسلموں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل تھی۔

ریاستی حکومت کا اخبار ''صادق الاخبار'' چھپائی کے لحاظ سے اگرچہ ہفت روزہ مگر ریاستی معاملات کے ساتھ ساتھ اطراف کی خبر بھی رکھتا تھا۔ تحریکِ آزادی کے مہمیز کئے جانے کے بعد ہندوستان کے دیگر مسلم اکثریتی علاقوں کی طرح ریاست کی ہندو آبادی میں اپنی بقا کے سلسلے میں بے چینی تو تھی مگر قدرے کم۔ اِس بے چینی کو دیکھتے ہوئے جہاں صادق ایجرٹن کالج بہاول پور میں ''انجمن رفیقِ طلباء'' بنی وہاں مسلم لیگی نظریات کے فروغ کے لیے ''مسلم بورڈ'' بھی سامنے آ گیا جس نے ''جماعت المسلمین'' کے قریب آ کر ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے لیے تحریک شروع کر دی اور اِس تحریک کی بنیاد دو اخبارات ''نوائے مسلم'' اور ''انصاف'' کی اشاعتی حکمت عملی پر رکھی گئیں۔ مگر ڈیرہ نواب میں اِن دونوں اخباروں کی فروخت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اگر کوئی کہیں سے یہ اخبار چھپا کر لے بھی آتا تو یہی سمجھا جاتا کہ وہ نواب صاحب کی بجائے خود ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔

اِس صورتحال میں ریاست کی مذہبی اقلیت کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے اُن کو اُن کے گھروں سے نہ نکالا جائے اور نہ ہی وطن سے بے وطن کیا جائے۔ اُن کا تو جینا مرنا اِسی

دھرتی کے ساتھ ہے اور یہی اُن کی پہچان ہے۔ اس سوچ کا سبب نواب صاحب کی جانب سے دلائی جانے والی یقین دہانیاں بھی تھیں مگر ان کے باوجود یہاں کی ہندو آبادی بھانپ چکی تھی کہ ریاست میں اُن کے دن گنے جا چکے ہیں۔ نسل در نسل ایک ہی گلی میں رہنے والے ہم دیوار ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے نامعلوم سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ ہر کوئی کسی اَن چاہے موقع یا اَن دیکھی مصیبت کے انتظار میں گھبرایا ہوا پھر رہا ہے یا پھر کسی ایسے موقع کی تلاش میں ہے جو کسی وقت، کہیں سے بھی دستیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ اس موقع کے بعد کون شکاری ہوگا اور کون شکار۔

اُن دنوں احمد پور میں ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے ریاستی آبادی کے مختلف طبقات میں ایک اَن دیکھی دراڑ ڈال دی۔ احمد پور اور ڈیرہ نواب کے درمیان میں جہاں جی ٹی روڈ دونوں شہروں کو تقسیم کرتی ہے، وہاں نادر باغ کے موڑ کے ساتھ ایک چوک سا بن گیا تھا۔ اِسی چوک کے شرقی جانب نہر کے کنارے، بچوں کا قدیمی شمشان تھا۔ ہندو یہاں پر چھ برس سے کم عمر کے بچوں کی لاشوں کو تو دفن کیا کرتے تھے مگر اِس عمر سے بڑے بچوں کی لاشوں کو جلایا جاتا تھا۔ لاش کو جلانے کی صورت میں اُن کے ورثاء تین دن کے بعد آ کر خاکستر اجسام کی ہڈیاں اور راکھ اکٹھی کر کے بہتے پانی میں بہا دیا کرتے تھے۔ ہوا یوں کہ ایک گبھرو کی چِتا کو آگ دینے کے بعد جب اُس کے گھر والے کھوپڑی پھٹنے کا انتظار کر رہے تھے کسی نے نہر کے بنے کو اِسی جانب سے کٹ لگا دیا کہ جس طرف شمشان واقع تھا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے پورا شمشان گوڈے گوڈے پانی سے بھر گیا۔ کچھ لوگوں نے آ کر گواہی دی کہ دو جوان جنہوں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھا ہوا تھا، نہر کو جان بوجھ کر کٹ لگا رہے تھے۔ شرارت چاہے جس نے بھی کی مگر اس چھوٹی سی حرکت سے ہندو آبادی میں نہ صرف اشتعال اور غصہ در آیا بلکہ خوف اور بے اعتباری جو پہلے ہی کچھ زیادہ محسوس کی جا رہی تھی اب اور بھی نہ ہونے کے برابر ہوتی چلی گئی۔ اقلیتی مذہب کے لوگوں نے مشتعل ہو کر بھلا کیا کر لینا تھا، بس یہی ہوا کہ انہوں نے بکھر کر رہنے کی بجائے ایک ہی آبادی میں قریب

قریب رہنا شروع کر دیا۔ کاروبار جو پہلے ہی ہندو اور سکھ کمیونٹی کے پاس تھا، مندی کا شکار ہوتا چلا گیا اِس لیے کہ مزید دھن اُنڈیلنا زرا گھاٹے کا سودا دکھائی دے رہا تھا۔ ان لوگوں نے غیر یقینی کی صورتحال میں نئے گھر تو کیا بنانے تھے، پرانے گھروں کی مرمت اور سفیدیاں بھی موخر کرنا شروع کر دیں۔ نواب صاحب کی پوری کوشش تھی کہ ریاستی عوام کے درمیان نفاق نہ ہونے پائے تاکہ کوئی ایسا فیصلہ ہو سکے جو عوام اور ریاست دونوں کے مفاد میں ہو مگر کانگریس اور مسلم لیگ کے حمایت یافتہ پریس نے اپنی اپنی خبروں سے یہاں کی آبادی کو شعوری سطح پر کئی خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ یہ معاملہ نواب صادق محمد خان جیسے عوام دوست حکمران کے لیے یقیناً فکرمندی کا موجب تھا جس میں ہر آنے والا دن اضافہ ہی کیئے جا رہا تھا۔

(10)

حکیم رام لعل ڈیرہ نواب صاحب میں اپنے مطب سے فراغت کے بعد اکثر شام ڈھلے ذاتی گھوڑے تانگے پر احمد پور میں واقع گھر کی جانب روانہ ہوتا۔ اگرچہ کوچوان اُس کا برسہا برس سے ملازم اور اعتباری ہونے کے ساتھ ساتھ مذہباً ہندو بھی تھا مگر بدلتے ہوئے حالات میں احتیاط کے تقاضے کے طور پر یہی طے ہوا کہ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی وہ گھر پہنچ جایا کرے اور بعد ازاں کے گھنٹے دو گھنٹے کے لیے مطب فیاض کے حوالے کر دیا جائے۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرد مریض اور بوڑھی عورتیں تو شام ہونے سے پہلے ہی حکیم رام لعل کو نبض دکھا لیتیں مگر جوان لڑکیوں کی کوشش یہی ہوتی کہ کسی ناں کسی بہانے دیر ہو جائے اور اُن کی کلائی بوڑھے حکیم کی بجائے گبھرو فیاض کے ہاتھ میں آئے۔ لیکن دوسری طرف فیاض کو نہ تو اِس میں کوئی لطف اور نہ ہی کوئی رغبت۔ اُسے کیا جو کلائی کیسی ہے یا کس کی ہے۔ وہ تو بس نبض کی چال اور ماس کی حدت سے غرض رکھتا تھا اور بوجھ لیتا کہ معاملہ کیا ہے۔ اُسے اُن لڑکیوں پر بھی شدید غصہ آتا جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بیماری کا بہانہ بنا کر نقاب ہی نقاب میں اُسے تاڑنے آن بیٹھتی تھیں۔

ایسی مریضاؤں کو وہ کیا دوا دیتا اور کیا اُن کا علاج کرتا۔ پہلے پہل تو فیاض کچھ نہ سمجھ پاتا

کہ یہ کیسی بیمار ہیں کہ جن کی نبض اُن کے خلاف گواہی دیتی ہے۔ایسی خودساختہ بیمار دوشیزاؤں کی اُس نے ڈانٹ ڈپٹ شروع کی تو وہ اُلٹا مقابلے پر اُتر آئیں۔اُن کی مائیں بھی مجبور تھیں کہ طرف داری تو آخر کار اپنی اولاد کی کرنی پڑتی تھی۔اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے روز ہی حکیم صاحب کو شکایتیں ملنا شروع ہوگئیں کہ نِکا حکیم توجہ سے مریض نہیں دیکھتا، بس یونہی خانہ پری کئے رکھتا ہے۔حکیم رام لعل نے فیاض کی کھنچائی کی تو اُس نے ساری واردات کھول سنائی کہ عورتیں کیسے جھوٹ موٹ کی بیمار بن کر مطب میں آن بیٹھتی ہیں۔اب آپ ہی بتائیں کہ میں کیا علاج کروں اِن کا اور کونسی بیماری کا کروں۔

''بیٹا کس نے کہا تم سے کہ بیماری کا علاج کرو، علاج تو مریض کی نیت کا کیا جاتا ہے۔ضروری نہیں کہ ہمارے پاس آنے والے سبھی مریض بیمار بھی ہوں۔یہ جولڑکیاں ہوتی ہیں ناں، اِنہیں سب سے بڑا رُولا گھر سے نِکل کر باہر کی ہوا لگوانے کا ہوتا ہے، اِس لیے بیماری کا بہانہ بنا کر ہمارے پاس آن بیٹھتی ہیں۔ہمارا کیا جاتا ہے دو پُڑیاں پھکی کی دے کر۔اُن کی نیت کا علاج ہو جاتا ہے اور ہمارے ہاں گاہکی کی رونق لگی رہتی ہے۔''

''لیکن حکیم صاحب! یہ تو بے ایمانی.........''

حکیم اُکتا گیا۔''بچہ بے ایمانی بھی تو بیماری ہے، اگر ہم دو پُڑیوں سے علاج کر دیتے ہیں تو ہمارا کچھ بگڑتا نہیں، سنورتا ہے۔ہم نہیں کریں گے تو کوئی اور کر دے گا۔ہم خوامخواہ کیوں اپنی روٹی روزی پر لات ماریں اور گاہکی خراب کریں۔''

فیاض نے حکیم رام لعل کی بات سُنی تو اُس کے ایمان کی بلند و بالا عمارت ایک ہی لمحے میں دھڑام سے نیچے آن گری۔اُسے یوں لگا جیسے اُس کے بدن کو کسی نے اِس طرح ڈنڈوں سے پھینٹا ہو کہ اُس کی ہڈیاں بھی اندر وانداری چُورا چورا ہو کر سفوف بن گئی ہوں اور وہ خود کہیں کسی کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر پڑا ہے جہاں مکھیوں کی بھن بھن کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ فیاض کو تو حکیم رام لعل کسی ایسے فرشتے کی طرح دکھائی دیتا تھا کہ جو سارا دن حکمت کی گدی پر بیٹھ کر

لاچار مریضوں میں شفا بانٹتا رہتا ہے۔ مگر جس حکیم کا روپ اُس نے آج دیکھا وہ تو کسی لحاظ سے بھی حکیم رام لعل کے ساتھ لگا نہیں کھاتا تھا۔ وہ دُکھی ہو کر مطب سے باہر نکل آیا اور باہر رکھے لکڑی کے پھٹے پر بیٹھے مریضوں سے ہٹ کر ایک طرف ہو بیٹھا۔ یہ لوگ حقیقت دینے کے بعد دَوا ملنے کا انتظار کر رہے تھے۔

''اگر حکیم لوگوں کی بے ایمانی کا علاج بے ایمانی سے کرے گا تو پھر حکیم کی بے ایمانی کا علاج کون کرے گا۔'' یہ سوچتے ہوئے اُس کی نگاہ سڑک کی دوسری جانب گئی تو کیا دیکھتا ہے کہ وادھو اور دھچر، دونوں گپیں ہانک رہے تھے۔ وادھو پہلے کی طرح خوش اور مگن۔ مگر جیسے ہی اُس کی نگاہ فیاض پر پڑی وہ ماتھے پر بَل ڈالتے ہوئے پلٹا کھا کر اُس کی طرف پُشت کر کے بیٹھ گیا۔ فیاض کو وہ لمحہ یاد آیا کہ جب اُس کی بیوی اُسے دبوچ کر اُس کا گلا دبا رہی تھی اور وہ کُٹی کبوتر کی مانند اُس کی گرفت میں پھڑ پھڑائے جا رہا تھا۔ فیاض اپنے اندر ہونے والی توڑ مروڑ کی کیفیت کے باوجود مُسکرا دیا مگر یہ مسکرانا ایسے ہی تھا کہ جیسے زہر کا گھونٹ بھر کر بیٹھا ہو۔

وہ حیران تھا کہ کیسے لوگ ہیں اُس کے اطراف میں۔ بغیر کسی پہچان کے زندگی بسر کرنے والے لوگ مگر ہر کسی نے اپنی اپنی ساختہ پہچان کے ٹوکرے سَر پر اُٹھا رکھے تھے۔ ایک جانب اِس ریاست کا حاکم ہے کہ جس نے پندرہ لاکھ ریاستی آبادی کی تقدیر کا فیصلہ صرف اپنی ہاں یا ناں سے کرنا ہے۔ دوسری طرف اُس کا باپ ہے جس نے ساری زندگی نواب صاحب کے فوجی بینڈ کی دھنوں پر ٹانگیں کھڑکاتے ہوئے گزار دی ہے اور اب اپنی اگلی نسل کو بھی اِسی مُرلی کا ناچ نچانا چاہتا ہے۔ ایک یہ حکیم صاحب ہیں کہ جن کی قابلیت کا ایک جہان گواہ ہے مگر وہ اُسی جگ جہان کے ساتھ دھوکا کر رہا ہے۔ ایک یہ وادھو ہے جو گھر سے باہر تو ٹیٹن جوان جانا جاتا ہے مگر گھر پر بیوی سے جوتے کھا رہا ہوتا ہے۔ میرا قصور یہ ہے کہ میں نے اُس کی گردن اُس وقت اُس کی بیوی کے ہاتھوں سے چھڑائی کہ جب وہ اَدھ مرا ہو چکا تھا۔ ہونہہ! کیسے لوگ ہیں یہ جو خود کے نہ ہونے کو بھی ہونا سمجھتے ہیں۔ اُس کا دل چاہا کہ اُٹھ کر کہیں بھاگ جائے اور واپسی تب ہو کہ جب وہ اپنے آپ

کو تلاش کر چکا ہو یا مٹی کے ساتھ مٹی ہو چکا ہو۔

فیاض کو یوں لگا کہ یہ سبھی محض پرچھائیوں کے تعاقب میں ہیں۔ اِن کا مسئلہ اپنی پہچان نہیں بلکہ یہ کسی اور دھیان میں ہیں، اپنے آج کے دھیان میں۔ اِن کو پرواہ ہی نہیں کہ نواب صاحب اِن کی نسلوں کی پہچان کو کس طرح خاک کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ یہی نواب ہی تو ہے کہ جس نے اپنے سازشی مشیروں کے بہکاوے میں آ کر پوری ریاست کی زمینوں پر پنجاب کے آباد کار آن بٹھائے ہیں۔ ایک طرف مفت کی اراضی اور اِسٹامپ پیپر کے چار آنے کی ادائیگی بھی سرکاری خزانے سے اور دوسری جانب مقامیوں کے لیے صرف دھکے اور دھتکار۔ یہ کیسا دولہا ہے کہ جس نے اپنی ریاست کی بربادی کی بنیادیں اپنے ہاتھوں سے کھود رکھی ہیں۔ خود تو خوار ہو گا سو ہو گا مگر اپنی رعایا کو بھی صدیوں کی ذلالت میں دھکیل کر جائے گا۔

فیاض کچھ اور چڑ چڑا ہوا تو اُٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے سوچا کہ خاموشی سے گھر کی راہ لے مگر پھر خیال آیا کہ گھر میں ہے کیا...... وہی روز کا بحث مباحثہ کہ نواب کیا فیصلہ کرے گا۔ چولہے کے اطراف پھرتی اماں اور مسجد کی جانب آتا جاتا اَبا جو ہندو حکیم سے علاج تو کرا سکتا ہے مگر یہ قبول کرنے کو تیار نہیں کہ اُس کا بیٹا اُسی ہندو حکیم کے ہاں ملازمت کرے۔ وہ یہ سمجھنے سے بھی قاصر تھا کہ ایک ہی طرح کا انسان محض اپنے مذہب، برادری یا زبان کے سبب کہیں تعداد میں کم ہو تو کمتر کیوں ہو جاتا ہے اور زیادہ ہو تو برتر کیوں۔

اِس کشمکش میں فیاض کے پاؤں وہیں جم کر رہ گئے۔ اُس نے گردن گھما کر حکیم رام لعل کے مطب کو دیکھا تو اُس کا دل بھر آیا۔ کتنی بڑی اُمید لے کر وہ یہاں آیا تھا اور کیا سمجھا تھا حکیم صاحب کو۔ خالص اور کھرا انسان جس کے ہاتھ میں شفا تھی۔ شفا تو واقعی اُس کے ہاتھ میں تھی مگر وہ خالص اور کھرا انسان کسی طرف سے بھی نہ تھا۔ فیاض کا دل چاہا کہ چیخ چیخ کر لوگوں کو بتائے کہ حکیم جھوٹا انسان ہے اور جھوٹ بولنے والوں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ لیکن کوشش کے باوجود اُس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی لیکن یہ بات اور کہ آنکھوں کے گوشے ضرور بھیگ گئے۔

فیاض نے چلنے کے لیے قدم اُٹھانا چاہے تو پاؤں بوجھ بن گئے۔ اُس نے سوچا کہ پاؤں گھسیٹ کر چلے لیکن کسی نے اُس کی چال کو مُندر لیا تھا۔ اُسے ایکدم تُلسی کا خیال آیا۔ اُسے دیکھنے کے بعد بھی تو اُس کی یہی حالت ہوئی تھی۔ وہ جہاں تھا وہیں کا وہیں حیران ہو کر جامد ہو گیا تھا۔ اُسے لگا کہ وہ تُلسی کے گھر کے باہر کھڑا ہے اور وہ اُسے دیکھ کر اندر کی جانب دوڑ رہی ہے۔ آہستہ خرامی سے کبھی اُچھلتی کبھی مچلتی مُڑ مُڑ کر پیچھے کی جانب دیکھتی، اُس کے دِل پر اپنے پیروں کے نقش کر یدتی جا رہی تھی۔

کیا یہ تُلسی ہے جس نے مجھے اَن دیکھے کمند میں لپیٹا ہوا ہے!

میں کہیں تُلسی کے سبب تو اُس کے باپ کے مطب تک نہیں پہنچا!

کیا تُلسی ہی میری پہچان ہے!...... مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی لڑکی میری پہچان بن جائے........ میں کون اور وہ کون...... میری اُس کی کون سی سانجھ.....

"اگر تیری میری کوئی سانجھ نہیں تو میرے بھیتر کون ہے، تیرے بھیتر کون ہے۔"

تُلسی ایک ہیولے کی صورت سوال بن کر اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ فیاض اُس کا کھلا کھلا جُوبَن دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ ڈیرے کا پورا بازار اُسے دیکھ رہا ہے، ہنس رہا ہے، اشارے کر رہا ہے۔ وادھو کے قہقہے سَب سے اونچے۔ بار بار دھچر کو اُس کی جانب متوجہ کر رہا ہے کہ دیکھ اِسے، یہ مجھ پر ہنسا کرتا تھا کہ عورت کے ہاتھوں ٹھکائی شدہ ہوں، اب اِسے دیکھو حکیم کی لڑکی کے جوبَن کے ہاتھوں کیسے مُندری ہوئی ساکت بانسری بن کر رہ گیا ہے۔

فیاض نے پورے بدن کا زور لگا کر اپنے پاؤں گھسیٹنے کی کوشش کی مگر لمحہ بھر میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اب تو اُس کی حالت پر تُلسی بھی ہنس رہی تھی۔ ہر طرف قہقہے ہی قہقہے، بلند قہقہے، لوگوں کے قہقہے، وادھو اور دھچر کے قہقہے، تُلسی کے قہقہے۔ پسینہ پورے جسم سے بہتا ہوا ٹخنوں تک پہنچا تو فیاض کو لگا کہ اُس کے پاؤں پھر سے ہلکے پُھلکے ہو گئے ہیں۔ تُلسی کا جادو تحلیل ہو گیا تھا۔ وہ ایک دو قدم آگے پیچھے چلا تو محسوس ہوا کہ وہ چل سکتا ہے۔ اِس احساس کے ساتھ ہی قہقہوں کی آوازیں

بھی گونگی ہو گئیں۔ بازار کے سبھی لوگ اپنی اپنی جگہ پر پھر سے موجود اور وادھو ویسے کا ویسے اُس کی جانب پشت کیئے دھپڑ سے گپ شپ چلائے بیٹھا تھا۔ بازار کا سب کچھ جوں کا توں دکھائی دے رہا تھا سوائے تُلسی کے۔ بس کچھ خوشبو سی تھی اُس کی فیاض کے گرد رقصاں۔ وہی خوشبو جو فیاض نے اُس روز حکیم رام لعل کے گھر کا دروازہ کھٹکانے کے بعد محسوس کی تھی۔

اُس نے ایک بار پھر حکیم صاحب کے مطب کی جانب دیکھا۔ یوں لگا کہ یہ خوشبو کہیں مطب کے اندر سے آرہی ہے۔ کیا اُس کی پہچان یہی خوشبو ہے۔ اُس کی سمجھ بوجھ کی ساری کھڑکیاں دَڑک کرتی ہوئی بند ہونے لگیں۔ یہ خوشبو کیا ہے۔ تُلسی خوشبو ہے یا خوشبو تُلسی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ فیاض اِس خوشبو کے پیچھے پیچھے، اِسی کے تعاقب میں پھر سے مطب میں داخل ہو گیا۔ حکیم رام لعل کے سامنے مریضوں کی لمبی قطار اپنی باری کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے حکیم صاحب کے برابر پڑی ہوئی گدی پر جا کر بیٹھ گیا۔ حکیم رام لعل نے فیاض کی جانب دیکھا اور ہلکا سا مسکرا دیا۔ فیاض کو یوں لگا جیسے حکیم رام لعل اُس سے پوچھ رہا ہو ''اب بتا اُوئے کا کے...... علاج مریض کی نیت کا کیا جاتا ہے یا بیماری کا۔ اور جسے تم بے ایمانی کہتے ہو، وہ کیا ہے، بیماری ہے ناں۔ اور پھر اِس بیماری کا علاج کون کرے گا، ہم ہی کریں گے ناں؟

فیاض نے گردن جھکا لی اور دل ہی دل میں اپنے آپ سے پوچھنے لگا'' مانتا ہوں کہ بے ایمانی ایک بیماری ہے مگر یہ کیسے مان لوں کہ اِس کا علاج اُس سے بھی بڑی بے ایمانی سے کرنا چاہئے۔''

(11)

اُس روز کے واقعے کے بعد فیاض مطب میں تو شام سے عشاء تک باقاعدگی کے ساتھ بیٹھنے لگ گیا مگر پوری کوشش کے باوجود جوان لڑکیوں کے ہجوم کو کم نہ کر سکا جو اُسے نبض دکھانے کی خواہش میں عصر کے بعد ہی سے بھنبھنانے لگ جاتی تھیں۔ فیاض کچھ نہ سمجھ پا رہا تھا کہ اُس کی منزل کونسی ہے اور اُس کی پہچان کیا ہے۔ کیا جنسی حبس کی ماری ہوئی اِن لڑکیوں کی کلائی پکڑ کر اُن کی طلب کو آسودگی دیتے رہنا ہی اُس کی پہچان ٹھہرے گی؟ مگر مسلسل سوچتے رہنے پر بھی اُسے کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ ابھی تک یہ سب کچھ کسی گرداب میں تھا۔

حکیم رام لعل کے مطب پر پھر سے بیٹھ رہنے کی اُس کے ہاں دو دلیلیں تھیں۔ پہلی یہ کہ کوئی ہُنر تو ہو جو اُس کے دال پُھلکے کی ضمانت ہو سکے اور دوسری یہ کہ اِس کام میں رہتے ہوئے لوگوں کے ساتھ جُڑ بیٹھنے اور اُن کے دُکھ بانٹنے کا جو موقع مل رہا تھا وہ کہیں اور نہیں تھا۔ مکریل لڑکیوں کا علاج اُس نے یہ نکالا کہ انہیں سخت سُست کہنے کی بجائے اُن کی بات تو سُن لیتا مگر دوا کی بجائے صرف پرہیز بتا تا تا کہ بے ایمانی بھی نہ ہو اور مریضہ کے مرض کا پردہ بھی رہ جائے۔ جب کبھی کوئی گُھنے سینک لڑکی مقابل ہو کر گلے پڑ جاتی تو اِس انتہائی مجبوری کی کیفیت سے گلو

خلاصی کے لیے ایک دو پڑیاں دی ہی دیتا۔ فیاض کی اِس حکمت عملی کے سبب تندور سے تازہ تازہ اُتری چپاتی کی طرح بڑے گھروں کی تپّی تپّی لڑکیاں بھی خوش اور حکیم صاحب بھی راضی ۔ بس مسئلہ تھا تو فیاض کے لیے جو کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر وہ ہے کیا؟ کوئی جسم فروش گشتوڑا کہ جس کے لیے ایک دوکان کی گدی پر بیٹھنے کی خاطر اپنی مرادنگی کو بیچنا کچھ معیوب نہ تھا۔

اُس دن کچھ عجیب ہوا۔ صبح سویرے نہیں بلکہ دن چڑھے تک بھی ڈیرہ نواب صاحب کے بازار کی آدھی سے زیادہ دوکانیں بند تھیں۔ وادھو نہ دھچر اور نہ ہی خمیسا تماخوں والا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کوئی دیو پھر گیا ہو بازار میں۔ کسی نے بتایا کہ اِس بار روہی میں چنن پیر کے میلے کا پانچواں جمعہ ہے اور سبھی لوگ جمعرات کی صبح ہوتے ہی ٹولیوں کی صورت میں روہی کی جانب روانہ ہو چکے ہیں اِس لیے کہ میلہ کا عروج پانچویں جمعہ کو ہوا کرتا ہے۔ فیاض کو یاد ہی نہ رہا تھا کہ خود اُس کا اَبا اور کئی چچازاد، خالہ زاد آج صبح سویرے چنن پیر روانہ ہو گئے تھے اور وہ اُن کے مجبور کرنے پر بھی اُن کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ ''کیا ہو گیا ہے اُس کے حافظے کو۔'' فیاض سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یہ اُونٹوں کی قطاریں، رنگلے کجاوے اور کجاوں میں بیٹھی بجی سنوری جوان عورتیں، کہیں کہیں کجاووں سے جھانکتے اُن کے بچے اور اونٹ کی باگ پکڑ کر آگے آگے بھاگتے جتوال۔ میلہ دیکھنے کے یہ شوقین دور دور سے اونٹوں کی طویل قطاریں بنا کر چلتے اور پھر ایک آدھ منزل فاصلہ طے کرنے کے بعد جہاں کوئی چٹیل میدان دکھائی دیتا، وہیں اونٹ بٹھا کر روٹی مانی کے بندوبست میں جُت جاتے۔

چنن پیر کے میلے کی رُت آتے ہی ہر منگل کی شام کو احمد پور کی کلو والی چُنگی کے نزدیک عبدالعزیز خان کے پُرانے باغ کے وسیع میدان میں میلے والوں کے قافلے منزل کا پڑاؤ کرتے۔ یوں ساتویں جمعے تک ہر بُدھ کو سویرے سویرے یہ عقیدت مند کیکی میکی اور نر ان شران کرنے کے بعد چنن پیر کی اگلی منزل کی جانب روانہ ہو جاتے جو عام طور پر ڈیرہ نواب صاحب کی آبادی سے گزر کر دوسری طرف ہوتی۔

ریاست بہاول پور کے قلب احمد پور کے اطراف میں بہار کی آمد کے ساتھ ہی میلوں

ٹھیلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا جن میں سے تین میلے بہت ہی خاص ہوا کرتے تھے۔ پہلے پہل فروری میں چنن پیر کے سات جمعے والے میلے کا پہلا جمعہ شروع ہو جاتا۔ مگر رَش صرف چوتھے اور پانچویں جمعے کو ہوتا۔ ہر کوئی یہی کہتا کہ اس بار چوتھا جمعہ بہت رَش لے رہا ہے تو ہر کوئی چوتھے جمعے کا میل بنا لیتا اور یوں چوتھا جمعہ اپنے آپ ہی بھر جاتا۔ ابھی روہی میں چنن پیر کے میلے کا چوتھا جمعہ ہوتا تو اُچ شریف کے میلے کا پہلا جمعہ شروع ہو جاتا جسے بوہاری (جھاڑو) والا جمعہ کہا جاتا۔ بوہاری کے بعد دوسرا جمعہ چھڑکاؤ والا اور پھر چَل سو چَل پورے سات جمعے۔ یہاں بھی چوتھے اور پانچویں جمعے کا میلہ بہت رَش لیتا۔ اُچ کے میلے کے آخر تک اپریل کے دوسرے ہفتے میں احمد پور کا وِساخی (بیساکھی) والا تین دن کا میلہ عظمت سلطان سئیں کے مزار کے ملحقہ میدان میں شروع ہو جاتا۔ مگر حیرت تو اِس بات کی تھی کہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی فیاض لوگوں سے پوچھ رہا تھا کہ آج ڈیرے کا بازار بند کیوں ہے۔

اُس روز حکیم رام لعل بھی سورج غروب ہونے سے کہیں پہلے سہ پہر کو ہی گھر چلا گیا اور ہَٹی اب رام کی بجائے فیاض کے حوالے تھی۔ فیاض گدی پر کیا بیٹھا، مریض لڑکیاں شہد کی مکھیوں کی مانند دکان میں یوں بھنبھنانے لگیں کہ جیسے چھتا یہیں کہیں رکھا ہو۔ لمبی قطار کو نمٹاتے نمٹاتے عشاء ہونے کو آ گئی مگر مطب میں ابھی تک دس بارہ عورتیں ٹوپی والے بُرقعے پہنے آنکھوں کے سامنے آئی ہوئی کروشیئے والی جالی میں سے نظریں گھما رہی تھیں۔ فیاض باریک جالی والے پردے میں سے دیکھ رہا تھا کہ جب بھی سفید برقعے والی دو عورتوں کی باری آتی ہیں وہ کھسک کر پھر آخر میں جا بیٹھتی ہیں۔ وہ حیران ہوا کہ پہلے باری لینے کی بجائے وہ پھر آخر میں کیوں جا بیٹھتی ہیں۔ اِسی اُدھیڑ بن میں پورا مطب خالی ہو گیا مگر وہ دونوں اپنی جگہ جیسے جم کے بیٹھی تھیں ویسی بیٹھی رہیں۔ عشاء کی اذان ہونے کو آئی تو فیاض نے خود ہی پوچھ لیا کہ مائی بی بی ہاتھ دکھانا ہے تو دکھا لیں نہیں تو مطب بند کرنے کا وقت ہو چکا ہے۔

فیاض کے پوچھنے پر ایک عورت نے دوسری کو گھٹنے کے زور سے اِس طرح آگے کو

دھکیلا کہ وہ کھسک کر فیاض کے سامنے آ گئی۔ اب اُن دونوں کے درمیان صرف جالی والا باریک پردہ تھا۔ اُس نے برقعے سے ہاتھ باہر نکالا تو لگا کہ وہ کسی جوان لڑکی کا بھرا بھرا سا گداز کلائی والا ہاتھ ہے۔ لڑکی نے پردے میں سے کلائی آگے بڑھائی تو فیاض نے اُس کی طرف دیکھے بنا اپنی اُنگلیاں اِس طرح نبض پر رکھیں کہ اُس کا پوری ہاتھ کلائی کے گرد گھوم گیا۔ اب معلوم نہیں منٹ سیکنڈ میں کیا ہوا، فیاض نے ایکدم اُس کی کلائی سے اپنی اُنگلیاں اس طرح علیحدہ کیں کہ جیسے دہکا ہوا نگارہ اُس کے ہاتھ میں آ گیا ہو۔ اِس سے پہلے کہ سامنے بیٹھی عورت بھی کچھ سمجھ پاتی ، اُس کا دایاں ہاتھ فیاض کے ہاتھ سے اچانک چُھٹ جانے کے سبب دھب سے اُس کی گود میں آن گرا۔ اِس کیفیت میں دونوں اپنی اپنی جگہ حیران اور ششدر۔

فیاض نے اب تک معلوم نہیں کتنی عورتوں کے لِنک دیکھ رکھے تھے پر اِس طرح کی دہکتی ہوئی کلائی شاید ہی اُس کے ہاتھ میں آئی ہو کہ جس کی نبض بُخار کی کوئی ظاہری علامت کے بنا بھی یوں ٹپ ٹپ کر رہی تھی جیسے وہ لڑکی کئی کوس کے سفر سے ابھی ابھی دوڑتی ہوئی آ کر ہانپ رہی ہو۔ فیاض کو اِس لڑکی کا لِنک جانا پہچانا سا محسوس ہوا مگر یاد نہیں آ رہا تھا کہ کس جگہ اور کہاں اُس کے ہاتھ نے اِس کے بدن کو چھوا تھا۔ شاید یہیں مطب میں!....... مگر نہیں.... مطب میں اِس طرح کی دہکتی آگ لڑکی کبھی نہیں آئی.... اگر کوئی نہیں آئی تو پھر یہ کون ہے؟ نہ چاہتے ہوئے بھی فیاض کی نگاہ بار بار لڑکی کے چہرے کی جانب اُٹھ رہی تھی۔

اتنی دیر میں اُس لڑکی نے برقعہ اوپر کو اُٹھایا تو سب کچھ روشن ہو گیا۔ یہ تو مہراں تھی۔ مگر اُس روز کے غیظ اور غضبناکی سے بالکل مختلف۔ سجی سنوری اور روشن روشن۔ فیاض اپنے آپ کو چوتیا لگنے لگا تھا۔ لیکن یہ نبض تو کچھ اور کہانی سنا رہی تھی۔ فیاض نے بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ مگر وہاں کون اُسے دیکھنے والا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ آج تو باقی کے ملازم بھی چنن پیر کے میلے کی چُھٹی پر ہیں اور بازار بھی سارا بند ہے۔ پھر بھی اُس نے اُٹھ کر چھوٹی کھڑکی میں سے باہر کو جھانکا مگر دور نزدیک نہ کوئی بندہ اور نہ بندے کی ذات۔ فیاض پھر سے گدی پر بیٹھ تو

گیا مگر گھبراہٹ ابھی تک طاری تھی۔ فیاض کی حالت دیکھ کر مہراں مسکرادی اور دوسری عورت نے بھی برقع چہرے سے اُٹھادیا۔ یہ مہراں کی ساس تھی۔

ساس کے آگے کھسکانے پر مہراں نے ایک بار پھر اپنی دائیں کلائی فیاض کے ہاتھ میں دے دی۔ اُس کے لِنگ ویسے ہی بھڑکتی دہکتی آگ اور نبض بدستور سرپٹ دوڑتی ہوئی۔ فیاض نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر زبان سوکھ کر لکڑی اور ہونٹوں پر چھلکے ہی چھلکے۔ وہ دونوں عورتیں فیاض کے چہرے کی طرف جواب طلب نگاہوں سے تکے جارہی تھیں کہ چھوٹا حکیم ہاتھ دیکھنے کے بعد کچھ تو بتائے گا۔ لیکن اُس کا منہ کون کھولے اور کیسے کھولے۔

''بیٹا سب ٹھیک تو ہے میری بہو کا''..... اَدھ کھڑ عورت بھی آگے کھسک کر مہراں سے جُڑ کر بیٹھ گئی۔

''کچھ نہیں سب ٹھیک ہے...... بس شادی کر دیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دوادارو کی بھی ضرورت نہیں''.......... فیاض کے یوں سٹپٹانے پر مہراں کی ساس تو ہنس پڑی مگر مہراں کا مسکرانا جاتا رہا۔ وہ کچھ پریشان ہو کر آنکھیں کھولے فیاض کو دیکھے جارہی تھی۔

''تم تو بالکل ہی بدھو ہو''۔ مہراں کی ساس نے سر پکڑ لیا۔ ''کیسے حکیم بنے بیٹھے ہو، میری بہو اچھی بھلی شادی شدہ ہے...... پھر سے دیکھو، یہ مہراں ہے، وادھو کے گھر والی......''

''مگر اِس کی نبض تو کنواری لڑکیوں والی ہے۔'' بات روکنے کے باوجود فیاض کے منہ سے کیا نکلی، اَدھ کھڑ عورت نے نخرے والے بین شروع کر دیے۔ بین کیا تھے کہانی تھی جس میں مہراں کے حاملہ نہ ہونے اور اِس سبب اُس کی نسل ختم ہو جانے کے اندیشے واضح تھے۔ بین کرتے ہوئے مہراں کی ساس یہ بھی ظاہر کر گئی کہ اُس کے حاملہ نہ ہونے میں قصور اُس کی بہو کا نہ تھا۔ ''یہ بے چاری تو اُترے ہوئے دریا سے نکلی ہوئی اراضی کی طرح زور میں ہے، اگر بیج ہی کُرٹ ہو جائے زمین کیا کرے۔''

''اماں! میں تو یہی کہوں گا کہ وادھو کسی طور صبح حکیم صاحب سے مل لے، رب بہتری

کرے گا۔'' فیاض کی گھبراہٹ میں کچھ کچھ ٹھہراؤ آنے لگا تھا۔

''تم تو زرے بے وقوف ہو...... اگر وادھو حکیم کو دکھانے پر راضی ہو جاتا تو میں لڑکی کو ساتھ لے کر اس وقت تمہارے پاس کیا کرنے آتی؟ تم نے خود ہی تو دیکھا ہوا ہے کہ مہراں کو بیٹھے بیٹھے کیسا دورہ پڑتا ہے۔ اُس روز اگر تم نہ ہوتے تو میرا گھر برباد ہو چکا تھا۔ مہراں خاوند کو قتل کر کے خود پھانسی چڑھ جاتی۔ بیٹا! میں نے یہ چونڈا دھوپ میں سفید نہیں کیا۔ جانتی ہوں جوان لڑکی کو کیا چاہئے ہوتا ہے۔ مگر کیا کروں، آگا اُٹھاؤں تو خود ننگی، پیچھا اُٹھاؤں بھی تو خود...... '' وادھو کی ماں کی آنکھیں پھر سے آنسو بہانے لگیں۔

کہانی میں غیر متوقع موڑ آتے آتے فیاض جذباتی طور پر سنبھل چکا تھا۔ اُس نے مہراں کی جانب دیکھا۔ خلافِ توقع وہ بالکل لاتعلق لگ رہی تھی جیسے کچھ ہے تو ٹھیک اور اگر نہیں تو پھر بھی ٹھیک۔ لیکن اِس دوران کسی کسی وقت وہ فیاض کو یوں دیکھتی تھی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو، کچھ مانگنا چاہتی ہو، کچھ وصولنا چاہتی ہو۔

فیاض کو سوچوں میں گھرا دیکھ کر وادھو کی ماں مہراں کو پیچھے ہٹا کر خود آگے کھسک آئی۔

''بیٹا میں آج تمہارے پاس صرف اپنی بہو کے علاج کے لیے نہیں آئی، میں تمہارے پاس اپنی جد بچانے کے واسطے آئی ہوئی ہوں۔ وادھو میرا کلہا کلہا پُتر ہے، اگر اُس کی اولاد نہ ہوئی اور وہ بے اولاد ہی رخصت ہو گیا تو پھر میری نسل تو ختم ہو گئی ناں۔ کسی نے ہماری قبروں پر پُھل پتری ڈالنے بھی نہیں آنا۔ میرا بیٹا بھی تو ہے، حکیم بھی تو اور میرے گھر کا وارث بھی تو۔ تم میرا بھلا کر دو، اللہ تمہارا بَھلا کرے گا۔''

''ٹھیک ہے اَماں...... تو کل سویرے وادھو کو لے آ، حکیم صاحب کو تمہاری سفارش میں کر دوں گا۔ باقی جو رَب کو منظور۔'' فیاض گدی سے اُٹھنے لگا کہ مطب بند کرنے کا بندوبست کرے مگر وادھو کی ماں نے ایکدم گڑبڑا کر اُسے بانہوں سے پکڑا اور پھر سے بٹھا لیا۔ فیاض حیران ہو کر دھب سے گدی پر آن گرا۔

''میری پوری بات تو تم نے سنی نہیں۔ وادھو آج چنن پیر کے میلے پر گیا ہوا ہے۔ تم مہربانی کر دو۔ میں چاہتی ہوں کہ ایک بار تڈی تبدیل ہو جائے تا کہ سکھی ہو کر مر سکوں۔ کوئی تو ہو جو میری قبر پر قل کلمہ پڑھنے آئے''...... وادھو کی ماں نے جلدی جلدی بات ختم کر کے لمبی سانس لی اور پھر سے جُڑ کر بیٹھ گئی۔

''تڈی بدلنا! یہ کیا ہوتا ہے''...... فیاض نے حیرت کے ساتھ ساتھ زچ ہو کر وادھو کی ماں سے پوچھا۔

''پُتر...... تڈی بدلنا''...... وادھو کی ماں نے ایک ایک لفظ چبا کر بولا تا کہ فیاض سمجھ جائے مگر فیاض کی آنکھوں میں ویسی کی ویسی اجنبیت تھی۔ ''میں نے تو آج تک نہیں سنا تڈی بدلنا''۔ فیاض کی نگاہ اُٹھی تو مہراں کے چہرے پر جا ٹھہری۔ لاتعلق دکھائی دینے والی مہراں کی آنکھوں سے آنسو اپنے آپ بہہ کر گالوں کو تر کرتے ہوئے نیچے گرے جا رہے تھے۔ لاتعلقی قدرے کم ہوئی تو اُس کی جگہ ایک عجیب سے نا آشنا شکوے نے لے لی۔

''پُتر تجھے کیسے سمجھاؤں تڈی بدلنا''..... اَدھیڑ عمر عورت سَر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ''بہت پُرانی رِیت ہے، صدیوں پُرانی۔ ہے تو زہر کا گھونٹ مگر کیا کروں وادھو کی نسل کو بھی تو آگے چلانا ہے۔ بیٹا یہ کوئی انوکھی بات نہیں جو میں طے کر کے بیٹھی ہوں اپنی بہو کا گھر بچانے کے واسطے۔ وادھو کو اچھا بھلا پتہ ہے جو کمی قصور اُسی میں ہے پھر بھی اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دے رہا۔ مردوں کا وسیب جو ہوا، ماریں بھی سہی اور تڑپنے بھی نہ دیں۔ اُلٹا مہراں بے چاری کو طلاق دینے پر تُلا ہوا ہے۔ اب تو ہی بتا میں مجبور ہو کر تم سے اپنے خاندان کے وارث کی بھیک مانگنے نہ آؤں تو کس در پر جاؤں۔'' وادھو کی ماں کی آنکھوں میں سے آنسو ایک بار پھر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

فیاض کچھ کچھ سمجھ گیا کہ اُس سے کس قسم کے دارو کا تقاضا کیا جا رہا ہے۔ ''تڈی چونکہ بستر کے نیچے بچھائی جانے والی چٹائی کو کہتے ہیں اِس لیے وادھو کی اماں اپنے خاندان کا وارث پیدا کرنے کے لیے میرے نام کی چٹائی اپنے ناکارہ بیٹے کی چٹائی سے بدلنا چاہتی ہے۔ کتنی غلیظ

حرکت ہے۔ کتنی بے غیرتی ہے۔'' فیاض کا دماغ اب تیز تیز سوچنے لگ گیا تھا۔

''اماں نہ تو میں یہ بے غیرتی کر سکتا ہوں اور نہ تمہاری بہو اس زبردستی کے تعلق کو قبول کر پائے گی۔ میں کیسے مان لوں کہ میرا بچہ تمہارے بیٹے کے گھر میں ایک حرامی بچے کے طور پر پلے بڑھے اور وادھو کو علم ہی نہ ہو۔ فرض کرو اُسے علم نہیں بھی ہوتا تو پھر بھی یہ حرام کاری میں نہیں کر سکتا، خاص طور پر ایسی آدھی ادھوری اولاد کے لیے جو عمر بھر اپنی شناخت کی تلاش میں بھٹکتی پھرے۔''

فیاض کا یہ خطبہ ابھی جاری تھا کہ مہراں بھڑکتی آگ کا شعلہ بن کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ فیاض کو اُس کا چہرہ اُسی طرح لگا کہ جیسے وادھو کا گلا دباتے وقت تھا۔ دکھائی یوں دیتا تھا کہ اُس کا سارا بدن اِس آگ میں دراڑ دراڑ ہو جائے گا۔ فیاض کو جن آنکھوں سے وہ دیکھ رہی تھی اُن میں قہر، غضب، نفرت اور ناراضگی کے سبھی رَنگ یکجان ہو کر پھنکار رہے تھے۔ اِسی کیفیت میں فیاض کو مسلسل گھورتے ہوئے اُس نے ایک ہاتھ سے ساس کو بازو سے پکڑا اور اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے اُٹھا کھڑا کیا۔ اُس کی پوری کوشش تھی کہ جتنا جلدی ممکن ہو وہ اپنی ساس کو مطب کے دروازے سے باہر گھسیٹ لے جائے۔ وادھو کی ماں باہر نکلنے سے قبل اِس حالت میں بھی لمحہ بھر کے لیے دروازے میں رُکی اور فیاض کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگی۔ ''حکیم صاحب تو رِیت رَسم کو بے شک دفع کرتا مگر دو مجبور عورتوں کے ساتھ یہ سلوک تمہیں زیب نہیں دیتا تھا۔ تم مرد لوگ پہچان اور شناخت کی بات کرتے ہو ناں تو پھر ایک بات میری بھی یاد رکھنا، پہچان اور شناخت زمین سے ہوتی ہے، بیج سے نہیں۔''

(12)

کچھ روز تو سب خیریت رہی مگر چند دنوں کے بعد حکیم صاحب کو اپنے کوچوان کی حرکتوں پر غیر محسوس سا شک گزرا۔ اگر حالات غیر معمولی نہ ہوتے تو شاید اِن باتوں کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دیتا مگر اِس گھڑی میں معمول سے ہٹ کر کسی سُن گُن کو خاطر میں نہ لانا عقل مندی کے تقاضوں کے منافی تھا۔ ہوا یوں کہ ایک دن حکیم رام لعل صبح گھر سے نکلتے ہوئے معمول سے کچھ دیر پہلے نکل آیا۔ مگر کیا دیکھتا ہے کہ احمد پور کا ایک چھٹا ہوا بدمعاش پیری اُس کے کوچوان کے کان میں کھسر پھسر کئے جا رہا تھا۔ جیسے ہی پیری بدمعاش کی نگاہ حکیم پر پڑی وہ منہ پھیر کر مخالف سمت میں چل پڑا مگر جاتے ہوئے اُس نے جس طرح کانی آنکھ سے حکیم صاحب کو دیکھا، وہ دیکھنا کچھ خیری نہیں لگ رہا تھا۔ حکیم رام لعل نے کوچوان سے حال احوال جاننا چاہا مگر اُس نے پکڑائی ہی نہ دی۔ اِس سبب حکیم صاحب کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی۔

جون 1947ء کے بعد تو ہندوستان کے سیاسی واقعات کی رفتار کچھ اتنی تیز ہو گئی کہ صبح شام کا اعتبار نہ رہا۔ عام لوگوں کے لیے خبر کا بھی کوئی خاص ذریعہ نہ تھا۔ تبھی ہر طرف افواہوں کے جھکڑ جھولے چلتے رہتے۔ ایک آدھ بندہ جس کی پہنچ اخبارات یا آل انڈیا ریڈیو تک ہوتی اُس نے

بھی لوگوں تک خبر پہنچانی تو ساختہ ہی پہنچانی جس کے سبب ریاستی خلقت خاص طور پر اقلیتی برادری میں پریشانی اور بھی بڑھ جاتی۔ محسوس یوں ہوتا تھا جیسے پاکستان تو صبح بنا یا شام تک مگر اس بات کی پکی خبر کہیں سے نہ آتی کہ ریاست بہاول پور کا نواب کیا فیصلہ کرے گا۔ کیونکہ اُسی کے فیصلے پر ہی لاکھوں ہندوؤں اور سکھوں کی جان اور جائیداد کا فیصلہ ہونا تھا۔

اِس پریشانی میں بھی سوڈھی حکیم رام لعل کے گھر پھیرا لگانے کا کوئی ناں کوئی موقع ضرور ڈھونڈ لیتا اور پھر غڑپ سے اندر کمرے میں۔ کھایا پیا، ٹھنگو رلگایا، خاطر داری کرائی اور پھر یہ جاوہ جا۔ اُبلتی کھولتی تُلسی روزانہ دعا مانگتی کہ آج تو اُس کا ابّا جلدی گھر آجائے اور لچھن دیکھے اپنے اعتباری ہم زلف اور وفادار بیوی کے۔ اور پھر ایک دن حکیم صاحب واقعی عین اُسی وقت گھر کی کُنڈی کھڑکا بیٹھا کہ جب وہ دونوں کمرے میں بیٹھے چھلیں کر رہے تھے۔ تُلسی نے تو اِس لیے دوڑ کر کُنڈی کھولی کہ کہیں فیاض نہ ہو مگر ابّا کو دیکھ کر بھی اُس کے بھیتر کسی چھپی ہوئی خواہش کو سکون سا ملا یہ سوچ کر کہ ابھی کچھ بڑا ہوا ٗسو ہوا۔ حکیم رام لعل اپنے کمرے کی جانب جانے لگا تو تُلسی نے خود ہی بتایا کہ اُس کی ماں اور چاچا سوڈھی اِس طرف ہیں اِس کمرے میں۔ لیکن اِس کے باوجود حکیم رام لعل اپنے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا یہ کہتے ہوئے کہ اُن دونوں کو اِدھر بھیج دو۔ باپ کی بات سُن کر تُلسی جہاں تھی وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی بُت بن کر۔

''یہ کیسی منزل ہوتی ہے شادی شدہ زندگی میں کہ ایک دوسرے کے لیے مرنے مارنے والے، ایک دوسرے سے اُکتائے ہوئے، ایک دوسرے سے جان چُھڑاتے پھر رہے ہوتے ہیں۔ نئی نئی شادی کے بعد ایک دوسرے کی پرچھائیں پر شک کرنے والے، شک تو کیا پک پر بھی توجہ نہیں کرتے ایسے کہ جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں، کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ دونوں کے ہاں جسمانی تقاضوں کو پوار کرنے کی خواہش نہ رہتی ہوگی، خواہش ہے تو چاچا سوڈھی آس پاس سب کو چھوڑ کر ہمارے گھر گھسا رہتا ہے۔ خواہش ہوتی ہوگی تبھی تو میرے ابّا کو پیشانی پر بل ڈال کر چڑ چڑے انداز میں دیکھنے والی میری اماں ایک غیر شخص کو محض دیکھتے ہی کھلکھلا اُٹھتی ہے، چہکنے لگتی

ہے۔"

ٹلسی کا ذہن شاید ابھی اور چکراتا بھنوالیاں کھاتا اگر اُس کی ماں اور چاچا سوڈھی بے شرمی سے اُس کے پاس آ کر یہ نہ پوچھتے کہ کون آیا تھا۔ حکیم صاحب کے بے گاہ اور بے وقت آنے پر دونوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا اور آگے پیچھے حکیم کے کمرے میں چلے گئے۔ ٹلسی ابھی تک وہیں کی وہیں دالان میں کھڑی ہوئی تھی۔ اُسے اپنی سوچ کے کسی زاویے کا کہیں سے بھی جواب نہیں مل رہا تھا۔ ٹلسی کو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا تو صرف اپنے باپ پر۔ "کیا اُس کا کام صرف ایسی گائے پالنا رہ گیا ہے جو دودھ کہیں اور جا کے دیتی ہے۔"

دوسری طرف کمرے میں سوڈھی نے حکیم رام لعل کے ساتھ یہی ناٹک کیا کہ اِن بدلتے ہوئے حالات میں جتنا جلدی ہو سکے ٹُلسی کی رُخصتی کر دی جائے کیونکہ دونوں گھروں کی بہتری اِسی میں ہے۔ آنے والے دنوں کی کیا خبر، نجانے کیا ہوتا ہے۔ حکیم صاحب نے بیوی کی طرف دیکھا۔ اُسے کیا انکار ہو سکتا تھا۔ لہٰذا یہی طے ہوا کہ باقی قریبی رشتے داروں کے صلاح مشورے سے دس بارہ دنوں کے اندر ٹُلسی کی ڈولی مُکلا دی جائے۔

سوڈھی کمرے سے نکلا تو رادھی اُس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئی اور تڑپ کر بولی "کیا ضرورت تھی ٹُلسی کی رُخصتی کی بات کرنے کی"۔

"ضرورت تھی ناں"...... سوڈھی اُسے آنکھ مارتے ہوئے بولا۔ "کیا کہتا کہ یہاں بیٹھا کیا کر رہا تھا۔"

"ہونہہ..... جیسے اُسے کچھ پتا نہیں"...... رادھی منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

"کیا کہا!"...... سوڈھی جاتے جاتے رُک گیا

"کچھ نہیں"..... رادھی نے اُسے ویسے ہی جل کر جواب دیا کہ جیسے اپنے شوہر کو دیا کرتی تھی۔ اتنی دیر میں اُن کی نگاہ ٹُلسی پر پڑی جو دالان کی اُسی نکڑ میں اُسی جگہ بُت بنی کھڑی تھی کہ جہاں اُن دونوں کے حکیم کے کمرے میں جانے سے پہلے کھڑی تھی۔ اپنے مُکلاوے کی بات

سُن کراُس کے اندر کی ساری بے قراری اُس کے چہرے پر منجمد ہو چکی تھی۔ اِس سے پہلے کہ رادھی کچھ کہتی سوڈھی نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔"کا کی..... اُداسی کس لیے، تیاری کر تیاری مُکلاوے کی، کیونکہ بارھویں دن تمہاری ڈولی میرے گھر۔"

آج تو یوں لگ رہا تھا کہ سوڈھی کے مَن کا سارا کھوٹ، ندیدگی بن کر اُس کی آنکھوں میں اور رال بن کر منہ میں آ گیا تھا۔ تُلسی تو خیر چُپ رہی مگر رادھی کے لیے سوڈھی کی نیت کے سارے روڑے جیتے جاگتے بچھو بن کر آنکھوں کے سامنے چلنے پھرنے لگے تھے۔ اِس کے باوجود اُسے لگتا نہیں تھا کہ سوڈھی بے وفائی کرے گا۔

"کم ازکم یہ تو دیکھے گا کہ اُس کے واسطے میں نے اپنے شوہر کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا ہوا ہے۔ مگر مردوں کا کیا اعتبار.... ایک لحظے میں ساری راند کو ٹھوکر مار کر چلتے بنتے ہیں۔ اور اگر سوڈھی نے تُلسی کی رخصتی کے بعد اُسے ٹھوکروں میں رکھ لیا تو ماں کی کرنی بیٹی کو بھرنی پڑ جائے گی۔" رادھی سمجھنے کے باوجود کچھ نہ سمجھنا چاہ رہی تھی۔ بس خوابوں میں رہنا چاہتی تھی۔

دوسری طرف حکیم رام لعل بھی پیری بدمعاش اور اپنے کوچوان کے میل ملاپ کو دیکھتے ہوئے آج طے کر کے آیا تھا کہ نواب صاحب چاہے جو فیصلہ کرے اُسے خاندان سمیت سنبھل کر رہنا ہوگا۔ سنبھلنا کیا یہی کہ سبھی قیمتی اسباب تھوڑا زیادہ بیچ باچ کر رقم اپنے ہاتھ میں رکھے، مطب میں بیٹھنے کے اوقات کم کر لے، بس دو چار گھنٹے ہی کافی اور گھر آتے جاتے پہلے سے زیادہ احتیاط اور ہوشیاری۔ اصل فکر اُسے اِس بات کی تھی کہ روزانہ کی آمدنی کس طرح گھر لے کر آئے۔ پیری جیسے بدمعاش بھی اِسی تاڑ میں تھے کہ کسی طریقے اُس کی روز کی کمائی، جب زیادہ ہو لوٹ لی جائے۔ اِن تمام اندیشوں نے دنوں میں حکیم صاحب کا چہرہ نچوڑ لیا۔ ہر وقت ذہن میں ایک ہی خیال رہتا کہ اعتبار کرے تو کس کا کرے۔ "آخر کسی پر تو کرنا ہوگا۔" مگر اِدھر اُدھر سوچنے کے بعد ایک ہی چہرہ بار بار اُس کے ذہن میں اُبھرتا، فیاض کا چہرہ۔ اگر آنکھیں بند کر کے کسی کا اعتبار کیا جا سکتا تو وہ صرف فیاض تھا، اور کوئی نہیں۔ رقم گھر تک بحفاظت لانے کے لیے ایک خیال یہ بھی تھا

کہ وہ فیاض کو اپنے ساتھ تانگے پر لے آیا کرے مگر ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ اگر فیاض اُس کے ہمراہ مطب سے اُٹھ آیا تو مطب کا کیا بنے گا، گاہکی کا کیا ہوگا۔ جب مال ہی نہ رہا تو احتیاط کس بات کی۔ آخری فیصلہ یہی ہوا کہ کچھ نقدی حکیم رام لعل اپنی پھتوئی کی اندرونی جیب میں چھپا کر لے آیا کرے گا اور باقی ساری آمدنی دن ڈھلے فیاض حکیم صاحب کو پہنچا کر پھر اپنے گھر جایا کرے گا۔

(13)

فیاض کے رویے نے مہراں کو جذباتی لحاظ سے توڑ پھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اُسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ مردوں کی دنیا میں عورت کے ساتھ اِس طرح کا سلوک بھی ہو سکتا ہے۔ اُسے وادھو اور فیاض دونوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ عورت کو ٹھوکروں میں رکھ کر اُس کی تذلیل کرنے کے معاملے میں دونوں کا برتاؤ ایک جیسا تھا۔ وہ سوچتی اور روتی تھی کہ عورت کے پاس محض عورت ہونے کے مان کے علاوہ اور ہوتا کیا ہے مگر اُن دونوں مردوں نے اُس کے عورت ہونے کو ہی خوار کر کے رکھ دیا تھا۔ سیدھی چوٹ اُس کی نسوانیت کے مان اور پہچان پر تھی۔

عورت کے لیے اپنا آپ، اپنا جسم، اپنا مان کسی مرد کے حوالے کرنا اعتبار کی انتہا ہوتا ہے۔ یہ کیسے مرد ہیں کہ جنھوں نے اِس اعتبار کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا ہے۔ پہلے اُس کے والدین نے وادھو کے حوالے کر دیا یہ جانے بغیر کہ وہ عورت کے لائق ہے بھی یا نہیں۔ اُس نے ہر بار اُس کے عورت ہونے کی بے حُرمتی تو کی سو کی اُس کے اندر کمتری کا احساس اتنا بڑھا دیا کہ اُسے اپنے جسم سے ہی نفرت ہو گئی، اِتنی نفرت کہ اُس کا جسم کسی مرد کے اندر کا مرد جگانے سے عاری ہو گیا تھا۔ یہ ایک ایسا مرحلہ تھا کہ جہاں اُس کی سمجھ بوجھ بھی غرقابی میں آ گئی تھی۔ کچھ طے نہیں ہو پا رہا تھا

کہ وادھو نامرد ہے یا وہ خود نا عورت۔ شادی کے کئی ماہ بعد جب کہیں سے بھی حاملہ ہونے کے آثار دکھائی نہ دیے تو ایک روز ساس نے پوچھ ہی لیا۔ مہراں جتنا جانتی تھی، کھول سُنایا۔ اُس کی ساس سمجھ تو گئی مگر پھر بھی بہو کو دبائے رکھنے کے واسطے سختی سے کہہ دیا کہ اماں مرد کو مرد عورت بناتی ہے اور اگر عورت ہی برف ہو تو مرد کے پانی میں اُبال کہاں سے آئے گا۔

ساس کی بات سن کر مہراں کو یوں لگا کہ اُس کا وجود برف والے پھٹے پر پڑی کوئی بھاری سِل ہے، کچی برف کی سِل کہ جس میں لگنے والا سُوا بھی نہ تو اِسے کھرچ سکتا ہے اور ناں ہی توڑ سکتا ہے، محض چورا بنا دیتا ہے۔ اُس کی ساس نے مہراں کو برف سے آگ بنانے کے لیے کئی ٹونے ٹوٹکے شروع کر دیے۔ پنساری سے چھوہارے منگوا کر روز اُن کو گرم چولہے کی راکھ میں دبا کر بھوننے کے بعد تتے تتے مہراں کو کھلائے جانے لگے۔ صبح سویرے خالی پیٹ رَس گُٹ گڑ کو دیسی گھی میں تڑکا کر اُس کی دھواں نکالتی لُپری اور سورج غروب ہونے سے پہلے کڑکناک مرغی کے انڈوں کا حلوہ چٹایا جاتا کہ کسی طرح اُس کے اندر کی سوئی ہوئی عورت کو جگایا جا سکے یہ سمجھے بغیر کہ وہ تو پہلے ہی آگ ہے، اُس کے اندر کی عورت تو پہلے ہی رَت جگوں کی ماری ہوئی ہے، آگ اگر اور بھڑک اُٹھی تو کیا ہو گا۔ سُو وہی ہوا جو ہونا تھا۔ مہراں کے اندر کی آگ دھواں دیتے دیتے ایک الاؤ کی صورت اختیار کر گئی۔ جگراتے تو پہلے ہی سے اُس کا مقدر تھے، باقی کی کسر ٹونے ٹوٹکوں نے پوری کر دی۔ باہر کی آنکھیں تو پہلے ہی کھل کر باہر کو تھیں، اندر کی آنکھ بھی اب چھت سے جا لگی۔

مگر یہ سب کچھ وادھو کے کس کام کا جہاں ٹھنڈک نے گوڈے، گٹوں کو چھوڑ، سوچ تک کو گُھرے میں جکڑ رکھا تھا۔ اِس اُلٹے علاج کے سبب مہراں کا بھٹی ہوا بدن تڑخا بھی اور تڑخایا بھی رَج کے۔ اُس کی قربت کے تصور سے بھی لرزاں وادھو اب کے تو حوصلہ ہی چھوڑ بیٹھا اور آٹھوں پہر شرمندگی کے مارے منہ چھپانے کے لیے اُلٹا مہراں پر لعنت ملامت کے ساتھ ساتھ جسمانی تشدد بھی شروع کر دیا کہ عورت زور زبردستی سمیت کسی طور تو قابو میں رہے۔ اِس نئی راند کا عذاب تو

پھر بھی مہراں سہہ رہی تھی سوائے ایک تبدیلی کے۔اب کے اُس کی ساس ہار مان کر ایک اور داؤ کھیلنے پر آ گئی تھی۔ بظاہر وہ ہر کام میں اپنی بہو کی طرف داری کرتے ہوئے نہ تھکتی مگر اتنا تو مہراں بھی سمجھتی تھی کہ اُس کی ساس کی سبھی مہربانیاں، صرف اپنے بیٹے کا بھرم رکھنے اور اُس کا وارث پیدا کرنے کا جتن ہی تو تھیں۔

اِس ساری کہانی میں اَن دیکھا موڑ تو اُس وقت کا آ چکا کہ جب فیاض نے اُسے اپنی جکڑن میں لے کر خاموش پیغام دیا کہ سارے مرد وادھو نہیں ہوتے۔ مہراں اگرچہ فیاض کی پکڑ میں ذہنی طور پر پکڑی جا چکی تھی مگر پھر بھی اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اُسے اپنے شوہر کی گدی پر لا بٹھاتی۔ یہ چال تو اُس کی ساس کی تھی جس نے اُس کی سوچ میں جونک چمٹا دی کہ تَڈی بدلنا بھی سماج کی مستور ریت ہے جو عورت کو اپنے شوہر اور خاندان کا شملہ اُونچا رکھنے کے لیے نبھانی پڑ جاتی ہے۔ پہلے پہل تو مہراں کو ایسے لگا کہ اُس کی ساس اُس کو طلاق دلوانے کے لیے کوئی نئی سازش تیار کیے ہوئے ہے مگر جب جانا کہ اُس کی بے چینی کے پیچھے واقعی کوئی پوشیدہ رَمز ہے تو وہ اکڑ کے اُٹھی اور اُس کے گلے پڑ گئی۔

وادھو کی ماں کو جان چھڑانی مشکل ہوئی تو وہ قسموں، رَسموں اور منت ترلوں پر آ گئی۔ مہراں کے لیے تو یہ سب کچھ سَتی ہونے جیسا تھا۔فرق بس یہ تھا کہ اُس سَتی میں ایک بیوی شوہر کے مرنے کے بعد اُس کی لاج رکھنے کے لیے اپنے آپ کو آگ کے سپرد کر دیتی ہے مگر یہاں تو شوہر زندہ تھا مگر پھر بھی اسے چتا کا سامنا تھا۔کیا اِس مرے ہووؤں سے بھی بدتر کی خاطر، اِس کی اونچی پگ اور اُس کی مونچھوں کے بَل کی خاطر وہ چٹائی بدلنے کی گناہگار ہو جائے؟ یہ سوچ کر مہراں نے ساس کو صاف انکار کر دیا اور ساتھ کھری کھری بھی سُنا دیں کہ اگر دوبارہ مجبور کیا گیا تو وہ کچھ کھا مرے گی۔مگر جب صبح شام وادھو اُسے بانجھ ہونے کے طعنے دینے سے باز نہ آیا تو مہراں کا مَغز بھی کھسک گیا۔

''یہ خصی مجھے بانجھ کہتا ہے ناں..... اب میں بھی اِسے ثابت کر دکھاؤں گی کہ نامرد

کون ہے اور بانجھ کون۔ اس کے لیے یہ سزا کیا کم ہوگی کہ وہ کسی دوسرے کا بچہ پالے پوسے، پڑھائے لکھائے اور اُس کی شادی کرتا پھرے''۔ مہراں کو لگا کہ یہی تو وہ چابی ہے کہ جس سے اپنے آپ کو وہ پھر سے عورت ثابت کرسکتی ہے۔ بانجھ کی بجائے ایک بھرپور زرخیز عورت۔ اپنی مکمل سنجان کے ساتھ ایک مکمل عورت۔

لیکن اُسے فیاض سے یہ اُمید نہ تھی کہ وہ اسے اِس طرح، اتنا خوار کرنے کے بعد یوں ٹھوکر مار دے گا۔ مہراں کو لگا کہ وادھو اور فیاض، دونوں میں کوئی فرق نہیں، دونوں ہی نامرد ہیں۔ اُدھ ادھورے مرد۔ اگر وادھو جسمانی طور پر نامرد ہے تو فیاض ذہنی طور پر نامرد۔ دونوں عورت کو سمجھنے اور دریافت کرنے سے قاصر۔ وادھو تو اُس پر اس لیے جسمانی تشدد کرتا تھا کہ اُس کا تقاضوں سے بھرپور وجود اُسے خوفزدہ کرتا تھا۔ مگر فیاض کو کس چیز نے ڈرا دیا۔ کہیں یہ تو نہیں کہ اپنے جسمانی تقاضوں کا شعور رکھنے والی عورت سے سبھی مرد ڈرتے، کانپتے اور گریزاں رہتے ہیں۔ یہ سوچ کر مہراں مُسکرا دی، ایک زہر بھری مُسکان۔ اُسے پہلی بار اپنے عورت ہونے پر مان محسوس ہو رہا تھا جو اپنی عقل اور عاجزی سے بڑے بڑوں کی گردنیں توڑتی آئی ہے۔

''اگر عورت اور مرد کے تعلق کا کھیل بس اتنا ہی ہے تو وہ یہ کھیل، دو نامردوں کو کھیل کر دکھائے گی، مگر اب کے ہارنے کے لیے نہیں صرف جیتنے کے لیے۔ میں دیکھتی ہوں اب کون مجھے حاملہ نہیں کر پاتا۔'' فیاض کے دھتکارنے کے دکھ سے آدھی رات تک جاگتی ٹوٹی پھوٹی مہراں نے صبح ہونے کا انتظار بھی نہ کیا اور ساس کو پکڑ کر اُٹھا دیا۔

''اماں...... میں تیار ہوں تڈی بدلنے کے واسطے''

''مگر تمہارے تیار ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے..... تم میں اگر کچھ ہوتا تو لوگ تم سے یوں دور نہ بھاگتے۔'' اُس کی ساس اُسے پکا کرنے کے لیے جان بوجھ کر طعنہ زنی پر اُتر آئی تھی۔

مگر مہراں نے اُس کی سُنی اَن سُنی کر دی۔ ''تم نے ایک بار کسی جنوں والے پیر کا بولا تھا کہ جو بانجھ عورت کو بھی گُبھن کر دیتا ہے۔''

''ہاہا کہا تھا میں نے.... پھر''

''مجھے فجریں لے چلو......''

''تم جن کھیلو گی!.....''

''بس یوں سمجھ لو کہ جن مجھے کھیلے گا... لیکن اپنے بیٹے کو اچھی طرح بتا دینا.... اب مجھے طعنہ نہیں دے گا بانجھ عورت ہونے کا۔''

(14)

جوں جوں تُلسی کے مُکلاوے کے دن قریب آ رہے تھے اُس کی فیاض کے ساتھ مل بیٹھنے کی خواہش آتش بنتی جا رہی تھی۔ گھر میں آنے جانے والوں کی بہتات کے سبب سوڈھی اور رادھی کی ملاقاتیں تو برباد ہوئیں سو ہوئیں اِس کے ساتھ ساتھ تُلسی پر بھی عجیب قسم کی پابندیاں لگنی شروع ہو گئیں۔ کُنڈی کھڑکنے پر وہ نہیں جائے گی بلکہ نئی رکھی ہوئی نِوائن جائے گی، دھوپ میں نہیں بیٹھے گی، رسوئی میں داخل نہیں ہو گی اور کام کاج نہیں کرے گی۔ اِس سونے پر سہاگہ کئی قسم کے لیپ منہ کے علاوہ سارے بدن پر کرنے کے واسطے اُرائینوں کا آنا جانا الگ سے شروع ہو گیا۔

ہر آنے والے دن کے ساتھ تُلسی کے چڑچڑے پن میں اضافہ کچھ اتنا بھی انوکھا نہیں تھا خاص طور پر اِس لیے کہ اب تو فیاض نے روزانہ شام کو اُن کے گھر آنا شروع کر دیا تھا۔ حکیم صاحب اُسے اپنے کمرے میں بلا لیتے اور پھر کچھ دیر کی کانا پھوسی کے بعد وہ اُلٹے پاؤں باہر نِکل جاتا۔ شادی کو ایک ہفتہ باقی رہا تو تُلسی بالکل دیوانی ہو گئی۔ صبح سے شام تک فیاض کا انتظار کرنا، اُس کے آنے پر دَھک دھک کرتے دل کے ساتھ اندرونی کھڑکی میں سے چھپ چھپ کر

دیکھنااور پھر اُس کے جانے کے بعد اُداس ہوکر اوندھے منہ بستر پر گر کر بر بر آنسو بہاتے رہنا اُس کی زندگی کی دلیل بن کے رہ گیا۔ یہ ایک ایسی یکطرفہ توڑ پھوڑ تھی کہ جس کی فیاض کو خبر تک نہیں تھی۔ اُسے کیا خبر کہ جس گھر میں وہ شام ڈھلے اپنا قدم رکھتا ہے، وہاں اُس کے انتظار میں کوئی جوان لڑکی صبح ہی سے اپنا آپ ایک ایسے ناممکن ملاپ کی آس میں بچھائے رکھتی ہے جسے شام کے بعد آنسوؤں سے لپیٹنا پڑتا ہے۔

ہمارے وسیب کی دوشیزائیں بھی کیسا نصیب لے کر آنکھ کھولتی ہیں کہ جہاں شعور کی پہلی دید کے ساتھ ہی انہیں اپنی زندگی آپ جینے کی بجائے ایک ایسی جونک ہونے کا یقین دلایا جاتا ہے کہ جس کا مقدر ایک مرد کے وجود کے ساتھ جُڑے رہنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جونک سیانی ہو تو چمٹی رہے گی، خون چوستی رہے گی اور اگر اپنے پاؤں پر قائم رہنے کی دَھج بنائے گی، اکڑ دکھائے گی تو اُکھیڑ کر پھینک دی جائے گی، لحظہ لحظہ مرنے کے لیے، اِس طرح کہ اُس کا اپنا وجود ہی اُس کا بوجھ اُٹھانے سے انکاری ہو جاتا ہے۔ لیکن اِس مخالفانہ بدقسمتی کے باوجود یہ لڑکیاں اپنے ادھورے کردیے گئے وجود کو مکمل کرنے کی خواہش میں کوئی نہ کوئی ایسی آرزو پال لیتی ہیں کہ جس کے پورا ہونے کا امکان صفر سے زیادہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس خواہش، اِس آرزو کے پورے نہ ہونے کو ہی وہ وسیبی جبر کے سامنے ایسی توانائی کے طور پر برتنے کا ہُنر سیکھ لیتی ہیں کہ جس کے تصوراتی سہارے میں باقی ماندہ زندگی گزار دینا ممکن ہو جاتا ہے۔ اِس کے برعکس جو لڑکیاں اِس خواہش کو اپنی طاقت نہیں بنا سکتیں، وہ اپنے خوابوں کے ہاتھوں بے موت ماری جاتی ہیں۔ لیکن اِس ساری راند میں ایک بڑی بدقسمتی بھی چپکی چھپی سی اِن لڑکیوں کے ساتھ قدم قدم چلتی رہتی ہے۔ ایک عجیب تماشا کہ اِن لڑکیوں کی کسی متبادل کی خواہش بھی کسی دوسرے مرد کے حصول تک محدود ہوتی ہے لیکن اطمینان کے اِس خود ساختہ احساس کے ساتھ کہ وسیب کی اِن جبری روایات کے خلاف اُن کی مزاحمت کہیں رجسٹر ہو گئی ہے۔ مگر افسوس کہ ایک اَن بھاتے مرد کے ہونے کے احساس کو مارنے کے لیے بھی ایک ایسے مرد کا سہارا تلاشنا پڑتا ہے کہ جو اُن کے خود بنائے گئے خاکے اور اُس

کے ہونے میں اُن کی مرضی کے رنگ بھرے۔ اور اگر آنے والے کل میں یہ خود تراشا ہوا مرد بھی اپنے پر پرزے نکال لے تو پھر شکوے شکایت کے لیے شکایت گاہ تلاشنی مشکل ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں وسیب بھی تمسخر اُڑاتا ہے اور وسیب کے پردھان بھی۔

کبھی کبھی معاملہ اِس کے برعکس بھی ہو جاتا ہے۔ جہاں کوئی مرد کسی عورت کو وسیبی روایات سے بغاوت کرتے ہوئے اپنی طاقت بنانا چاہتا ہے وہاں وہی عورت ہی اُس کے سَر پہ گوبر کرتے ہوئے اُسے نشانِ عبرت بنا دیتی ہے۔ اُسے پیار کرو، ایک زمانے کو مخالف کر کے اُسے سَر آنکھوں پر بٹھاؤ مگر پھر بھی صدقے واری وہ کسی ایسے راہ وَ ٹاؤ پر کہ دھوکہ بازی جس کا شیوہ اور خواب دکھانا ہُنر۔ وہ اُس کے تصورات میں اپنی چرب زبانی سے رنگ بھرتا ہے، اُس کے وجود سے حظ اُٹھاتا ہے اور پھر تو کون اور میں کون۔ جو عورت کا ہوا عورت نے اُسے برباد کر دیا۔ معاملہ پھر بھی کہیں وہیں رُکا ہوا ہے کہ تربیت (عورت) ابھی تک ''تَری مَت'' کے خمار سے باہر آ ہی نہیں سکی اُن مغل بادشاہوں کی باقیات کی مانند جو ''کمپنی بہادر'' کے آ جانے کے بعد بھی بادشاہت کے ''کورنش'' اور ''آداب'' سے باہر نہ آ سکے تھے۔

تُلسی کے ساتھ بھی کچھ ایسا معاملہ تھا۔ وِشنو کے ساتھ جسمانی شراکت اُس کی سماجی مجبوری تھی مگر اُس کے تصور نے جس قسم کا مرد اُس کے دل پر منقش کیا تھا اُس کی شبیہہ تُلسی کو کہیں فیاض میں دکھائی دے گئی اور اُس نے وہیں گرہ دے ڈالی، دِل کے پلو کے ساتھ۔ اُس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ سماجی مرد کے خلاف بغاوت کر سکے مگر اتنی ہمت تو ضرور تھی کہ سماج کی اِس دین کو اِس طرح ٹھکرائے کہ وہ تمام عمر اُسی جوٹھ پر گزارہ کرتا رہے جو اُس کی پسند کے مرد نے چچول کر اُس کی جانب پھینکا تھا۔ گو کہ ایک کمزور لڑکی کے پاس سماج کے خلاف مزاحمت کی یہ سب سے ادنیٰ صورت تھی لیکن اپنے اثرات کے لحاظ سے اِس کی چوٹ سب سے کاری اور سب سے برتر۔

جب تُلسی کے مُکلاوے میں صرف چار دن رہ گئے تو تُلسی کے پاس اپنے اندر کی عورت کا وجود منوانے کے لیے اور کوئی حیلہ نہ رہ گیا بجُز اس کے اگر فیاض سے وِصال ممکن نہیں تو

موت کو گلے لگانا ہی ارفعٰی صورت۔ یہ تو اُسے کسی صورت قبول نہیں تھا کہ وِشنو اُس کے کنوارے جسم کو ہاتھ بھی لگائے۔ اِس کی ایک ہی صورت بار بار اُس کے سامنے آ رہی تھی کہ کسی طور فیاض کی امانت اُس کے حوالے کر کے وہ اپنے آپ سے سرخرو ہو جائے۔ پھر چاہے جو ہو، اُسے اپنے ادھورے ہونے کا شکوہ خدا سے بھی نہیں ہوگا۔ لیکن یہ سب کچھ ہو تو کیسے ہو۔ فیاض تو اُس کے دل کا حال تک نہیں جانتا تھا۔ اگر جانتا بھی ہوتا تو اِس نوعیت کی بھیڑ بھاڑ میں کیا کر لیتا۔ چوبیس گھنٹے کی اِس سوچ میں اب تو یہ سوچ بھی گھمر ڈال کر کھڑی ہوگئی تھی کہ اُس کا وجود فیاض کی امانت کیسے اور کہاں سے ہو گیا۔ نہ تو اُس کے ساتھ وعدہ وعید نہ میل ملاپ اور نہ کبھی آمنا سامنا ہونے سے زیادہ کوئی بول چال۔ اِس نئی سوچ نے تو اُس کی خودساختہ ''امانت'' کی عمارت کو مسمار کر کے رکھ دیا۔

یہاں اُس کے دِل نے تو کیا گواہی دینی تھی، تُلسی کے اندر کی عورت نے گواہی دی کہ ''فیاض'' اور کچھ نہیں، بس وِشنو سے اُس کی نفرت کی تخلیق ہے۔ اگر وِشنو دُھوپ ہے تو فیاض چھاؤں، وِشنو بھادوں کا حبس ہے تو فیاض ساون کی نمی سے لدی پھندی ٹھنڈی ہوا۔ وِشنو ہاڑ کی گرمی ہے تو فیاض چیت کی اوس سے بھیگی ہوئی روشن صبح۔ وِشنو اِس لیے اَن بھاتا کہ وہ حقیقت تھا، فیاض اِس لیے من بھاتا کہ وہ تصور تھا۔ وِشنو سے نفرت کے کئی حوالے تھے مگر فیاض سے محبت کا ایک ہی حوالہ کافی کہ اُس کا وجود وِشنو کے وجود کی ضد میں اُس کے اندر کی عورت نے مصور کیا ہے۔ اصل میں فیاض کا نہ تو کوئی وجود اور نہ ہی کوئی نام۔ وِشنو سے نفرت کے اُس لمحے میں تُلسی جسے بھی دیکھ لیتی وہی اُس کے جسم کی امانت کا امین قرار پاتا۔ یہ اب فیاض کی قسمت کہ اُس خاص لمحے میں وہ تُلسی کے سامنے آیا اور اُس کی محبت کی علامت بن گیا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ فیاض محض ایک علامتی پہچان تھا جس کا ہونا ایک عورت کے جنسی ردِعمل اور جذباتی استرداد کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

مان لیا کہ مادہ کی تخلیق کا سبب اگلی نسل کے تسلسل اور بقا کا بندوبست کرنا ہوتا ہے

مگر اِس میں کیا شک کہ اِس ذمہ داری کو نبھانے کے لیے نُروہ اپنی مرضی کا چُنتی ہے۔ وہ چاہے عورت ہو یا کوئی اور مخلوق، نَر کے چناؤ میں اپنی مرضی کرنا اُس کی سرشت میں شامل ہوتا ہے۔ کون حبیب اور کون رقیب، اِس منصب تک رسائی کی کُنجی عورت اپنے پاس رکھتی ہے۔ آنے والے زمانوں کو کس طرح کے نَر کے ملاپ سے کیسی نسل دینی ہے، اِسے اُس کے اندر کی مادہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ جنگل میں جانوروں کی مادائوں کو تو شاید اِس انتخاب کی اِجازت ہوگی پر انسانی معاشرت میں فطری تقاضوں کے برعکس اِس چناؤ کا حق مرد نے غصب کرتے ہوئے اپنے پاس رکھ لیا کہ آج کی عورت نے آنے والے زمانوں کو اصیل نسل دینی ہے یا رَلوڑ۔ مگر اندرخانے نسلی تسلسل کے لیے اپنے من پسند نَر کی تلاش، جستجو اور چناؤ کے عمل کی الف بے کا مرد کو پتا بھی نہیں لگنے دیا جاتا اور وہ بدستور اِسی زعم میں کہ وہی سب کچھ ہے سبھی حقوق اُسی کی تجوری میں ہیں۔ اپنا یہی حق محفوظ رکھنے یا استعمال کرنے کے واسطے تُلسی کی اِس خواہش نے فیاض کو وِشنو سے کہیں برتر بنا کر اُس کے سامنے لا کھڑا کیا، اِس آس پر کہ وہ اُس کی خواہشوں کی نگہبانی کرنے جوگا ہُنرمند تو ضرور ہوگا۔

مگر یہ سب کچھ فیاض کیسے کرے گا، اِس بات کا جواب تو خود تُلسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ فیاض تک اُس کی آہیں پہنچتی بھی ہیں کہ نہیں۔ لیکن اِس کے باوجود پتا نہیں کیوں اُسے یقین تھا کہ فیاض اُس کی حالت سے اتنا بھی بے خبر نہیں ہوگا۔ یہ اِسی مغالطے کا نتیجہ تھا کہ تُلسی اپنی زندگی کے اِن اہم ترین دنوں کو بھی اَن دیکھی خجالت کی سولی پر لٹکائے بیٹھی تھی محض اِس انتظار میں کہ اُس کے مُکلاوے سے پہلے پہلے کوئی لمحہ نصیب کا ضرور ایسا آئے گا کہ وہ فیاض کے نام کی ہوئی تصوراتی امانت کا بوجھ اُتار کر ہلکی پھلکی ہو بیٹھے گی۔

(15)

مڑ یچی والے بھوپے کے وسیع وعریض اَستان میں سبھی آوازیں گُنگی ہو چکی تھیں سوائے
ڈھول کی بَٹ بَٹ اور دنادن کے جس نے وہاں موجود ہر شخص کو اپنے ردھم کے جادو میں اِس
طور جکڑا ہوا تھا کہ دیکھنے والوں کے دل بھی ڈھول پر مڑھے ہوئے سوکھے چمڑے پر پڑنے والی
تھاپ کے ساتھ دَنادَن کئے جا رہے تھے۔

اور جنہیں دیکھا جا رہا تھا......

وہ حسینائیں تھیں......کوئی اٹھارہ، کوئی بیس اور کوئی بائیس کی......

جن کے آلتی پالتی آسن میں ساکت ہو چکے جسموں پر پھِرکی کی طرح گھومتی گردنیں،
ڈھول کی آواز کے زیر و بم سے اپنے سَر کے لمبے لمبے بالوں کو کسی چکیکل کی طرح برابر وقفوں میں
اِس طرح گھما رہی تھیں جیسے جادونگری میں کالی چھتریاں، خود بخود کھل اور بند ہو رہی ہوں۔

جوں جوں ڈھول کی بَٹ بَٹ اور دَن دنادن تیز ہوتی، دوشیزاؤں کی گردنوں کی
بھنوالیاں بھی ویسے ہی تیز ہو جاتیں۔ اُس وقت تو یوں لگتا کہ اُن کے منکے، گردنوں میں سے نکل کر
باہر آن گریں گے۔

مگر اس کے باوجود اُن میں بلا کی لچک تھی جیسے فالسے کی کوئی نرم چکیلی شاخ، پھرتی تھی جو گھبرائے ہوئے ہرنی کے بچے کی ٹانگوں میں ہوتی ہے، وہاں تھکاوٹ تو کیا آلس تک کا نام و نشان تک نہ تھا۔ یہ پچیس چھبیس دوشیزائیں، مڑ پچی والے بھوپے کے اُستان پر اپنا اپنا جن نکلوانے آئی ہوئی تھیں۔ نصف دائرہ بنائے بیٹھی اِن جوان لڑکیوں کے نا آسودہ جسموں کے وسط میں بیٹھا ہوا بھوپا کچھ دیر کے بعد اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چابک دائیں بائیں گھمائے رہتا، جس سے شڑاپ کی آواز تو آتی مگر کسی بھی لڑکی کے لبوں سے ہلکی سی سسکی تو کیا نکلتی، بدن میں درد یا تلذذ کی لہر تک نہ اُٹھتی، لرزش بھی نہ ہوتی، لگتا کہ بدن پر چابک نہیں پڑا بلکہ کسی نے ٹکور کے لیے نیم گرم کپڑے کا کوئی نرم پھایا جسم کے ساتھ لگا کر پھر سے اُٹھا لیا ہے۔ جن کھیلتی ہوئی دوشیزاؤں کے ریشم کی مانند ملائم جسموں پر پڑنے والے چابکوں کی شپڑ وشپ کو اِس کے علاوہ کیا نام دیا جا سکتا تھا سوائے ظاہری تماشہ کئے جانے کے کہ اگر جن کُراڑا اور غصیل ہے تو بھوپا بھی کسی سے کم زابر نہیں۔

اِن حسیناؤں کے جوان جسموں میں چنگاریاں سلگاتی، اضافی حدت کو نکاس کی کوئی فطری گزرگاہ نہ ملی تو اُس نے اُن کے بھیتر اَن دِیکھا الاؤ بھڑکا کر اُن کے بدن سُرخ آگ بکھیرتے تندور بنا دیے۔ جن جوان مردوں کو اِن کے کھولتے جسموں کا دارو بنا کر اُن کے ساتھ بیاہا گیا تھا، وہ دارو ہونے کی بجائے اُلٹا بوسیدہ دیوار بن گئے تو اُن کی بیویوں کا یہ بھڑکتا بھانبڑ اب اِن مُکے چُکے لوگوں کو جِن بَن بَن کر ڈراتا تھا، دہلاتا تھا، یَرکاتا تھا۔

ڈھول کی تھاپ کچھ اور تیز ہوئی......

جوان لڑکیوں کی گردنوں پر پنکھے کی طرح گھومتے بالوں کی گھمکاری بھی کچھ اور تیز ہو گئی......

جوان جسموں کی تپش حد سے بڑھ کر حبس بنی تو اِن میں اُبالے کھاتی وافر توانائی نے بھی اطراف میں شعلے بھڑکا دیے، اَستان کی چھت تک بلند، تیزی سے بل کھا کر آسمان کی طرف جاتے ہوئے، مگر دیکھنے والوں کی دید سے اوجھل......

اچھی بھلی دیر تک یونہی بے دید دیدے کھولے گردنیں گھمانے کے بعد یہ ہانپتے کانپتے جسم بے سُدھ، بے جان ہو کر ایک دوسرے کے اوپر گرتے چلے گئے، بالکل ساکت، آنکھیں موندے، آسودگی کے عمل میں سے گزرتے ہوئے......

پسینوں پسینے ہوئے بڑے ڈھول والے نے سُکھ کا سانس لیا اور پھر ہاتھوں کو روک کر، دھوتی کے پلو کے ساتھ ماتھے سے بہہ کر آنکھوں میں گرنے والے پسینے کے قطروں کو پونچھنے لگا۔ وہاں آلتی پالتی مار کر بیٹھے اور کئی کھڑے تڑے سو، سوا سو لوگوں نے بھی کافی دیر سے اپنے روکے ہوئے سانس پھر سے اندر کی طرف کھینچے، ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر خوف اور اطمینان کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ، یونہی ہولے ہولے بولنا تو شروع کیا مگر ایک دوسرے کے کانوں میں کانا پھوسی کرتے ہوئے۔ اُن کی آنکھوں میں تحسین بھی تھی، بھوپے کی ہنرمندی اور قابلیت پر اعتماد کی مہر ثبت کرنے کے لیے کہ جس نے اُن کی بیویوں، بیٹیوں اور بہنوں کے جسموں پر ناجائز قابض جنات اور بھتنوں کو چابک کی شاپڑ شَپ سے نکال باہر کیا تھا۔

کچھ لوگ جلدی جلدی بھوپے کے پاؤں چومنے کو لپکے جو اپنا چابک ایک طرف کر کے بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ مگر اُس نے اِس طرح لپکتی ہوئی شکر گزار مخلوق کو اشارے کے ساتھ نزدیک آنے سے روکنے کے لیے جھڑک دیا، کیونکہ کام ابھی ختم کہاں ہوا تھا، ضروری ربط تو ابھی اُستوار ہونے تھے۔ ہانپتے کانپتے بھوپے کی سانس تھوڑی قابو میں آئی تو اُس کے ایک اشارے پر اُس کا خاص ملازم اُس کے قدموں کو چوم کر اُٹھا اور بے سُدھ پڑی ہوئی دوشیزاؤں کے جسموں کو اناٹومی کے کسی ماہر کی طرح باری باری آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹٹولتا اور اُن کا مطالعاتی جائزہ لیتا ہوا پھر سے خلیفے کے کان سے آن لگا، انسپکشن رپورٹ پیش کرنے کے لیے۔ اِس دوران رال ٹپکاتے بھوپے کی نیت اور دل کی رفتار کا اندازہ اُس کے پھیلے ہوئے پیٹ کے شوکن پھوکن سے باآسانی لگایا جا سکتا تھا۔

رپورٹ سننے کے بعد بھوپے نے اپنے خاص ملازم کو سُرخ کپڑے کی پانچ کترنیں

دیں جو اُس نے وہاں جن کھیلنے کے بعد بے سُدھ پڑی ہوئی لڑکیوں میں سے پانچ کے بکھرے ہوئے بالوں کی لٹ سے ایک ایک باندھ دیں۔ سُرخ کپڑے کی کترن کا باندھا جانا اس بات کا اعلان تھا کہ اِن منتخب دوشیزاؤں کے جن بہت سخت گیر ہیں، ابھی بدن میں سے نکلے نہیں، اندر ہی اندر ہی چھا ڈال کر بیٹھے ہوئے ہیں، ہوناں ہوا ایک مرحلہ اور سَر کرنا ہوگا۔ یہ سُرخ کترنیں، صرف کپڑے کی لیریں نہیں تھیں، بلکہ سُرخ سانپ تھے جنہوں نے ڈس ڈس کر اُن پانچ لڑکیوں کے وارثوں کے منہ مایوسی کے لیپ سے پہلے سبز اور پیلے اور پھر کالے نیلے کر رکھے تھے۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتے تھے، نئی مشکل کی خجالت سے رِکر چی رِکر چی ہونے کے بعد کچھ تو سہم کر دیوار سے لگ گئے اور کچھ گھٹنوں میں منہ چھپائے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔

دوسری طرف اُن وارثوں کی خوشی دیدنی تھی کہ جن کی عورتوں کے جسم جنات اور بھتنوں نے بھوپے کے چابک کی مہربانی سے واگذار کر دیے تھے۔ اُن کے چہروں کی مسکراہٹ روکے نہیں رُک رہی تھی۔ باپ، شوہر یا بھائی نما مالکان، اُنہوں نے کچھ خود اور کچھ بھوپے سئیں کے خدمت گاروں کے مِنت ترلے سے، اُن دوشیزاؤں کی پھیلی ہوئی ٹانگوں اور باپردہ بازو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے اُنہیں گھسیٹ گھساٹ کر اَستان کے مخصوص احاطے میں سے باہر لے جانے لگے۔

اَستان سے باہر جانے کا راستہ بھی بھوپے کی گدی کے سامنے سے ہو کر گزرتا تھا۔ وہ وہاں رُکتے، جھکتے اور بھوپے کے پاؤں چومنے کے بعد، پگڑیوں کے پلو میں بندھے ہوئے چُرمُر نوٹ نہایت عاجزی سے دونوں ہاتھ جوڑ کر اُس کے قدموں میں رکھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ مجمع کچھ اور چھٹ گیا تھا۔ اب وہاں صرف وہی لوگ دکھائی دے رہے تھے جن کی لڑکیوں کے بدن ابھی تک جنات کے قبضے سے واگذار نہ ہو پائے تھے۔ اُن کی صورتوں پر آس، نراس، ٹوٹ پھوٹ، بے چینی اور چبھن کی ملی جلی کیفیت تھی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ وہاں نہ تو جینے کی خواہش تھی اور نہ ہی مر جانے کا خوف۔ جبر کا رسہ گلے میں ڈالے تختے پر جھول رہے تھے، لیکن سانس تھی کہ پھر بھی اٹکی ہوئی تھی۔ دید تھی کہ ساکت ہونے کو نہ آ رہی تھی، دل کی دھڑکن کی گنتی تھی

کہ ختم نہیں ہو پا رہی تھی۔

کافی دیر کے بعد بھوپے سئیں کا خاص ملازم دکھائی دیا۔ لوگوں کے خشک ہونٹوں کی پپڑیاں کچھ اور خشک ہوئیں تو تیز دھار درانتیاں بن گئیں۔ ہر کسی کی آنکھوں میں ایک ہی سوال کہ بھوپے سئیں کا خاص ملازم کہتا کیا ہے اور کسے کہتا ہے......

خاص ملازم وہاں آیا تو سہی مگر ایک طرف ہو کر بڑے ماچے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر توقف کے بعد آنکھ کے اشارے سے ایک ایک کو باری باری بُلا کر پوری رازداری سے بتانے لگا کہ اب آگے کیا ہونے جا رہا ہے۔ یہ سب معاملہ چند ساعتوں میں مکمل ہوا تو خاص ملازم واپس بھوپے کے حجرے میں چلا گیا۔ اُس کے واپس حجرے میں جانے سے قبل اتنا ضرور ہوا تھا کہ منتظر لوگوں کو اَستان کے احاطے میں فرش پر بے سُدھ پڑی پانچ لڑکیوں میں سے اپنی اپنی لڑکی کے پاس جانے کی اجازت مِل گئی کہ جن کے جسم اب بیدار ہونا شروع ہو گئے تھے۔

یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی نامعلوم تماشے والا کہیں چھپ کر اپنی پُتلیوں کو کسی نئے تماشے کے لیے ہولے ہولے جگانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اِس حالت میں بھی اِن سبھی لڑکیوں میں سے مہراں اپنے قد بُت، چہرے مہرے، اُٹھ اُٹھان، حسن و جوبن اور آنکھوں میں اُتر جانے والی کشش کے سبب سے الگ اور منفرد دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کے ساتھ کچھ زیادہ لوگ نہیں تھے۔ اُدھیڑ عمر ساس اور ایک تیس پینتیس برس کا جوان جو اپنی ناگوار لاتعلقی کے باعث اُس کا شوہر لگ رہا تھا۔ مہراں کی ساس بھاگ بھری اَستان کے اَدھ کچے اور اَدھ پکے فرش پر بے سُدھ پڑی مہراں کے پاؤں کے تلوے مَل رہی تھی اور وادھو وہاں سے کچھ ہَٹ کر احاطے ہی میں اونچے تھلے پر بنی ہوئی ایک کچی قبر کے تعویز کے ساتھ ٹیک لگائے ہر قسم کی فکر اور اندیشوں سے بے پرواہ، بے سُدھ پڑی ہوئی بیوی پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔

"وے وادھو آ...... کیا دیدے پھاڑے بیٹھے ہو، بیوی ہے تمہاری، اِدھر آ، سَر دبا اِس کا"۔ وادھو کی ماں نے کوشش کی کہ بیٹے کی ڈانٹ ڈپٹ سے وہ اپنا سربراہی اختیار پھر سے بحال

کرے۔ جو جو وادھو اور مہراں کے آپسی جھگڑوں میں کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔ اُسے اور کچھ نہ سوجھا تو آستان کے ماحول کے مطابق قریب ہی دھری ڈنڈ کوری بھی ایک دو بار غصیلے انداز میں کھڑ کا دی۔

''مگر کیوں...... میں کیوں جاؤں اُس جنات کی ماری ہوئی کے پاس''...... وادھو نے بھی ماں کو اُس سے زیادہ کھردرے انداز میں جھڑک دیا...... ''میں کیوں دخل دوں جنات کی اس راند میں...... بیٹھی تو ہو تم بی بی مہراں کی ہمدرد...... کچھ کم ہو گیا۔''

''میں بُکھ گھتاں.... میں کیوں کروں اِس کی خدمت داری، میری پیٹ جائی تھوڑی ہے، بہو ہی ہے ناں، کوئی بیٹی تو نہیں۔ میں تو یونہی خوامخواہ ماں جائی سمجھ کے ساتھ چلی آئی۔''

بھاگ بھری مہراں کے تلوے چھوڑ کر منہ بسورتے ہوئے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔

اِس سے پہلے کہ زہر کی گندل وادھو منہ سے پھر کوئی قہر زہر نکالتا، بھوپے کا خاص ملازم ایکدم بھاگ بھری کے سَر پر آ کے کھڑا ہو گیا۔

''کون ہے اِس لڑکی کا وَلی وارث''......

''جی سئیں جی حکم''...... ادھیڑ عمر بھاگ بھری پھر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''مبارک ہو، بھوپے سئیں نے تمہاری سُن لی ہے''۔ بھاگ بھری کے چہرے پر رونق کے آثار دیکھ کر خاص ملازم اُس کے کان کے قریب ہو گیا...... ''فیصلہ ہوا ہے کہ آج رات بھوپا سئیں تمہاری لڑکی کے جن نکالنے کا چلہ کرے گا۔ اور ہاں! جن ایک نہیں، پورا خاندان ہے جنات کا۔ اب موکھ رکھ ناں میری ہتھیلی پر سوا روپے کی اور لڑکی کو پہنچا دے وہ سامنے جنات والے حجرے میں۔''

''سوا روپے کی موکھ''...... بھاگ بھری کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''تو نہ دو، مجبوری تھوڑی ہے....... بھوپا سئیں آج رات پھر کسی اور لڑکی کا جن نکال لے گا...... یہاں تو مجمع لگا ہوا ہے انتظار کرنے والوں کا اور کسی کی باری ہی نہیں آ رہی۔'' یہ کہہ کر خاص ملازم دوسری طرف اوندھی پڑی ہوئی لڑکی کی طرف منہ پھیر کر اُس کے لواحقین سے

گزارا کرے گا۔

''ناں سئیں ناں، ناراض نہیں ہونا میرا سوہنا، میں دیتی ہوں موکھ اور ہاتھ جوڑ کر دیتی ہوں۔ آج رات میری چھوہر کا چلہ ہو گیا تو سوائی بھی دوں گی ...... یہ لو سوا روپیہ ...... ہے تو ریزگاری مگر ہے پورا...... محنت مزدوری کر کے اِکٹھے کیے ہیں۔'' بھاگ بھری نے خاص ملازم کے سامنے آ کر کچھ اِس طرح سے منت زاری کی کہ وہ اُس کی طرف پھر سے توجہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بھاگ بھری نے اپنے گھاگھرے کے نیفے کی اندرونی سمت اڑسی ہوئی کپڑے کی ایک چھوٹی سی پوٹلی کھولی اور اُس میں سے ریزگاری نکال کر ایک ایک آنہ گننے کے بعد خاص ملازم کو دینے لگی جب کہ وادھوجوں کا توں تَھلی پر بیٹھا غصے بھری حیرت سے یہ سب کچھ ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد مہراں کو جنات والے حُجرے میں پہنچا دیا گیا۔ اندر کا ماحول کچھ اتنا ہیبت ناک تھا کہ بھاگ بھری اگر بتی اور دُھوپ سندور کو سُلگا کر تکھے تکھے اُلٹے پاؤں باہر نکل آئی مگر باقی بچ رہنے والی یہ دونوں چیزیں وہ وہاں جم کر بیٹھے ہوئے خادم کو دینا نہ بھولی جس کا دیو برابر جُثہ بھی اُس خوف کا برتر جزو تھا کہ جو دیے کی لو کی لرزش کے ساتھ کمرے کی دیواروں پر چاروں جانب پھیل کر تھرک رہا تھا۔

دوسری جانب مہراں کی حالت بھی کچھ عجیب سی تھی۔ آنکھیں کھلی تھیں مگر دید نہ تھی۔ نبض ٹَپ ٹَپ کر رہی تھی مگر بدن میں جان نہ تھی۔ ہاتھ جہاں دھر دیے، وہیں دھرے تھے۔ پاؤں جہاں پھیلا دیے، وہیں پھیلے رہے۔ آسودگی کے بھیتر بھی کہیں نا آسودگی کی تڑپ تھی اور نامعلوم سی بے چینی بدن کے ریشے ریشے میں ہلکی ہلکی سرسراہٹ کا باعث ہوئے جا رہی تھی۔

رات نے پہلے پہر سے نِکل کر دوسرے پہر کی کُنڈی کھڑکائی تو حُجرے کے اندر اور باہر خاموشی، خاموش تر ہو گئی۔ جِنات کی جکڑن میں آئی ہوئی لڑکیوں کے ''لواحقین'' دن بھر کی کِشاکش کے بعد جہاں جگہ ملی وہیں گُسڑ مُسڑ چکے تھے۔ اِسی اثنا میں بھوپا اپنے پانچ چھ چیلوں کے ساتھ ولائتی شراب کے نشے میں کسی سانڈ کی طرح جھولتا ہوا اِس طرح وہاں پہنچا کہ اُس کا دایاں

بازو ایک چیلے کی گردن کے گرد اور بایاں دوسرے چیلے کی گردن کے۔ اُستان کے برامدے میں سردی سے کانپتے اور نیند سے اونگھتے ملنگ نے بھوپے کی مخصوص بو سونگھ کر اونگھنے اونگھنے ہی میں دھمال ڈالنی شروع کر دی۔ اُس کی گردن میں لٹکے ہوئے کنٹھے، قلابے اور مڑ کیوں سمیت پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگھروؤں نے اپنی جھنکار سے ماحول کو لرزا دیا۔ مہراں کی ساس نے بھی کچی نیند سے جاگتے ہوئے آنکھیں کھول دیں مگر نہ جانے کیوں یہ بھوپے سے عقیدت کا بوجھ تھا یا اپنی مطلب براری کی مصلحت کہ اُس کی آنکھیں پھر سے پہلے تو جھکیں مگر پھر ہولے ہولے بند ہوتی چلی گئیں۔

جیسے ہی بھوپا حُجرے میں داخل ہوا، ملنگ کی دھمال وہیں تھم گئی اور وہ سَک دَم ہو کر پھر سے اپنی جگہ میں گھسڑ گیا جب کہ سارے چیلے بھی وہیں برامدے میں ایک دوسرے کے سامنے آلتی پالتی مار کر اپنی اپنی چلموں میں چرس مِلا تمباکو بھَرنے لگے اور اُدھر اپنے آپ سے بے سُدھ مہراں کے گرد رال ٹپکاتے بھوپے نے چکر لگانے شروع کر دیے۔ نا آسودگی کی تڑپ نے مہراں کے بدن میں ایسی آتش کو بھڑکا دیا تھا جس کے بلند ہوتے شعلوں کے سبب بھوپے کی ہوسناکی بھی اِس قدر بڑھی کہ شراب کا نشہ پہلے تو اپنا اثر کھو بیٹھا اور پھر ہوا ہو گیا۔ ٹانگوں میں کپکپاہٹ شروع ہوئی تو اُن میں دم باقی نہ رہا۔ اُس نے جلدی جلدی دھوتی کی ٹب میں سے چھوٹی بوتل نکالی اور تھڑکتے ہوئے ہاتھوں سے منہ کو لگا لی کچھ اِس طرح کہ رال اور شراب مل کر کاک ٹیل بن گئے۔

بھوپا اِنسانوں کے اُس گروہ کا نمائندہ تھا جو کائنات میں موجود حُسن کی پرستش نہیں کرتا، اُس کے لیے روتا بسورتا نہیں، ٹھنڈی آہیں نہیں بھرتا، شاعری نہیں کرتا، موتی جیسے لفظوں کے ساتھ بنا سجا کر کہانیاں نہیں لکھتا، ہجر کی لمبی راتوں میں جاگ جاگ کر محبوب کی آرزو میں لمحہ لمحہ مرتا نہیں بلکہ اپنی قبضہ گیر اور تصرف پسند فطرت اور اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کمینگی کی موثر قوت کے بل بوتے پر ہر مطلوب شے کو اپنی گرفت میں لے کر کاٹھ کباڑ بنا دینا اپنا حق سمجھتا ہے۔

کچھ دیر بعد حُجرے کا دروازہ کھلا۔ اپنی مری ہوئی ٹانگوں اور دیگچے جتنے پیٹ کا بوجھ

اُٹھائے بھوپا باہر نکلا اور چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے کے بڑے گرداب میں ہولے ہولے دور ہوتا چلا گیا۔ چرس کے نشے میں دھواں دھواں ہوئے صف بند چیلے جو پہلے ہی سے دَروازہ کھلنے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے، کسی بھیڑیے کی طرح جھپٹے اور سارے کے سارے ایکدم حُجرے میں گھس گئے جہاں بھوپے کے اَدھ چبائے ہوئے مہراں کے جسم کو ابھی اور بھی چنبولا جانا تھا۔

اگلے دن کی صبح مہراں کے لیے اجنبی آسودگی کا پیغام لے کر آئی۔ وہ اُٹھنا چاہتی تھی مگر پورے بدن میں کہیں کچھ ٹوٹ رہا تھا اور کہیں کچھ بکھرتا جا رہا تھا۔ کسی زلزلے کے گزر جانے کے بعد کی کیفیت تھی مگر دھیمے دھیمے، میٹھے میٹھے درد میں گھلے ہوئے سَرُور کے ساتھ، یہ احساس دلائے بغیر کہ اِس کیفیت کا مرکز کہاں ہے۔ عجیب سا احساس تھا کہ جیسے ایک ایک مسام میں تازگی اور مستی داخل کر دی گئی ہو مگر کیا کہ اِس مستی میں ایک آلس سی تھی، تھکاوٹ سے بھری بھری جس نے اُسے گھیبل بنا کر رکھ دیا تھا۔ فاقہ زدہ کو اِس سے کیا غرض کہ بھوجن حلال تھا یا حرام، کچا تھا یا پکا، باسی تھا یا تازہ، بس پیٹ بھرنا چاہئے۔ کیوں کہ بھوک کا نہ تو کوئی مذہب اور نہ ہی یہ اخلاقی اور سماجی قدروں کی جکڑ بندی میں آ سکتی ہے۔ بھوک کا اپنا عقیدہ، اپنا مسلک اور اپنی قدریں ہوتی ہیں۔

مہراں پچھلی شب کے چلّے سے بے خبر تو نہیں تھی مگر لاتعلقی ضرور تھی۔ اُسے کچھ کچھ یقین ہونے لگ گیا تھا کہ واقعی کسی جِن نے اُس کے وجود کو اندر سے جکڑا ہوا تھا اور اب وہ اُس کی جکڑن سے آزاد ہو کر ہوا سے بھی ہلکی ہو چکی تھی۔ ابھی وہ اِس نئی صبح کی گھبلان میں ہی تھی کہ اُس کی ساس حُجرے میں آ گھسی۔ مہراں پہلے تو گھبرا کر سمٹنے لگی مگر جونہی احساس ہوا کہ وہ بھاگ بھری ہے، اُس نے مسکراتے ہوئے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

ڈھلتی عمر کی کاپَٹ اور جہاندیدہ بھاگ بھری نے سُکھ کا لمبا سانس لیا اور بھوپے کے خاص ملازم کو شکر گزاری کی سوائی دینے کے لیے اُلٹے پاؤں حُجرے سے باہر نکل آئی۔

(16)

تُلسی کی شادی میں تین دن باقی رہ گئے تھے مگر اُس کی عجیب سی ضد کے پورا ہونے کا امکان نہ تو دور اور نہ ہی نزدیک۔ جتنا جہیز پہلے سے تیار رکھا تھا اُتنا ہی رہنے دیا گیا کیونکہ باقی جو کچھ بھی دینا تھا کوشش یہی کی گئی کہ حالات کو دیکھتے ہوئے سبھی کچھ زیورات کی شکل میں ہو۔ بری کا نہ تو کسی نے پوچھا اور نہ کسی نے تقاضا کیا۔ جہیز ہی سنبھال لیا جاتا تو بڑی بات تھی۔ ویسے بھی سوڈھی کو غرض مال سے تھی یا پھر لڑکی کی جوانی سے۔ باقی سبھی کچھ جائے بھاڑ میں وِشنو للو سمیت جو اعلانیہ کسی کام کاج کا نہیں تھا۔ تُلسی بھی جانتی تھی کہ وِشنو تو صرف نام کا دولہا ہوگا، اِسی لیے اُس نے رال ٹپکاتے سوڈھی کو ہمیشہ کے لیے نامُرادرَکھنے کے لیے اپنے دلہن بننے کی ساری خواہشیں سارے ارمان فیاض سے منسوب کررکھے تھے۔

معاشرتی جبر نے اِن سارے کرداروں کو اکٹھا کر کے اِس طرح ایک دھاگے میں پرو رکھا تھا کہ جو ایک دوسرے سے جُڑے ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کئی کئی کوس دور اور الگ تھلگ۔ وِشنو تُلسی کا دولہا ہونے کے باوجود دولہا نہ تھا اور فیاض کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی تُلسی کا سب کچھ ہوگیا تھا۔ اِس اَزلی تکون میں ایک عورت نے جو مقام اور مرتبہ دو مردوں کا منقش کر رکھا

تھا، وہ دونوں اُس سے قطعی نا آشنا، بالکل بے خبر۔ اِس کے ساتھ ساتھ جو رشتہ آنے والے دنوں میں تُلسی اور سوڈھی کے درمیان بننے اور رادھی اور سوڈھی کے درمیان ٹوٹنے جا رہا تھا، اُسے وہ تینوں کسی واضح پیغام کے بغیر بھی جان چکے تھے لیکن نہ تو وہ ایک دوسرے کو جتلا سکتے تھے اور نہ ہی اَلوا سکتے تھے۔

اُس روز پچھلے پہر ایک ایسا واقعہ ہوا کہ جس کے بعد تُلسی کو یوں لگا جیسے قدرت نے اُسے فیاض کا دین دار ہونے سے بچالیا ہے۔ ہوا یوں کہ بہاول پور میں اُس کے والدین کا خالہ زاد اور ہونے والے سُسر سوڈھی کا پھوپھی زاد بھگوان داس دنیا سے مُکلا گیا۔ اُس کی ارتھی چونکہ رات میں اُٹھائی جانی تھی، اِس لیے اِن سب کا بہاول پور جانا بھی ضروری اور رات کو وہاں رہنا بھی۔ تُلسی اِس لیے نہیں جا سکتی تھی کہ رسمِ زلف کشائی ہو جانے کے سبب وہ سوٗ نڑوں کی رَکھ میں تھی۔ پہلے تو یہ بھی سوچا گیا کہ شادی کی تاریخ بڑھا دی جائے لیکن سبھی کا خیال تھا کل نجانے کیا ہو لہٰذا بہتری اِسی میں ہے کہ بِنا کسی ڈھول ڈھمکے کے سادگی کے ساتھ سات پھیرے کرا دیے جائیں۔ بہاول پور روانہ ہوتے وقت دونا ئینوں کو گھر کے اندر سونے کا پابند کیا گیا اور گھر کے باہر ڈیوڑھی میں نگرانی کے لیے سب سے زیادہ اعتباری ملازم فیاض کو مطب سے بُلا لیا گیا۔ تُلسی کی اُن سہیلیوں کو بھی کہہ دیا گیا کہ رات کو وہ تُلسی کے پاس ہی سو جائیں جو اُبٹن کی رات سے ہی ڈھولکی بجانے اُس کے ہاں آن بیٹھتی تھیں مگر اب خیال رکھنے کو کہا گیا کہ اِن دنوں نہ تو ڈھولکی بجے اور نہ ہی کوئی ناچ گانا ہونا چاہیے۔

فیاض آیا تو بوڑھی نائن نے اُسے ڈیوڑھی میں چارپائی بچھا دی اور جاتے ہوئے کہہ گئی کہ جب کچھ ضرورت ہو دروازے کی اندرونی کُنڈی کھڑکا دینا اور رات کو چاہے سو لینا مگر ذرا ہوشیار۔ فیاض ڈیوڑھی میں آ کر بیٹھا تو اُس کے سامنے کچھ مہینے پہلے کی سبھی یادیں اِس طرح ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آنے لگیں جیسے وہ احمد پور کے چوک والے مَنڈوے میں بیٹھ کر کوئی فلم دیکھ رہا ہو۔ اُسے وہ دن بھی یاد آیا کہ جب اُس نے پہلی بار اِسی ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر ایک

گداز اور ماسلی لڑکی کو پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے آگے کی طرف دوڑتے دیکھا اور پھر ہوش و حواس اِس طرح اُڑے کہ ڈیرہ نواب تک پیدل ہی چلتا گیا۔ پتا اُس وقت چلا جب عید گاہ آ گئی۔

وہ اِس بات پر بھی حیران تھا کہ اُس کے بعد وہ کئی بار حکیم صاحب کے گھر گیا مگر نہ تو وہ لڑکی کہیں دکھائی دی اور نہ ہی اُس نے اُس کے بارے کچھ سوچنے کی کوشش کی۔ شاید اس لیے کہ وہ گداز لڑکی حکیم صاحب کی بیٹی تُلسی تھی۔ حکیم صاحب کا شاگرد اور ملازم ہوتے ہوئے بھی وہ اُن کے گھر کی عورت کے بارے میں کوئی ایسی ویسی سوچ کیسے رکھ سکتا تھا لیکن آج فیاض کو یوں لگ رہا تھا کہ وہ حکیم صاحب کی شاگردی اور ملازمت کی اخلاقیات کی گرفت سے باہر نکل چکا ہے۔ یہ احساس کیسے اُس کے اندر پیدا ہوا، اِس کا جواب خود اُس کے پاس بھی نہیں تھا۔ شاید اِس لیے کہ ریاست کے بدلتے ہوئے حالات میں ایک ہندو حکیم کا یہاں رہنا ہر آنے والے دن کے ساتھ مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ایک شاگرد ہونے کے ناتے تو اُس پر یہ فرض دوچند ہو گیا تھا کہ اِن حالات میں وہ حکیم صاحب اور اُن کے گھر بار کا پہلے سے زیادہ خیال کرے لیکن حیرت تھی کہ اُس کے ذہن میں تُلسی کا خیال ایک مسلسل چبھن کی صورت کہاں سے آنے لگ گیا تھا۔

گھر کے اندر موجود لڑکیوں کے بلند آہنگ قہقہوں کی مداخلت سے فیاض بھی سوچوں کے حصار سے باہر نکل آیا۔ اُس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو خود کو ایک تنگ سی جگہ میں لیٹا ہوا دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور چارپائی کو ٹانگوں سے ایک طرف دھکیل کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

اُدھر اندر کمرے میں تُلسی کو چھ سات سہیلیوں نے گھیر رکھا تھا۔ ڈھولکی نہ ہونے کے باوجود لطیفے، تالیاں اور قہقہے۔ نائنیں بھی قریب بیٹھیں بار بار اُن کو منع کر رہی تھیں کہ تھوڑا ہنسیں، ہمسائے کیا کہیں گے کہ اتنے قریبی رشتہ دار کی مرگ ہونے کے باوجود تُلسی کا مُکلاوا تو آگے نہیں کیا گیا مگر مخول اور قہقہے تو زیب نہیں دیتے ناں۔ لڑکیاں نائنوں کی بات کہاں سننے والی تھیں لہذا قہقہے بھی بدستور لگتے رہے اور تُلسی کے ساتھ میٹھی میٹھی شرارتیں اور چھیڑ چھاڑ بھی۔ تُلسی پہلے تو ہاں

ہوں کرتے ہوئے سہیلیوں سے جُڑی رہی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اُس کا مزاج چڑچڑا ہوتا گیا۔ سہیلیوں کا ہنسی مذاق تُلسی کو ایک آنکھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ صبح تک وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آج رات اِس اکیلے گھر میں فیاض کا اِس طرح آکر سونا ممکن بھی ہوسکتا ہے۔ کیا ہوا کہ وہ ڈیوڑھی میں تھا مگر تھا تو اِسی گھر میں۔ تُلسی سے اب برداشت نہیں ہو پا رہا تھا کہ کیسے اِن سہیلیوں سے جان چُھڑائے جو اپنے اپنے گھروں سے آج کی رات اُس کے ہاں گزارنے کی اجازت لے کر آئی ہوئی تھیں۔

رات کا پہلا پہر گزرا تو تُلسی کے دماغ میں ہونے والی اُلٹ پلٹ اور بے چینی بڑھتی چلی گئی۔ جب وہ بالکل ہی اَک تنگ ہوگئی تو سہیلیوں سے کہہ دیا کہ وہ اپنے اپنے گھروں کو جائیں، سب خیر ہے، اپنے گھر میں کس بات کا ڈر۔ نائنیں بھی ہیں اور باہر ڈیوڑھی میں جوان بھی سو رہا ہے۔ تُلسی کے بار بار کہنے کے باوجود لڑکیوں نے جاتے جاتے کم و بیش ایک گھنٹہ اور لگا دیا اور جب وہ جانے لگیں تو تُلسی اُنہیں رخصت کرنے کے بہانے فیاض کو دیکھنے کے لیے ڈیوڑھی تک آ گئی۔ لڑکیوں کی ہنسی جاتے ہوئے بھی تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ ڈیوڑھی سے گزر کر دروازے کی طرف جانے لگیں تو سویا ہوا فیاض اُٹھ کر تیزی سے دیوار کی جانب منہ کر کے کھڑا ہو گیا، اُس وقت تک کہ جب تک سبھی لڑکیاں دروازے سے باہر نہ گزر گئیں۔ تُلسی بھی دالان اور ڈیوڑھی کے درمیانی راستے میں ٹھہر گئی۔ اُس کا دِل ٹھاہ ٹھاہ کرتے ہوئے اِس طرح دھڑک رہا تھا کہ جیسے ابھی سینہ پھاڑ کر باہر آ گرے گا۔ اپنی منزل کو اتنا قریب دیکھ کر اُس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے اور بدن میں کہیں سنسناہٹ اور کہیں کپکپاہٹ ہونے لگی۔ اِس سے پہلے کہ وہ کچھ اور آگے بڑھتی، بوڑھی نائن نے پیچھے سے آواز دی کہ بی بی اندر آ جاؤ؛ شگن ہو جانے کے بعد ننگے سَر تاروں کی چھاؤں تلے کھڑے ہونا اچھا نہیں ہوتا، رَکھ ہوتی ہے۔ تُلسی کو لگا کہ کہیں دور سے آنے والی آواز نے اُس کی منزل کھوٹی کر دی ہے۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا تو بوڑھی نائن اُس کے سر پہ کھڑی تھی۔ وہ تُلسی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اندر کمرے کی جانب لے گئی۔

تُلسی کمرے میں تو چلی آئی مگر دل اس طرح دھاڑیں مار کر رونے کو چاہ رہا تھا کہ جیسے اُس سے اپنا آپ چھن چکا ہو۔ اک ہوک سی تھی کہ فیاض اپنے آپ ہی اُس کے کمرے میں کھنچا چلا آئے اور وہ اُس کے قدموں میں بیٹھ کر دل کا سبھی حال کھول سنائے۔ وہ سنائے کہ اُس نے کس طرح اُسے اپنے اندر کی عورت کا محبوب مانا ہے۔ وہ بتائے کہ عورت کا پیار ہوتا کیا ہے اور وہ پیار کرتی کسے ہے۔ وہ کہ جس کے ساتھ والدین اُسے زور زبردستی بیاہ دیتے ہیں یا وہ جسے وہ خود اپنے جسم اور اپنی روح کا حاکم مان لیتی ہے۔ یہ سوچ کر تُلسی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بوڑھی نائن نے تُلسی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو پریشان ہوگئی۔

''اماں.... اُداس نہ ہو، ہر لڑکی نے ایک ناں ایک دن پرائے گھر تو جانا ہی ہوتا ہے... ہاں اگر تم خوف محسوس کرو تو ہم دونوں یہیں سو جائیں تمہارے پاس''۔

''ناں ناں..... مجھے نہیں آتا خوف... میں اندر سے کنڈی لگا کر سو جاؤں گی اور تم بھی سو جاؤ ساتھ والے کمرے میں''.... تُلسی نے جلدی جلدی دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو صاف کر لیے۔

''اماں سوچ لو.... کل کو حکیم صاحب آ کر ناراض نہ ہوں.... ہم غریب عورتیں ہیں، کلیجہ کانپتا ہے تمہارے ابا سے''.... چھوٹی نائن ہاتھ باندھ کر اُس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''میں جو کہہ رہی ہوں..... نہیں لگتا مجھے ڈر اور ناں حکیم صاحب ناراض ہوں گے، جاؤ سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو''.... تُلسی پاؤں پٹخا کر غصے سے بولی تو وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئیں۔ تُلسی کا دل بھر آیا تو اُس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور پلنگ پر اوندھے منہ گر کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ رونا دکھ کے کارن ہے یا خوشی کے۔ وہ کتنے دنوں کے عذابوں اور کتنی راتوں کے جگاروں کے بعد آخر آج فیاض کو ملنے کے لیے جانے والی تھی۔

یہ خیال آتے ہی اُس نے جلدی جلدی اپنے بدن پر ملے ہوئے اُبٹن کو گیلے دوپٹے

سے صاف کیا اور کپڑے بدل کر منہ ماتھے کو آئینے میں دیکھنے لگی۔کئی دنوں سے سنورنے کے عمل سے گزرتی ہوئی تُلسی آئینے میں خود کو بھی اجنبی سی لگی ایسی دلہن کی مانند جس کے جسم کی اصل خوشبو دھیرے دھیرے اُس کے مسام مسام میں جگائی جارہی ہو۔مہندی، اُبٹن، عرق گلاب، بید مُشک کیوڑہ، ہلدی اور سیندور شگنوں میں بیٹھی دلہن کو کوئی نئی خوشبو عطا نہیں کرتے بلکہ جوان لڑکی کی اپنی خوشبو کو جگا دیتے ہیں۔وہ خوشبو جو جوانوں کو پہلے مست اور پھر باؤلا کر دیتی ہے۔وہ خوشبو جو ہاڑ کی شام کو چھوٹی سی بدلی کی ننھی ننھی بوندوں کے پیاسی زمین پر اُترنے اور چھڑکاؤ سے بیدار ہوتی ہے۔تُلسی نے بھی یہ خوشبو محسوس کرتے ہوئے آنکھیں بند کر کے ناک کے راہیں لمبی سی سانس لی اور پھر اِس کے ہونے کے یقین سے شرما کر رہ گئی۔آئینے سے آنکھ ملانا مشکل ہو رہا تھا۔یہ خوشبو کسی تخلیقی عمل کی دعوت تھی اُس خوشبو کی مانند جو زچہ کے بدن سے زچگی کے پانچویں یا چھٹے دن اُٹھنا شروع ہو جاتی ہے۔یہ وہ لمحہ ہوتا ہے کہ جب عورت وضعگی حمل کی ساری کلفتیں بھول کر پھر سے اپنے شوہر میں وہی کشش محسوس کرنے لگتی ہے کہ جو پہلی بار حمل ٹھہرنے پر محسوس ہوئی تھی۔ہر سال تکلیفیں سہہ کر بچہ پیدا کرنے والی عورتیں بھی اُس جوان کے صدقے واری جارہی ہوتی ہیں جو ہر سال ہی اُنہیں حاملہ ہونے پر لگائے رکھتا ہے۔یہ محبت کہیں اُس تخلیقی عمل میں بھرپور معاونت کی عطا ہوتی ہے کہ جو قدرت نے ہر جنس کی مادہ کو عطا کیا ہوا ہے۔کیا زوال ہے کہ ہم نے عورت کے اگلی نسل کو جنم دینے کے اِس فطری فریضے کو جنسی ہوس جیسا گھٹیا نام دے کر معتوب بنا رکھا ہے۔

تُلسی نے فیاض کے پاس جانے کے لیے کُنڈی کھول کر پاؤں دروازے سے باہر نکالنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے اُس کے دونوں پیر کئی کئی مَن وزنی ہو کر اِس طرح بھاری ہو گئے ہیں کہ اُٹھائے نہیں اُٹھتے۔اُس نے تنگ آ کر باہر کی سن گن لی تو نائنوں کا ہلکا سا ئبلا را محسوس ہوا۔تُلسی زِچ ہو کر پھر سے پلنگ پر گر گئی اور اُس کے پاؤں پھر سے ہلکے پھلکے۔رات کا دوسرا پہر رخصت ہونے لگا تو تُلسی نے ایک بار پھر باہر جھانکا۔کوئی آواز ایسی نہ تھی کہ جسے آواز کہا جا سکتا۔وہ کُنڈی کھول کر ہولے ہولے پاؤں اُٹھاتی کمرے سے باہر نکلی مگر پاؤں اب بھی بھاری بوجھ۔

اُٹھانے کو جی نہیں آ رہے تھے۔ تُلسی کے لیے یہ موقع زندگی کا آخری موقع تھا کہ جس کے سبب وہ اپنے وجود کے اپنا ہونے کا ثبوت دے سکتی تھی ورنہ کون جانتا تھا کہ اُس کا یہ جسم دو دنوں کے بعد کس کس کی مقبوضگی میں ہوگا۔ تُلسی سے پاؤں نہ اُٹھائے گئے تو اُس نے پیروں کو ڈیوڑھی کی جانب گھسیٹنا شروع کر دیا۔ چاروں طرف کسی کے سانس لینے تک کی صدا بھی نہیں تھی مگر پھر بھی اُس کے لیے کمرے سے ڈیوڑھی تک کا تین چار پائیوں کا فاصلہ صدیوں کا فاصلہ ہو کر رہ گیا۔ تُلسی کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کے الاؤ اور دھونی کی طرح دُکھتی ہوئی سانس کے باوجود اُس کا بدن باہر سے برف کی طرح سرد اور جیٹھ کے آخری دنوں کی گرمی میں بھی سردی سے کپکپاتا ہوا۔ پھر بھی وہ لڑکی کسی نا کسی طور ڈیوڑھی تک پہنچ ہی گئی کہ جہاں فیاض بالکل بے سُدھ، بے سُرت سویا ہوا تھا۔

تُلسی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے، کیا کہہ کر جگائے فیاض کو۔ کیا اُسے خبر ہوگی کہ یہ لڑکی اپنا سب کچھ اُس پر نچھاور کر بیٹھی ہے اور اب محض اِس ایک پہر رات کے وصال کی اَرواسی ہے۔ کیا اُس کے ساتھ جا کر پہلو در پہلو ہو جائے یا اُس کے بنیان میں چھپے ہوئے سینے کو جی بھر کر چومتی رہے۔ اِسی کشمکش میں وہ دو تین قدم بڑھا کر اُس کے سر کی جانب جا کھڑی ہوئی اور غیر اضطراری طور پر اپنے کانپتے ہوئے دائیں ہاتھ کو فیاض کے گھنگریالے بالوں میں پھیرنے کی کوشش کی جو آپس میں بری طرح اُلجھے ہوئے تھے۔ کہیں بال کھنچیں اور وہ جاگ نہ جائے۔ تُلسی نے ہاتھ اُٹھا لیا۔ حالانکہ چاہ رہی تھی کہ فیاض جاگ جائے۔ وہ اُس کے ایک طرف ہو کر چار پائی پر بیٹھنے لگی تو کڑاکے کی آواز آئی۔ شاید چار پائی کمزور تھی لہٰذا وہ بیٹھنے کی بجائے اُٹھ کھڑی ہوئی ۔فیاض نے کروٹ بدلی تو تُلسی پاؤں کی جانب پلٹ آئی۔ ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی اُسے جگانے یا اُس کے ساتھ بیٹھنے کی۔ اُتاوِل یہ بھی تھی کہ رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا اور ساتھ ہی یہ خوف بدستور دامن گیر کہ نائیوں میں سے کوئی جاگ کر اِدھر آ گئی تو کیا ہوگا؟

آخر کار جب ہمت جواب دے گئی تو تُلسی نے فیاض کی پائنتی کی جانب پکّے فرش پر بیٹھ کر دونوں ہاتھ اُس کے دونوں پیروں پر رکھ دیے۔ فیاض کی آنکھ نہ کھلی تو تُلسی نے پاگلوں کی

طرح اُس کے پاؤں چومنے شروع کر دیے۔ فیاض اب بھی گہری نیند میں تھا۔ تُلسی پاؤں چوم چوم کر تھکی تو منہ اُس کے پیروں پر رکھ دیا۔ مایوسی حد سے بڑھی تو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

فیاض کے پیروں پر گرم گرم پانی کے نکڑے نکڑے قطرے گرے تو اُسے نیند میں کسی کے ہونے کا احساس ہوا۔ اُس نے پاؤں کو غیر شعوری طور پر اوپر کی طرف کھینچا تو یوں لگا کہ جیسے اُس کے پیر کسی کے نرم ہاتھوں کی گرفت میں ہیں۔ وہ جاگ تو چکا تھا لیکن چپ سادھے پڑا رہا۔ فیاض کا ذہن تیزی سے گو یڑ کر رہا تھا کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔ جو بھی ہے کوئی سجن ہے دشمن نہیں ہو سکتا۔ گھر میں تو صرف تین عورتیں ہیں، دو نائنیں اور تیسری تُلسی۔ اِتنے نرم ہاتھ نائنوں کے نہیں ہو سکتے تو کیا یہ تُلسی ہے۔ لیکن تُلسی کیونکر ہو سکتی ہے، اُس کی تو دو دنوں کے بعد شادی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تُلسی بی بی کی سہیلیوں میں سے کوئی یہاں رہ گئی ہو۔ اِسی سوچ میں اُلجھے ہوئے فیاض نے اپنے پاؤں اوپری جانب کھسکائے مگر نرم ہاتھوں کی گرفت اتنی بھی نرم نہیں تھی۔ اب اِتنا تو فیاض کو یقین بھی ہو گیا کہ یہ لڑکی جو بھی ہے، چاہتی یہی ہے کہ وہ جاگ جائے۔ لیکن جاگنے کے بعد کیا ہو گا، اِس کے امکانات کے بارے میں فیاض بھی اتنا بھولا نہیں تھا۔ شش و پنج اور اُلجھن تھی تو بس اتنی کہ وہ اُٹھ بیٹھے یا یونہی چُپ کر کے لیٹا رہے۔

عجیب گرداب میں آ گیا تھا فیاض بھی۔ اُٹھ بیٹھے تو نمک حرامی اور سویا رہے تو اپنے اندر کے مرد سے شرمسار۔ کیا جواب دے اُس کو جو پہلے ہی اُس کی شرم حیا کے سبب طعنہ زنی کا شکار تھا۔ حیلہ بہانہ چاہے جو بھی تھا مگر حق بات تو یہ تھی کہ تُلسی پہلے دن سے ہی کسی کانٹے کی طرح اُس کے دل میں چبھی ہوئی تھی؛ بھولی نہیں تھی۔ اگر یہ لڑکی تُلسی ہے اور خود ہی اُس کے پیروں میں آن بیٹھی ہے تو پھر ایک بلوچ کو اُٹھ بیٹھنا ہی جچتا ہے، سونا نہیں اِس لیے کہ کل کس نے دیکھی ہے۔ لیکن اِس کے متوازی ایک اور گرہ بھی فیاض کے ذہن میں ایسی پڑی کہ کھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ یہ گرہ تھی حکیم صاحب کے اعتبار کی۔ اگر وہ اُٹھ بیٹھا تو لعنت ملامت اکیلے اُسی پر نہیں ہو گی،

پوری بلوچ قوم پر ہوگی۔

اِس دوران لڑکی کے نرم وگداز ہاتھوں کا حدت آمیز لمس اُس کے پیروں سے ہوتا ہوا پورے بدن میں پھیلنا شروع ہو گیا۔ مستی کی ایک راند تھی جسے آخری کھیل بنانے کے لیے فیاض کے ثبوتے جسم کا ایک ایک ریشہ اپنے اپنے مقام پر دھرتال مچانے کو اُتاولا ہو رہا تھا۔ فیاض نے بہت کوشش کی کہ اُس کے ہوش وحواس اُس کا ساتھ نہ چھوڑیں مگر آنکھوں کے سامنے آنے والے شیشوں کو کچھ دیر اور رو کے رہنا اُس کے بس میں نہ رہ گیا۔ نہ فیاض کو پتا کہ وہ کون ہے اور نہ یہ کہ وہ کہاں ہے۔ آخری احساس یہی تھا کہ ایک گداز اور کچھ کچھ ماسلی دوشیزہ اُس کی جانب مُڑ مُڑ کر دیکھتی، اپنے پیچھے پیچھے آنے کے اشارے کرتی، ڈیوڑھی سے گھر کے دالان کی طرف دوڑ رہی ہے۔ فیاض زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا اور اُس کے اشاروں کے جواب میں اُس کے پیچھے پیچھے بچھڑا ہوتا چلا گیا۔ ابھی وہ آٹھ دس قدم ہی آگے گیا ہو گا کہ اُس کے آگے دوڑتی لڑکی ایکدم ٹھوکر کھا کر اُس کی بانہوں میں جھول گئی۔ ریشم کا کوئی بچھونا تھا یا کوئی چھوٹا سا تنگا کہ جس کی ماسلی نَرماہٹ نے فیاض کے اندر کی اُتاوِل کو مزید بیتاب اور بے ربط کر دیا۔ کمالِ بیتابی میں اُس نے اِس چَسولے وجود کو بانہوں پر اُٹھا کر اپنی گرفت میں لے لیا۔ ساری کی ساری نرماہٹ کسی آتش میں بدل گئی تھی، ایسی آتش جس میں جھلسے جانے کا مزہ دنیا کے سبھی مزوں سے برتر اور بڑھیا۔

اِس سے پہلے کہ یہ آتش اُس کے وجود کو راکھ کرتی اُس کے اندر اپنے ہونے کا احساس کہیں نئے سِرے سے جاگنے لگا۔ سُرت محسوسات میں دخیل ہوئی تو معلوم ہوا کہ نرم آتش کا احساس اُس حسینہ کا اپنی حدت میں تپا ہوا نرم نرم جسم تھا جو اُس کی پائنتی کی جانب سے چارپائی کے وسط تک آ کر مکمل سپردگی کی حالت میں سراپا دعوت تھا۔ یہ تو واقعی تُلسی تھی۔ فیاض بوکھلا کر ایک طرف ہو گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو ٹٹولا۔ ابھی تک کچھ ایسا نہیں تھا کہ جس کے سبب اُس کی پیشانی نمک حرامی کی سلاخ سے داغی جاتی۔ اِس سے پہلے کہ وہ چارپائی سے اُترتا، اُس کی نگاہ تُلسی کے چہرے پر پڑی اور پھر چہرے سے پاؤں تلک پھسلتی چلی گئی۔ شاید ہاڑ کے مہینے میں بھی روہی اتنی

پیاسی نہیں ہوتی ہوگی کہ جتنی پیاسی تُلسی دکھائی دے رہی تھی۔ بالکل بے سُدھ اور بے چنتی جیسے کوئی لمبی تھکاوٹ کا مارا ہوا مسافر منزل پر پہنچ کر یکدم بے حال ہو کر گر جاتا ہے۔ سبھی فِکرات اور اندیشوں سے ماورا۔ بس دو بوند پانی کی تمنا کہ زندگی کی جُرات پھر سے کہیں زندگی سے ہو جائے۔

فیاض نے اِس سے زیادہ کسی لڑکی کو کسی اجنبی مرد کے لیے اپنے آپ کو دان کرتا ہوا نہ تو سنا تھا اور نہ ہی دیکھا۔ اِس کے پیچھے رمز کیا تھی اور راز کیا تھا، وہ اُس سے قطعی نا آشنا۔ کیا تُلسی کسی کارَن غلط فہمی کا شکار ہو رہی تھی یا پھر یہ شادی ناپسندیدہ تھی؟ اگر یہ شادی ناپسندیدہ بھی تھی تو پھر اُس پر ہی یہ مہربانی کیوں؟ اِس اُلجھاؤ کے سبب وہ سبھی جنون ہوا ہو گیا جو کچھ لمحے پہلے اُس کا مَنکا جھکائے ہوا تھا۔ فیاض نے تُلسی کے چہرے پر کھلری ہوئی زلفوں کو ہٹا کر اُس کے تاثرات سے کچھ جاننے کی کوشش کی مگر اُسے لگا کہ اِس طرح تو وہ اُس کی صورت کا اور بھی اَسیر ہوتا جا رہا ہے ۔ اِس سے پہلے کہ فیاض اپنا ہاتھ تُلسی کے بالوں سے ایک طرف کر لیتا، ہوش و حواس سے بیگانہ تُلسی نے نیم باز آنکھوں سے فیاض کو دیکھا اور مُسکرا کر دھیرے سے اُس کے بالوں میں رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ اِس طرح رکھ دیا کہ وہ اُٹھا ناں سکے۔ فیاض نے ایک بار پھر تُلسی کو آنکھ بھر دیکھا۔ اُس کی آنکھیں تو موندی ہوئی تھیں مگر چہرے کی مسکان کچھ اور گہری ہو چکی تھی۔ فیاض نے دیکھا کہ تُلسی کی دودھیا گردن میں موٹے موٹے سُرخ موتیوں کی دوہری مالا تیز تیز چلتی ہوئی سانس کے ساتھ اوپر نیچے ہوتی ہوئی مدوجزر کا سا سماں لگ رہی تھی۔ فیاض نے اُس کے بالوں میں سے ہاتھ چھڑا کر اُس کی گردن پر رکھ دیا۔ فیاض کا ہاتھ تُلسی کی گردن سے کیا مَس ہوا، زور کی کپکپاہٹ اُس کے پورے بدن میں سَر سے پاؤں تلک تھرتھلی مچاتی ہوئی گزر گئی۔ تُلسی لیٹے لیٹے سوئے سوئے، چارپائی پر بیٹھے فیاض سے ایکدم لپٹ گئی۔

جتنی تیزی سے تُلسی فیاض سے چمٹی، اُس سے دُگنی سرعت سے فیاض، تُلسی کی گرفت سے نکلا اور ٹاپ کر فرش پر کھڑا ہو گیا۔ تُلسی سمجھ ہی نہ پائی کہ ہوا کیا ہے۔ اُس کے تئیں کوئی نائن اُٹھ کر آ گئی تھی مگر جب ادھر اُدھر کوئی دکھائی نہ دیا تو سمجھ گئی کہ فیاض دامن چھڑا کر ایک طرف ہو

چکا ہے۔ اندھیرا تو تھا مگر اتنا بھی نہ تھا کہ وہ فیاض کے رویے کی اجنبیت کو محسوس نہ کر سکے جس کی وجہ بظاہر اُس کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ ایک بار پھر لپکی اور نیچے اُترتے ہوئے فیاض کا ہاتھ پکڑ کر اُسے چارپائی کی جانب کھینچنے لگی لیکن فیاض نے نامناسب سختی کے ساتھ ہاتھ چھڑا لیا۔ ٹُلسی کا خیال تھا کہ فیاض مذاق کر رہا ہوگا کیونکہ کوئی بھی مرد اِس حالت میں تو اِس قسم کا سلوک نہیں کر سکتا۔ وہ پھر سے اُٹھی اور دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑے ہوئے فیاض کے گلے میں بانہیں ڈال کر والہانہ انداز میں اُس کے سینے سے چمٹ گئی۔

فیاض بھی شاید ہوش وحواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں کی قوت سے سینے سے چمٹی ٹُلسی کو اپنے آپ سے علیحدہ کیا اور اِس طرح چارپائی پر دھکیلا کہ جیسے کسی طفیلی جونک کو بدن سے ہٹانے کے بعد دور پھینکا جاتا ہے۔ ٹُلسی چارپائی پر جا گری تو احساس ہوا کہ یہ تو کچھ اور ہو گیا ہے کہ جسے ذلت کی انتہا کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ کیا یہ تھا وہ نوجوان کہ جس کے واسطے اُس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رکھا تھا؟ اتنا بدلحاظ اور بدتہذیب کہ جس سے زیادہ مہذب تو جنگل کے جانگلی ہوا کرتے ہوں گے۔ یہ کہاں سے ہو گیا میرے عورت ہونے کی گواہی دینے کے لائق؟ یہ تو مَرد ہی نہیں تو مَرد بَن کر کیا دکھائے گا؟ یہ سوچتے ہوئے ٹُلسی ایک بار پھر اُٹھی اور فیاض کے سنبھلنے سے پہلے ہی اُس کے منہ پر تین چار تھپڑ جَڑ دیے۔

اب بوکھلانے کی باری فیاض کی تھی۔ غصے سے پھنکارتی ٹُلسی کو گھر کے اندر جاتا دیکھ کر اُسے اور تو کچھ سجھائی نہ دیا بس ڈیوڑھی والا دروازہ کھول کر گھر سے باہر نِکل گیا۔ دور کسی مسجد سے صبح کی اذان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

(17)

مہراں مڑ پیچی والے بھوپے کے اَستان پر ،جن کھیل کر کیا آئی ،اُس کی چال ڈھال اُور رو یہ مزاج سبھی تبدیل ہو کر رہ گئے ۔کہاں وہ چِڑ چِڑی اور جھگڑالو لڑکی اور کہاں یہ ہنستی مسکراتی مست اندام شہتوت کی نرم شاخ کی طرح ٹھمک ٹھمک چلتی دوشیزہ ۔جن تو اُتر گیا تھا مگر وہ پھر بھی گھر کے کام کاج سے قطعی لاتعلق اِس لیے کہ نخرے اُٹھانے کو ساس جو موجود تھی ۔جن اُترا تو وادھو کا مزاج بھی بَدل گیا۔ ہر وقت جلتا بھنتا جوان اب اپنی بیوی کو دیکھ دیکھ خوش رہنے لگا تھا لیکن کھیل ہوئی بیوی نے اُسے اپنے نزدیک آنے دینے کی بجائے ایک اور چال چلی ۔وادھو جونہی اُس کے قرب کی خواہش میں آگے پیچھے آنٹے لگانا شروع کرتا ،مہراں اُسے دیکھ دیکھ کر آنکھیں مُچکانا شروع کر دیتی کہ جیسے چیلنج کر رہی ہو ''آ.... اَب آناں، میں بھی دیکھوں بڑے طُرم خاں کو، بہت شوق تھا ناں تجھے باپ بننے کا''۔

اپنی بیوی کا یہ چُپ چپیتا پیغام وادھو سمجھتا تھا یا پھر مہراں خود، تبھی تو وہ شرمندہ ہو کر دُکان کی طرف نکل جاتا اور سارا غصہ اِدھر اُدھر یار دوستوں پر نکالتا رہتا۔ وادھو کی زِچکائی دیکھ کر گاموں جیسے یار بیلی اُس کے ساتھ حال حویلا کرنے آن بیٹھتے تو وہ خود اُٹھ کر بازار والی مسجد چلا

جاتا اور شکرانے کے نفل پڑھنے کے لیے نیت باندھ لیتا کہ اُس کی بیوی کو شفا ملی بھی تو آخر کار بھوپے کے اَستان سے ملی اور شکر کہ اِس کافر حکیم کو نہیں دکھانا پڑا۔ رَب کرے گا کہ اب بال بچہ بھی ہو جائے گا۔ گھر والوں کے ساتھ ساتھ بازار والوں پر اپنی معتبری کی دھاک بٹھانے کے لیے اُس نے مسجد کی اِنتظامی کمیٹی کا ممبر بننے کے علاوہ چندہ اِکٹھا کرنے سے لے کر امام صاحب کی تنخواہ تک کے معاملات میں بھی دخل دینا شروع کر دیا۔ معاملات کچھ اور آگے بڑھے تو پہلے گول ٹوپی سَر پر آئی اور پھر اُس کے اوپر سفید ململ کا صافا بھی لپیٹ لیا گیا۔ مگر اِس کے باوجود اُس کے دل میں گھر کیا ہوا مہراں کی آنکھوں کا عجیب سا خوف نہ نِکل سکا کہ جو اُسے دیکھتے ہی آوازہ کسنے کے انداز میں مُچکنے لگ جاتی تھیں۔

مہینہ گزرا تو بھاگ بھری نے وادھو کو مہراں کا پاؤں بھاری ہونے کی خوشخبری سُنائی۔ خوشی سے وادھو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر جب مہراں کی آنکھوں کو پہلے سے بھی زیادہ مُچکتا ہوا دیکھا تو گھبرا کر جلدی سے باہر جانے لگا لیکن بھاگ بھری تقریباً دوڑتے ہوئے اُس کے سامنے آ گئی۔

''پُتر تجھے پیدا تو شرم حضور کے وقت کیا تھا مگر اب تو یوں لگتا ہے کہ جیسے مجھ سے کچھ بھول ہو گئی تھی۔ وہ کوئی اور دن تھا۔ شرم حیا والے دن تو تو پیدا ہی نہیں ہوا''......

وادھو سوالیہ نشان بَن کر وہیں ٹھہر گیا۔

''بچہ... جیویں ہوویں..... شریکوں کو نہ بھی بتائیں تو پتا لگ ہی جائے گا۔ ویسے بھی خوشی کا موقع ہے ہم کیوں چھپائیں۔ میں تو تھال تقسیم کروں گی بتاشوں کا، لاچی دانوں کا اور جلیبیوں کا۔ مگر جوڑا کپڑوں کا اور سوا روپے کی موکھ.... وہ تو دے گا.... اگلے منگل چلیں گے بھوپے کے اَستان پر شُکرانے کی سوائی دینے کے لیے۔ کیسے اُس نے ہماری گود ہری کر دی ہے اولاد کے ساتھ، اب میں بے وارثی نہیں اور ناں ہی تو بے وارثا ہے۔ رَنگ لگ گئے ہیں میرے جُھگے کو۔''

''ٹھیک ہے اماں جیسے تمہاری مرضی''۔ وادھو نے برامدے کی جانب مڑ کر دیکھا۔ مہراں اُس کی طرف کروٹ لے کر چارپائی پر اس طرح لیٹی ہوئی تھی کہ اُس کی ایک ٹانگ نیچے کو لٹکی ہوئی تھی۔ یونہی اُچکتے ہوئے وادھو کی نگاہ اُس کی آنکھوں کی طرف اُٹھی تو وہاں وہی نوک بازی کی چبھتی ہوئی سویاں اور منہ چڑانے والی مُچکان: جیسے اُکسا رہی ہو کہ تو ہے کہاں، ذرا قریب تو آ۔

''آ.... اب ہاتھ اُٹھا مجھ پر..... اُٹھا ناں ہاتھ جوان خان۔ تو جائے گا کہاں اب گھر سے بھاگ کر۔ جس طرح تمہارا گلا میں نے اب گھونٹنا ہے، ذرا چھڑوا کر دکھانا تو مانوں گی۔ بڑا آیا بچے کا باپ۔''

وادھو کو دیکھتے ہوئے مہراں نے زور سے کھنگورا مارا اور پھر اُسی زور سے زمین پر تھوک دیا مگر نجانے کیوں وادھو کو یوں لگا کہ تھوک سیدھی اُس کے منہ پر پڑی ہے۔ وہ بے دھیانی میں ایک ہاتھ سے اپنے گال کو پونچھتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

(18)

جو شب تُلسی اور فیاض پر بھاری گزری وہ شب ریاست بہاول پور میں بھی مختلف مذاہب کے مابین بھائی چارے اور اَمن امان کی آخری شب ثابت ہوئی۔ بھگوان داس کی اَرتھی بھلے اَدھ رات کو اُٹھائی گئی مگر انتہائی نازک حالات میں بھی کسی ناں کسی طور شرارت ہو کر رہی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بہاول پور کا سخت حکم تھا کہ کسی طرف سے بھی مذہبی منافرت کی بات نہ ہو مگر ایک صوبیدار اور چار سپاہیوں کی نفری کی نگرانی کے باوجود کسی نے بھڑکا لگا دیا کہ ہندو اپنے مُردے جلانے کے بعد اُن کی چٹکی بھر راکھ تمام مسجدوں کے دروازوں کے سامنے بکھیر جاتے ہیں۔ اِس شوشنی کے باعث پہلا ردِ عمل تو یہ ہوا کہ مَڑھی کے راستے میں پڑنے والے مدرسوں کے طالب علموں نے بڑے بڑے ڈھینگر اُٹھا کر گزرگاہ پر رکھ دیے کہ کوئی یہاں سے گزر ہی نہ سکے۔ ڈھینگروں کے آگے کیکر کے کٹے ہوئے بڑے بڑے تنے اور تنوں کے آگے کانٹوں دار بکھڑے کے جھانبے اِس طرح جوڑ رکھے کہ پوری کی پوری گزرگاہ بند ہو کر رہ گئی۔

اِس سے پہلے کہ کوئی پھا کا ہوتا، صوبیدار نے منت ترلا کرتے ہوئے اَرتھی کو واپس مُڑوا کر دوسرے راستے سے مَڑھی پہنچا دیا۔ مگر وہاں پھر سے احمد پور والی صورت حال کہ کسی نے نزدیکی

مائنر ٹڑوا کر پورے ایکڑ میں گٹے گٹے پانی چھوڑ رکھا تھا۔ ایک بار پھر ارتھی کو قریبی میدان میں رکھ کر نئے سرے سے خشک لکڑیاں منگوانے کا جتن کیا گیا۔ لکڑیاں آ رہیں تو کسی نے دو تین مُشکی سانپ ارتھی کے اطراف چھڑوا دیے یا وہ خود ہی کہیں سے نکل آئے، کچھ پتا نہ چلا۔ ابھی بھگوان داس کی ارتھی کو آگ دکھائی ہی نہ گئی تھی کہ بہاول پور شہر میں ہندوؤں کے مکانات کو آگ لگائے جانے کی خبر اُڑا دی گئی۔ گرم افواہوں میں یہ افواہ بھی شامل کہ آج بہاول پور تو کل احمد پور کی باری ہے۔

اِس خبر کے سنتے ہی کریا کرم میں موجود سبھی لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی کہ کسی طرح اپنے اپنے گھروں اور گھر والوں کو بچانے کا جتن کر لیں۔ اِس ہائے ہائے کار میں بے چارے بھگوان داس کا کریا کرم رُل کے رہ گیا۔ گھروں کی طرف دوڑتے بزرگوں نے چار پانچ لڑکوں کو پنڈت کے ساتھ کھڑا کر کے کہہ دیا کہ وہ بھی فارغ ہو لیں تو گھروں کو پہنچیں۔ مگر جب یہ سبھی لوگ روتے پیٹتے گھروں کو لوٹے تو وہاں کچھ بھی اُن کے خدشات کے مطابق نہیں تھا۔ ہر طرف امن و امان کہی جانے والی خاموشی۔ کسی نے جھوٹی خبر اُڑا کر ساری ہندو آبادی کو مضطرب کر دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود حکیم رام لعل اور رادھی کو کسی کل چین نہیں تھا کہ یہ جھوٹی خبر کہیں احمد پور کے بارے میں سچ ثابت ہو گئی تو اُن کی بیٹی تُلسی کا کیا بنے گا جس کی رکھوالی کے واسطے وہ ایک مُسلے کو گھر بٹھا آئے تھے۔ اِس سارے رُولے گھولے میں سوڈھی بھی ڈھیرا اُتاولا کہ جتنا جلدی ہو سکے تُلسی دلہن بن کر اُس کے آنگن کو مہکا دے، روشن کر دے۔

لاری اڈے سے احمد پور والی بس کا معلوم کیا گیا تو پتا چلا کہ پہلی بس سویرے سورج نکلے جائے گی۔ مگر پھر بھی احمد پور سے آئے ہوئے یہ سارے برادری وال رات کے آخری پہر اڈے پر آ کے بیٹھ رہے۔ سویرے بس چلی تو چھت کے اوپر بھی سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ حکیم رام لعل، رادھی اور سوڈھی مَل کو بس کے اندر جگہ مِل تو گئی مگر آخری سیٹ پر۔ سفر کے دوران ٹِپاں لگنا اتنا مسئلہ نہ تھا کہ جتنا وہ خبریں برداشت کرنا جو ہر آنے والے اسٹاپ پر سننے کو مل رہی تھیں۔ خانقاہ شریف کے اسٹاپ پر معلوم ہوا کہ سویرے سویرے نماز سے پہلے احمد پور میں ہندوؤں کے گھروں کو

آگ لگا دی گئی ہے مگر جب بس مسافر خانے کے اسٹاپ پر رُکی تو پتا چلا کہ یہ خبر قطعی جھوٹ تھی۔ بس کسی انہونی کے خدشات اور خبروں کے عذاب میں سے گزرتے ہوئے تین گھنٹے کے سفر کے بعد یہ سب لوگ احمد پور پہنچے تو معلوم ہوا کہ سب خیر ہے۔ نواب صاحب نے ہر محلے میں اس طرح سے نگرانی کا بندوبست کرایا ہوا تھا کہ کسی لنڈے لٹور کو پر مارنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ لیکن اِس کے باوجود نہ تو کسی کو یقین تھا اور نہ ہی کسی کو اطمینان۔ ہر کوئی اِسی خوف میں کہ کیا خبر کب کیا ہو جائے!

حکیم رام لعل اور اُس کی بیوی گھر پہنچے تو تُلسی دن چڑھے بھی سوئی ہوئی تھی۔ نائنیں گھر کے کام کاج سے فراغت کے بعد دالان میں بیٹھی ایک دوسرے کی جوئیں نکال رہی تھیں جب کہ فیاض صبح سویرے مطب جا چکا تھا۔ والدین کو دیکھ کر تُلسی اُٹھ تو بیٹھی مگر بالکل ہی پیلی زرد، بدن میں جان نہ کسی جانب دھیان۔ حکیم صاحب سمجھ گئے کہ بیٹی کو ماں باپ کے گھر سے بچھڑنے کا احساس اب ہو رہا ہے جب کہ رادھی جانتی تھی کہ ہر عورت کو رخصتی کے وقت وہ سبھی خواب ٹوٹتے ہوئے محسوس ہونے لگتے ہیں جن کی مَن پسند تعبیر دیکھنے کی خاطر اُنہوں نے زندگی کو داؤ پر لگا رکھا ہوتا ہے۔ ایسے خواب نہ تو کسی کو بتائے جاتے ہیں اور نہ ہی اُن کے آدھے ادھورے رہ جانے کا دکھ کسی سے سانجھا کیا جا سکتا ہے۔ اِس طرح عورت کی شادی کے بعد کی پوری زندگی اِس دکھ میں سے نکلنے کی کوشش میں گزرتی ہے مگر نِکل نہیں سکتی۔

حکیم صاحب نے مطب تو کیا جانا تھا، کچھ سکون ملا تو برامدے میں پڑے ہوئے مُوڑھے پر بیٹھا بیٹھا اونگھنے لگا۔ اتنے میں ہمسائے میں سے تُلسی کی سہیلیاں آئیں اور گھر میں پھر سے رونق ہوگئی۔ حکیم صاحب نے نِکی نائن کو حقہ تازہ کرنے کے لیے کہا اور خود موڑھے کے ساتھ پڑی چارپائی پر ٹانگیں پھیلا کر اِس طرح لیٹ گیا کہ لگتا تھا اُٹھ کر بیٹھا ہوا ہے۔ دلہن کے کمرے میں لڑکیوں کا اکٹھ ہوا تو مرگ کی بندش کے باوجود دبی دبی آواز میں رخصتی کے سہرے سنائی دینے لگے کہ جن کے پس منظر میں کسی کسی وقت ڈھولک کی آواز بھی اپنی پہچان کرانے پر مضطرب سنائی

دینے لگتی تھی جب کہ رادھی گذشتہ شب کے اضطراب اور تھکاوٹ سے اتنی اُکتائی ہوئی تھی کہ برامدے کے دوسری جانب جا کر سوگئی۔

حکیم صاحب نے ابھی حقے کے دو چار کش ہی لگائے ہوں گے کہ سوڈھی مَل وشنو کے ہمراہ گھبرایا ہوا گھر میں داخل ہوا اور آتے ہی حکیم رام لعل کے کان میں اِس طرح کچھ کہا کہ خود حکیم کو بھی سمجھ نہ آئی۔ ''کیا کہا..... خیریت تو ہے۔''

''خیریت ہی تو نہیں.... ''سوڈھی پھر آہستہ سے بولا۔

''کیا خیریت نہیں...... ''حکیم بھی گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

''آج رات کو مڑھی، نِکی بازار، محلّہ پُھلو رام اور کٹڑہ احمد خان میں ہندوؤں کے گھروں کو آگ لگانے کا پروگرام بَن چکا ہے.... ''سوڈھی مَل نے ایک بار پھر ہولے ہولے اُس کے کان میں کھسر پھسر کی۔

''مگر تجھے کس نے کہا ہے...... ''حکیم پریشان ہو کر کھڑا ہوا اور پھر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

''ایک پُلسیا میرا دوست ہے صوبے دار محمد نواز خان۔ تمہارے پاس بھی آتا رہتا ہے دوا دارو کے لیے.....''

''وہ مونچھوں والا؟.....''

''جی..... وہی... اُس نے یہ پیغام خاص طور پر لالہ تمہارے لیے دیا ہے کہ حالات کا کچھ پتا نہیں، اپنی جان آپ بچاؤ۔ شہر میں پُلس کی نفری اتنی نہیں کہ ہر جگہ فساد کو روک سکے۔'' بات کرتے ہوئے سوڈھی کا حلق پریشانی کے سبب بار بار خشک ہو رہا تھا۔ حکیم رام لعل سَر پکڑ کر موڑھے پر بیٹھ گیا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کیا جائے۔ ہر وقت نئی خبر اور ہر خبر کے ساتھ بے یقینی اور خوف کا نیا عذاب۔

''لالہ! میں تو یہی کہوں گا کہ آج شام سے پہلے تُلسی اور وِشنو کے پھیرے کرا کر کسی

طرف نکل چلیں۔'' سوڈھی مَل اپنے تئیں بہت سیانا بن کر اُس کے سامنے چار پائی پر بیٹھ گیا۔

''ووے لَلن آ...... مجھے یہ فکر کہ جان بچا کر جائیں کہاں اور تم کہتے ہو پھیرے کرا لوں اس دوسرے چھوٹے لَلن کے''۔ کبھی غصے میں نہ آنے والا حکیم رام لعل بھی سوڈھی کی بات پر جھنجھلا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ حکیم کو طیش میں آتا دیکھ کر سوڈھی تو دبک کر بیٹھ گیا جب کہ وِشنو بھی ڈر کر برامدے کے ستون کے پیچھے چھپ گیا۔

حکیم کے اُونچا بولنے سے برامدے کی نکڑ پر بیٹھیاں نائنیں بھی اُٹھ کر پچھواڑے کی جناب کھسک گئیں اور نیند بھری آنکھوں والی رادھی بھی جاگ کر سوڈھی کے ساتھ کھڑی ہو کر شکن آلود پیشانی لیے حکیم کی سمت یوں دیکھنے لگی کہ جیسے پوچھ رہی ہو مسئلہ کیا ہے؟ رام لعل نے بیوی کو سب کہہ سنایا تو اُس کا چہرہ بھی پیلا پڑ گیا۔ سُتے ہوئے انداز میں بے جان ہو کر وہ سوڈھی کے ساتھ ہی چار پائی پر پائنتی کی جانب بیٹھ گئی۔ اِس حالت میں آنکھوں کا آنسوؤں سے ڈبڈبا جانا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ہر ایک کے چہرے پر ایک ہی سوال کہ کیا کریں اور کہاں جائیں؟

حکیم رام لعل نے اپنی حکمت کی تشخیصی ہنر مندی سے کام لیتے ہوئے زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہ کی اور سب سے پہلے تُلسی کی شادی کو موخر کرتے ہوئے کسی مناسب وقت پر کرنے کا واضح اعلان کر دیا۔ یہ سنتے ہی بظاہر تو سوڈھی کا صرف چہرہ لٹکا مگر اندرو اندری وہ چِت جا گرا جب کہ رادھی بظاہر پریشان دکھتے ہوئے بھی اندر خانے خوش تھی۔ اِس صورتحال میں بھلے اُس کی جیت نہ تھی مگر سوڈھی کی ہار ضرور تھی جو تُلسی کو گھر لے جانے کے واسطے کب کا لنگوٹ کس کر بیٹھا ہوا تھا۔ باقی رہا وہ نکڑا لَلن وِشنو تو اُس کا کیا تھا، وہ تو ستون کے پیچھے چھپ کر آسمان پر اُڑتے ہوئے کبوتروں کو تاڑے ہوئے تھا، اِس سے بے خبر کہ زمین پر دانہ کس نے بکھیر رکھا ہے اور ڈُز کا کس کے ہاتھ میں ہے۔

دوسرا فیصلہ حکیم رام لعل نے یہ کیا کہ سوائے کچھ قیمتی اشیاء کے باقی سب کچھ یہیں گھر میں فیاض کی رکھوالی میں رکھا رہے گا اور گھر کے سبھی افراد حالات ٹھیک ہونے تک ڈیرہ نواب جا

کر اُس کے مطب کے عقب میں بنے ہوئے گودام سے ملحقہ دو کمروں میں رہ لیں۔ حکیم رام لعل کو پورا یقین تھا کہ فسادات کی اِن باتوں کے پیچھے ضرور پیری بدمعاش جیسے لوگوں کا ہاتھ ہے ورنہ ریاستی مسلمان تو ایسی کسی بات کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے جہاں صدیوں سے سبھی اقلیتیں اُن کے پیار محبت کے کارن ایک مُٹھ ہو کر بسرام کرتی آ رہی تھیں۔ حکیم کو صوبیدار محمد نواز کی مخبری پر بھی کچھ زیادہ اعتبار نہیں تھا۔ ہے تو انجام کار پلسیا۔ ہو سکتا ہے کہ اُس کی راند پیری بدمعاش جیسے لوگوں سے رچی ہوئی ہو اور اِس بہانے فسادیوں کے فساد کی آڑ میں خود لوٹ مار کر کے خوامخواہ ریاستی مسلمانوں کو بدنام کرنے کی سازش کر رہا ہو۔ لیکن وہ شبے کی صورت میں بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کے اُس خاندان کی عزت مٹی میں ملے جس نے اِس شہر میں کئی نسلوں سے عزت آبرو کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ اگرچہ سوڈھی مَل تُلسی کے مُکلاوے کے بغیر حکیم کے ساتھ ڈیرہ نواب میں رہنے کو تیار نہ تھا مگر پھر بھی یہ سوچ کر تیار ہو گیا کہ ہو سکتا ہے حالات بدلتے دیکھ کر حکیم کا دماغ بھی بہتری کی طرف مائل ہو جائے۔ اِس دوران اور کچھ نہیں تو ایک ہی احاطے میں تُلسی اور رادھی دونوں کے ساتھ اکٹھے رہنے کے لطف کے علاوہ اِس سُن گُن کا موقع بھی مل جائے گا کہ لالے حکیم کے پاس مال ہے تو آخر کتنا ہے؟

(19)

فیاض دن ڈھلے حکیم رام لعل کے احمد پور مڑھی والے گھر کا تالا کھول کر اندر داخل ہوا تو ڈیوڑھی اُس کے پاؤں سے لپٹ گئی۔ آج کے دن کی صبح ہونے تک اِسی جگہ پر ایک حسین دوشیزہ نے اُسے اپنے بدن کا رازداں بنانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے اور اِسی جگہ پر اُس کے انکار نے اُسے جوان لڑکی کے قدموں میں بیٹھنے کے لائق بھی نہیں چھوڑا تھا۔ کیا وہ لڑکی کوئی آوارہ طبع تھی جو کچھ لمحوں کی لذت کشید کرنے کے لیے والدین کی عزت سے کھلواڑ کرنے چلی آئی تھی یا پھر مَن مرضی کرنے والی کوئی مَن موجن کہ جس کے پاس والدین کے جوڑے ہوئے زبردستی کے رشتوں کے خلاف بغاوت کرنے کا اِس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا؟

فیاض کو اپنے چاروں طرف تُلسی کے بدن کی خوشبو محسوس ہونے لگی کہ جسے مہندی، اُبٹن، عرق گُلاب، کیوڑے اور سندور کی خوشبوؤں نے مل کر جگایا ہوا تھا۔ فیاض کے سامنے پھر وہی سوال کہ کیا اُس نے غلط کیا ہے؟ خاندانی آبرو تو کہتی تھی کہ ٹھیک کیا مگر اُس کے اندر کا نوجوان مرد اُسے اب تک لعنت ملامت کیے جا رہا تھا کہ عورت کی طرف سے سنجوگ کی خواہش کے رَد کیے جانے کو تو شاید مردانگی کا خدا بھی معاف نہ کر سکے۔ فیاض کو اُس دکھ کا احساس بھی سارا دن چابکوں

کی زد میں کیے رہا کہ جس کے بعد اُس کے پاؤں چومنے والی تُلسی اُسے تھپڑ مارنے پر مجبور ہوئی ہو گی۔ اُس نے اپنے دونوں گالوں پر ہاتھ پھیر کر تُلسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کرنے کی کوشش کی مگر وہاں سوائے نفرت کے سرکنڈوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ ڈیوڑھی سے گھر کے دالان میں داخل ہوا تو ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ "کتنی رونق تھی کل شب اِس گھر میں جہاں اب کوئی بھی نہیں۔ کل کسی نے سوچا تھا کہ آج یہاں کیا ہوگا؟ شاید تُلسی نے سوچا ہو اور اِسی سبب کل رات کو آخری رات سمجھ کر اُس کے پاس چلی آئی۔ لیکن مجھے خبر نہ ہوئی۔ کیا میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو اِس خوش فہمی میں زندگی گزار دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ یونہی کا یونہی رہے گا؟ کیا میں تبھی ناکام ہوں، ادھورا ہوں کہ جسے نہ منزل کا پتا ہے اور نہ ہی منزل تک پہنچنے کی کوئی صورت؟ کیا زندگی موقع سے فائدہ اُٹھانے کا نام ہے یا موقع کو ٹھکرا دینے کا؟ کیا کسی بڑی خوشی کو حاصل کرنے کی خواہش میں لوگوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو پاؤں تلے روندتے چلے جانا ہی پھنے خانی ہے یا پھر حد درجہ بے وقوفی کہ جس کا اَنت پچھتاوے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا؟

فیاض کو وادھو کی بیوی مہراں یاد آئی جو اُس کے پاس اپنے ادھورے شوہر کی پگ اونچی کرانے آئی تھی لیکن اُس نے اُسے بھی جھڑک دیا تھا۔ فیاض نے بیرونی منڈیر پر رکھی لالٹین کی بتی کو جلا کر اُس کا شیشہ بند کرتے ہوئے اپنے آپ کو دیکھا۔ لالٹین کی روشنی میں وہ جب بھی اپنے سَر کو دیکھتا تو دھڑ دکھائی نہ دیتا اور پھر جب دھڑ پر نگاہ ڈالتا تو لگتا کہ سَر ہی موجود نہیں۔ فیاض ڈر گیا کہ شاید وہ بھی کوئی ادھورا مرد ہے کہ جس کی مہراں اُس کی پگ کو اونچا رکھنے کی خاطر کسی فیاض کے سامنے تَرلے کرتی پھر رہی ہو گی یا اُس کی کوئی تُلسی کسی ادھ ادھورے وِشنو کے ساتھ رخصت ہونے سے پہلے چاہے گی کہ اپنے اندر کی باغی عورت کو کسی بھی اجنبی مرد کے پیروں پر انتقاماً نچھاور

وسط میں بچھایا اور بے سُرت ہو کر لیٹ گیا۔ ہر طرف دور دور تک خاموشی تھی۔ شاید آس پاس کے گھروں میں بھی کوئی نہیں تھا۔ سوچوں نے ایک بار پھر اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ''کتنے شوق سے پیسہ پیسہ جوڑ کر انسان یہ گھر گھروندے بناتا ہے، ایک ایک اینٹ کو سجاتا ہے، سنوارتا ہے مگر جب جان پر بنتی ہے تو سبھی کچھ چھوڑ چھاڑ یہ جا وہ جا ہو جاتا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ انسان کے پاس بچانے کو سوائے اپنی جان کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اگر اور کچھ بچائے گا تو نہ جان بچے گی اور نہ ہی کچھ اور کام آئے گا۔ سبھی کچھ پرایا ہو کر کسی اور کے کام آئے گا کہ یہی دنیا کی رِیتی اور یہی دنیا کا چلن۔

فیاض نے کروٹ بدل کر بازو سَر کے نیچے کر لیا۔ ہَلکی ہَلکی ہوا چلی تو اُس کی آنکھوں میں ملہار اُتر آئی۔ اُس نے ایک لمبا سانس لیا تو محسوس ہوا کہ کھاٹ کے بان میں سے ابھی تک تُلسی کی کل رات والی خوشبو آ رہی ہے۔ آنکھوں میں نیند کی ملہار کچھ اور اُتری تو بان میں سے اُٹھنے والی تُلسی کے جسم کی خوشبو، تُلسی کے جسم کے سے احساس میں بدلنے لگی۔ فیاض کو یوں لگا کہ تُلسی واپس اپنے گھر میں چلی آئی ہے اور ایک بار پھر اُس کے اندر کے مرد کو اپنی جسمانی زبان میں شرمسار کیے جا رہی ہے۔ اِس سے پہلے کہ فیاض تُلسی کے بارے میں کوئی فیصلہ کر پاتا، تُلسی کے عقب میں چُھپے ہوئے کافی سارے جنگجوؤں نے ایکدم اُس پر حملہ کر دیا۔ فیاض اِس صورتحال کے لیے بالکل تیار نہ تھا، اِس لیے گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ جاگ ہوئی تو پہلے کی طرح دور دور تک نہ کوئی احساس اور نہ کوئی آواز۔ ہر طرف چُپ کا راج۔

لیکن اِس کے باوجود فیاض کے دِل میں کہیں کوئی خوف ضرور موجود تھا، کسی اَن دیکھی مصیبت کا خوف۔ وہ اُٹھ کر برامدے میں سے مُوڑھا گھسیٹ لایا اور کھاٹ پر سونے کی بجائے مُوڑھے پر بیٹھ گیا کیونکہ ابھی کافی رات باقی تھی اور فسادی اپنی دھمکی کے مطابق کسی وقت بھی حملہ کر کے لوٹ مار کر سکتے تھے۔

اُدھر اپنے گھر سے تین میل دور ڈیرہ نواب کے بازار کے پچھواڑے کی جانب بنے

ہوئے دو کچے کوٹھوں میں سے ایک میں ٹُلسی اور اُس کی ماں اور کوٹھے کے باہر چار پائیوں پر حکیم رام لعل، سوڈھی مَل اور وِشنو سوئے ہوئے تھے یا جاگ رہے کسی کو کچھ خبر نہیں تھی البتہ ٹُلسی ضرور جاگ رہی تھی۔ کل جو کچھ ہوا اُس کا اُبال اُس نے فیاض کو تھپڑ مار کر نکال تو لیا تھا مگر نتیجہ کیا کہ فیاض پر اُسے اب پہلے سے بھی کئی گنا زیادہ پیار آنے لگا تھا۔ شاید کل وہ ایک دن بعد ہونے والی شادی کے جھگڑے میں آکر ہوش گم کر بیٹھی تھی۔ اگر جانتی کہ شادی نہیں ہونی تو وہ اتنی اُتاوَل کرتی کیوں کہ جس کے سبب فیاض کو اِس طرح کا رویہ اختیار کرنا پڑتا؟ اُسے کوٹھے سے باہر سوئے ہوئے سوڈھی مَل پر ترس آرہا تھا کہ جس کا سارا کیا کرایا اور ساری خواہشیں راکھ مٹی ہو گئی تھیں۔ ٹُلسی کے دِل میں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ یہ حالات اِسی طرح خراب رہ جائیں، کم از کم سوڈھی مَل سے تو جان چھوٹی رہے گی۔

کوٹھے سے باہر حکیم رام لعل اگرچہ آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا مگر جاگ رہا تھا۔ لا تعداد اندیشوں کے انبار تلے ہانپتا ہوا کہ کیا خبر احمد پور میں کیا ہوا، گھر جل کر راکھ ہو گیا یا ابھی کچھ بچ گیا ہے۔ اگر گھر نہ رہا تو وہ جوان بیٹی اور بیوی کے ساتھ کہاں جائے گا۔ پرائی جا پر کون پہچانے گا اُسے؟ کیا اُس کی شہرت اور شناخت کا سفر یہیں ختم ہو جائے گا؟ یہ کیسی شناخت اور کیسی پہچان تھی کہ جو اُس کے ہُنر اور قابلیت کی بجائے اِس چھوٹے سے قصبے کی چھوٹی سی دُکان کے سبب تھی؟ کیا مقام اجنبی ہو جانے سے اِنسان کی پہچان بھی اجنبی ہو جاتی ہے۔ کیا کسی نئی جگہ پر جا کر اُس کی قابلیت میں کوئی کسر آجائے گی یا وہ قطعی چریا اور گالہا بھولا ہو جائے گا؟ اگر یہ سب کچھ نہیں ہوتا تو لوگ اُسے پہچانیں گے کیوں نہیں؟ اُسے شناخت کرنے سے انکاری کیوں ہو جائیں گے؟ اتنا عرصہ زندگی کا گزارنے کے بعد بھی اگر حاذق حکیم رام لعل کا نام ڈیرہ نواب کے بازار کے کسی کچے کوٹھے کا محتاج ہے تو آگ لگے ایسے حکیم رام لعل اور اُس کی اَدھ ادھوری شناخت کو۔ بندہ بے نام کیوں نہ جیئے اور بے نام ہی کیوں نہ مرے!

(20)

صبح سویرے فیاض احمد پور سے بخیر و عافیت ڈیرہ نواب مطب پر پہنچا تو حکیم رام لعل کی جان میں جان آئی۔ شبِ گذشتہ میں فسادیوں کی جانب سے ہندوؤں کے مکانات پر حملوں کی خبر محض افواہ ہی نکلی تھی۔ اب تو یقین ہو چلا تھا کہ یہ خبر بھی جرائم پیشہ لوگوں نے اپنے مقاصد کے لیے جان بوجھ کر اُڑائی تھی مگر سوڈھی مَل کا خیال تھا کہ خبر تو ٹھیک تھی مگر پولیس کی بروقت کاروائی کے سبب فسادیوں کو فساد برپا کرنے کی مہلت ہی نہ مِلی۔ بہر حال بات جو بھی تھی، فساد سے بچاؤ کے بعد اب حکیم صاحب کے خاندان والوں کے لیے اپنے گھروں کو واپسی کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اِس طرح یکدم بدل گئی صورت حال میں جہاں سوڈھی مَل کی مسرت دیدنی تھی وہاں تُلسی اور رادھی کا فکرمندی کے گرداب میں پھر سے چکراتے رہنا بھی غیر فطری نہیں تھا۔ اگر چہ اُن دونوں کی پریشانی کے اسباب الگ الگ تھے مگر اُن کا کارن تو ایک ہی شخص تھا۔

تُلسی کے لیے مطب کے ڈربے میں رہنا اِس لیے بھی گھر کے سکون سے بڑھ کر تھا کہ کم از کم دن کو تو فیاض کے ساتھ آمنا سامنا ہونے کا امکان موجود تھا۔ وہ یہ دیکھنے کو اُتاولی تھی کہ اُس رات کو سبھی معاملہ اُس پر کھل جانے کے بعد اُس کا چہرہ مہرہ کیا بتاتا ہے۔ کیا اُسے اپنے اُس

رات کے روپے پر پچھتا وا ابھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ تُلسی کو یوں لگنے لگا تھا کہ آنے والے دنوں میں
اُس کی زندگی کی لکیر کہیں ناں کہیں فیاض کی زندگی کے ساتھ سنجوگ بنا کر رہے گی کیونکہ وشنو کے
ساتھ اُس کی شادی کا عین وقت پر ہوا ہو جانا کسی رمز کے سوا نہیں تھا۔ اِس کے باوجود اُس نے
سوچ رکھا تھا کہ شادی اگر ہو بھی گئی تو تمام عمر بے توقیری کا عذاب سہنے کی بجائے وہ اپنی جسم کی
امانت اُس کے حقدار کو سونپے بغیر کسی اور کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دی گی۔ دوسری طرف رادھی بھی
اِسی اُدھیڑ بُن میں کہ کسی طور تو تُلسی کی شادی کو لٹکائے رکھے اور رخصتی نہ ہونے دے کیونکہ تُلسی اگر
ایک بار سوڈھی مَل کے گھر چلی گئی تو اُس جیسے دید پلید اور طوطا چشم نے پھر اُسے کب پوچھنا تھا؟

یہ سبھی فِکرے اندیشے صرف تُلسی اور رادھی تلک ہی محدود نہیں تھے۔ اِن کے برعکس
معاملات کو اتنا سادہ نہ سمجھنے والا سوڈھی مَل بھی حالات اپنے حق میں بدل جانے کے باوجود اُس
وقت تک بے فکر انہیں ہو سکتا تھا کہ جب تک از سرِ نو سات پھیروں کی تاریخ طے نہ ہو جائے۔ اِس
سارے معاملے میں تُلسی اُسے ایسی بچھڑی کی طرح لگتی تھی جو ہر دم رَسے تڑانے کو تیار اور رادھی
اُس گائے کی مانند کہ جو پھَنڈِر ہو کر بھی خود کو زرخیز سمجھ رہی تھی۔ رہا حکیم رام لعل تو وہ سوڈھی جیسے
میسنے چلِتر کے لیے ایک بُھونی کی مار تھا۔ تبھی جب حکیم گھنٹہ ایک مطب میں لگانے کے بعد نِران
کے لیے اندر آن بیٹھا تو سوڈھی پھر سے اُس کے سَر ہو گیا۔

''لالہ..... اب تو خیر مہر ہو گئی ہے۔ آج کے دن کے لیے طے کیا ہوا شگن بھی ویسے کا
ویسے ہی ہے۔ کیوں ناں سات پھیرے کر ہی لیں؟''

حکیم نے حیران ہو کر پہلے سوڈھی اور پھر کچھ پرے ہٹ کر بیٹھی ہوئی رادھی کی طرف
دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو..... کیا کہوں، کیا کروں۔ رادھی نے حکیم کو جواب دینے کی بجائے ماتھے پر
بل ڈال لیے اور گھور کر سوڈھی کی طرف دیکھا۔ مگر سوڈھی اُس کی خفگی کو خاطر میں لائے بغیر پھر سے
حکیم سے مخاطب ہوا۔

''دیکھو ناں لالہ..... حالات کی اُونچ نیچ تو لگی رہے گی۔ کیا اِس کی وجہ سے بندہ ڈِھی

دھیانی کو بھی بٹھائے رکھے۔ سَر کا بوجھ ہلکا نہ کرے!''۔

حکیم نے دودھ اور اسبغول کے چھلکے کا پیالہ ایک طرف رکھا اور رُومال سے منہ صاف کرتے ہوئے رادھی کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ رادھی آئی اور دونوں ہاتھ اپنے ڈھاک پر رکھ کر منہ تو حکیم کی طرف کر کے کھڑی ہوگئی مگر کانی آنکھ سے دیکھ سوڈھی مَل کو رہی تھی کہ کسی طور تو باز آجائے۔

''بختاں والی! مُلیر تمہارا بات تو ٹھیک کر رہا ہے۔ دھی دھیانی آخر ہے تو پرائے گھر کی اور مُکلاوا بھی ویسے سادگی ہی سے کرنا تھا تو پھر آج کیا اور کل کیا''۔ حکیم نے بات تو کر دی مگر صلاح صباح کے انداز میں، کوئی فیصلہ کئے بغیر۔

''ناں تُلسی کوئی یتیم ہے، مسکین ہے جو اِس طرح چُپ چپاتی مُکلا دی جائے، ایک ہی بیٹی ہے میری اور میں اُس کے ساتھ یہ ظلم نہیں ہونے دوں گی.... تم سبھی سُن لو، میں بیاہوں گی اپنی بیٹی کو توباجے بارات کے ساتھ، ایسے نہیں کہ جیسے تم لوگ سوچ کے بیٹھے ہو''۔ یہ کہہ کر رادھی پُھوکی تُوکی پاؤں پٹختی ہوئی کمرے میں چلی گئی لیکن جانے سے پہلے ناک سُکیڑ کر سوڈھی کو چتاونی ضرور دیتی گئی۔ سوڈھی مَل کو رادھی کے اِس طرح اُچھلنے کی امید تو تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ آنکھیں بالکل ہی ماتھے پر رکھ لے گی۔

''سُنجی شے تے ویہڑے دی وَسوں''..... کمرے میں جاتی رادھی کو گالی تو سوڈھی نے دِل ہی دل میں دی مگر اوپر اوپر سے آواز دیتے ہوئے کہا کہ ماموں زاد بات تو سنتی جاؤ۔ مگر رادھی نے سُنی کو بھی اَن سُنی کر دیا۔

حکیم نے بے بس ہو کر سوڈھی کی طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچتا ہوا اُٹھا اور چھوٹی طاقچی میں سے گزر کر مطب میں داخل ہوگیا۔

''دفع ہو گندی رَن''۔ سوڈھی نے اِس مایوس کن صورتحال میں دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے منہ ہی منہ میں اِس طرح رادھی کو گالی دی کہ آواز اُس تک کمرے میں جائے ضرور۔

(21)

وادھو اور اُس کے ساتھ ڈیرہ نواب کے بازار کے کچھ دیگر دُکاندار بھی گذشتہ شام سے اِسی مخمصے میں تھے کہ آخر حکیم رام لعل کے مطب میں رولا کیا ہے جو رات ہو جانے کے باوجود نہ تو وہ احمد پور گیا اور نہ ہی اُس کا گھوڑا تانگہ تیار کیا گیا۔ کوچوان بھی ایک بار دکھائی دیا اور پھر غائب۔ مطب بند ہونے کے بعد بھی درزوں میں سے لالٹین کی روشنی جوں کی توں۔ فیاض جو شام تلک حکیم کی گدی پے بیٹھتا تھا وہ بھی دن ڈھلے سے پہلے گُم۔ آج بھی صبح صبح فیاض کی جگہ حکیم خود براجمان تھا، فیاض آیا بھی تو کچھ تاخیر سے۔ وادھو کا خیال یہ تھا کہ حکیم ڈیرہ نواب صاحب میں فساد کرانا چاہتا ہے تبھی یہاں اجنبی لوگوں کو اکٹھا کر کے کوئی سازشی کھچڑی پکانے کے چکر میں ہے۔

گذشتہ کل مغرب کی جماعت کے بعد مسجد میں بھی یہی بحث مباحثہ چلتا رہا کہ حکیم یہاں کر کیا رہا ہے۔ کسی نے کہا کہ ہو سکتا ہے وہ احمد پور سے اپنے بیوی بچے یہاں لے آیا ہو۔ مگر باقی سب نے اِس خیال کو اِس لیے رَد کر دیا کہ اِس امیر کبیر سامی کو کیا آن پڑی اپنی پکّی ماڑی کا عیش آرام چھوڑ کر بیوی بچوں کو مطب کے کچے کوٹھوں میں بسرام کرائے۔ ایک پنساری جو آج ہی بہاول پور سے واپس آیا تھا، یہ خبر لیے پھرتا تھا کہ پاکستان کے نام سے نیا ملک آج ہی بننے جا رہا

ہے مگر امام صاحب نے اُس کی بات کو اِس لیے اہمیت نہ دی کہ نیا ملک بنانا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا ،ویسے بھی کب کے سنتے چلے آرہے ہیں مگر بنا تو اب تک نہیں۔

عشاء کی جماعت کے وقت نواب صاحب کا خدمت گار حاجی الٰہی بخش بھی ڈیوٹی کے بعد گھر جاتا ہوا وہیں جماعت سے آملا کہ نماز قضا ہو رہی تھی۔ نماز کے بعد حاجی صاحب نے بھی مسجد میں بیٹھے ہوئے دوستوں کے کان میں رازداری کے ساتھ یہ بات چلادی کہ آج تو نہیں مگر کل چودہ اور پندرہ اگست کی نیم شب پاکستان بننے کا سرکاری اعلان ریاست میں بھی ہو جائے گا۔ حاجی صاحب نے تاکید کی کہ یہ بات ابھی آگے کسی کو نہیں کرنی۔ اب کسی اور کی بات کا اعتبار کیا جاتا یا نہ کیا جاتا مگر خدمت گار حاجی الٰہی بخش کی بات کو کون جھٹلائے۔ لہذا سب نے آمین پڑھ لی۔

وادھو کو حکیم رام لعل کی دُکان میں ہونے والے معاملے کی کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی مگر ابھی تک کافی ساری باتوں کے سِرے آپس میں جڑ نہیں رہے تھے۔ اِس لیے آج دُکانداری کرنے کی بجائے وہ اِس بات پر اُدھار کھا کر بیٹھ گیا کہ کیا ہوا اگر کچھ باتیں آپس میں جُڑ نہیں رہیں ،اِدھر اُدھر سے سُن گُن لے کر ٹانکا تو فِٹ کیا جا سکتا ہے ناں۔ اُس کے بچپن کی یادوں سے یہ کانٹا نکلنے کو تیار ہی نہیں تھا کہ حکیم کی مطب والی اِس بڑی دوکان پر نگاہ رکھنے کے باوجود اُس کا باپ غربت کے مارے اِسے خرید نہ پایا۔ تب سے یہ دوکان وادھو کے سینے میں کسی خنجر کی طرح گڑی ہوئی تھی۔ اب اگر موقع مل رہا تھا تو وہ فائدہ کیوں ناں اُٹھاتا۔

کل رات کو حاجی الٰہی بخش خدمت گار کی کُچھ لوگوں کے کان میں کی ہوئی بات آج ڈیرہ نواب کے پورے بازار میں گردش کر رہی تھی اور اگر کوئی بے خبری میں تھا تو بس حکیم رام لعل اور اُس کا ٹبر۔ پاکستان بننے کی خبر میں وادھو جیسے کئی افواہ سازوں نے یہ بات بھی جَڑ دی کہ آج کل میں ہندو یا تو خود ہی یہاں سے نکل بھاگیں گے اور اگر نہ گئے تو یہاں سے جوتے کھا کر جائیں گے۔ کئی جرائم پیشہ لوگوں نے آج رات کسی وقت لوٹ مار کے اَنڈر گراؤنڈ منصوبے بھی بنانے شروع کر دیے۔ وادھو کو یقین اُس وقت ہوا جب اُس کا ایک دوست احمد شاہ دوپہر کے وقت اُسے

احمد پورا پنے کسی رشتے دار کے گھر لے گیا جہاں بہت بڑی حویلی میں ایک ریڈیو لگا ہوا تھا۔ کم وبیش چوبیس پچیس افراد چارپائیوں پر بیٹھ کر ریڈیو پر خبریں سُن رہے تھے۔ اگرچہ ریڈیو کے چرچے ہر طرف شروع ہو چکے تھے مگر وادھو کے لیے ریڈیو دیکھنا ایک انوکھا تجربہ تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ لاہور میں بیٹھا ہوا کوئی شخص اتنی دور پڑے ہوئے ایک کھوکھے میں سے بول سکتا ہو۔ اُس کا دِل چاہا کہ اِس کھوکھے کے عقب میں جا کر دیکھے کہ اِس کے اندر کوئی سچ مچ کا بندہ تو نہیں چھپا ہوا مگر ہمت نہ ہوئی۔ ڈر تھا کہ احمد شاہ کا دوست کیا کہے گا۔

ریڈیو سے آواز آ رہی تھی کہ تین جون اُنیس سو سینتالیس کے منصوبے کے تحت آج رات بارہ بجے سے ہندوستان کے دو ملک بنائے جا رہے ہیں اور بہاول پور سمیت یہاں کی ریاستوں کو پوری آزادی ہوگی کہ وہ پاکستان یا بھارت جس ملک میں بھی چاہیں شامل ہوں یا اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھیں۔ ریڈیو پر اعلان سُننے کے بعد وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے بہت سے ایک ایک کر کے کھسکتے چلے گئے۔ احمد شاہ نے وادھو کو اشارہ کیا کہ باہر نکلو۔ وادھو تو خود یہی چاہ رہا تھا کہ کسی ناں کسی طور بھاگ کر ڈیرہ نواب پہنچے اور اِس سے پہلے کہ کوئی اور داؤ لگا جائے، وہ حکیم کے ٹوٹے ٹوٹے کر کے دُکان پر قبضہ کر لے۔ باہر نکلتے ہی احمد شاہ نے فوراً رخصت چاہی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ جا وہ جا۔ یوں لگتا تھا کہ جوان احمد پور شہر میں کسی ہندو کا کوئی مکان یا دُوکان تاڑے ہوئے ہے۔ وادھو کو افسوس تو بہت ہوا کہ احمد شاہ اُس کی مدد کرنے کی بجائے خود غرض ہو کر چلتا بنا ہے، پھر خیال آیا کہ دنیا تو اِسی کا نام ہے، آپ تڑاپی کا۔ اُس نے سوچا کہ کسی طور بازار کے دس بارہ دوکانداروں کو ساتھ ملا لے تو حکیم کی دُوکان پر قبضہ ہو سکتا ہے مگر پھر یہ سوچ کر پریشان ہو گیا کہ اُن میں سے کوئی اِس دُوکان کا اُس سے بڑھ کر محبتی نکل آیا تو اُس کے اپنے ہاتھ میں کیا ٹٹو آئے گا۔

تو پھر کیا کیا جائے؟ کون ایسا ہو سکتا ہے کہ جسے اِس جائیداد سے محبت نہ ہو؟ وہ اِسی گویڑی سوچ میں غلطاں حویلی کی بیرونی گلی کی نکڑ پر بنی ہوئی گھوڑوں کے پانی پینے کی حوضی کے کنارے چڑھ بیٹھا۔ ابھی چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ دماغ میں کوئی کوندا سا لپکا۔ اگر بڑے

مدرسے کے مولوی صاحب پچیس تیس طالب ہمراہ کر دیں تو کام فِٹ بن سکتا ہے۔خیال آتے ہی ادھو تیزی سے اُٹھا اور اُٹھتے ہی پاگلوں کی طرح دوڑ لگا دی مگر کچھ دور جا کر ٹھہرنا پڑا کیونکہ پولیس کے گھڑسوار سپاہی چار چار کی چوکڑیوں میں گشت کرتے پھر رہے تھے۔وادھو کا پھولا ہوا سانس دیکھ کر ایک سپاہی نے اُس پر شک کی نگاہ ڈالی مگر وادھو نے گردن جھکا کر قدم آہستہ کر لیے۔سپاہی نے بھی اَکھنُوتی کرنے میں دیر نہ لگائی۔

احمد پور سے ڈیرہ نواب تک کوئی تانگہ سڑک پر نہیں تھا اور ساون کے آخری دنوں کے حبس نے پیدل چلتے ہوئے وادھو کو پسینے پسینے کر رکھا تھا۔ڈیرے کے بازار تک پہنچنے سے پہلے عید گاہ سے ملحقہ تنگ گلی سے نِکل کر وادھو بڑے مدرسے کے دروازے پر پہنچا تو اندرونی مسجد میں عصر کی جماعت کھڑی ہونے کے بعد تکبیر کہی جا رہی تھی۔وادھو کی کوشش تھی کہ اُسے کسی ناں کسی طور امام صاحب کے دائیں یا بائیں جگہ مل جائے تا کہ جونہی وہ سلام پھیریں وادھو پر نگاہ ضرور پڑے۔وادھو کا وضو تو نہیں تھا لیکن اگر وہ وضو کے لیے سقاووں کی طرف جاتا تو مدرسے آنے کا مقصد پورا نہ ہو سکتا تھا۔ایک لمحے کے لیے وادھو وضو کے لیے سقاوے کی طرف لپکا مگر پھر خیال آیا کہ وضو ہے یا نہیں، یہ تو کسی نے نہیں دیکھنا لیکن وہ جماعت میں شریک ہے یا نہیں، اِس کی خبر سب نے رکھنی ہے،تو پھر کیوں ناں وہی کام کیا جائے کہ جس میں ستے خیراں اور بہتری ہی بہتری۔یہ سوچ کر وادھو مسجد میں گھسا اور صفیں پھلانگتا ہوا سیدھا پہلی صف میں اِمام صاحب کی بائیں جانب کھڑا ہوا اور نماز کی نیت باندھ لی۔سلام پھیرتے وقت جب امام صاحب نے بائیں طرف گردن گھمائی تو وادھو نے کافی دیر تک اپنا چہرہ دائیں جانب رکھا تا کہ اِمام صاحب کی نگاہ نہ پڑتے ہوئے بھی اُس پر پڑ کے رہے۔

مگر یہ سارا کیا کرایا وادھو کے کسی کام نہ آیا۔سَبھی نمازیوں کے اِدھر اُدھر ہو جانے کے بعد جب وادھو نے مطلب کی بات چلائی تو اِمام صاحب نے دُوکان پر قبضے کے واسطے طالب علم دینے سے صاف انکار کر دیا۔وادھو نے مدرسے کی امداد کے نام پر رقم کا لالچ دینے کی کوشش بھی

کی مگر امام صاحب نے جواباً جھڑک دیا۔

''وادھو تم چاہتے ہو کہ میں اِس مسجد کی امامت سے بھی جاؤں۔ تجھے بھلے خبر ہے یا نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ نواب صاحب سے کوئی بات چھپی رہ سکتی ہی نہیں۔ بہت ظالم انسان ہے، اگلے کو دفعان کرتے ہوئے ذرا سی دیر بھی نہیں لگاتا۔ میں تو تم سے بھی یہی کہوں گا کہ باز آجاؤ۔ سارا شہر جانتا ہے کہ یہ دُوکان حکیم رام لعل کی ہے اور تمہارا اُس سے کوئی لینا دینا نہیں۔ ویسے بھی نواب صاحب نے تمام خلقت کو چاہے وہ سِکھ ہے یا ہندو، امان دی ہوئی ہے۔ خوامخواہ اندر ہونا ہے تو اور بات مگر دوسروں کو تو خوار نہ کرو۔ جاؤ شاباش، اب جاتے ہوئے دکھائی دو۔''

وادھو مدرسے نکلا تو اُس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ غصے کی شدت سے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب کیا کرے۔ اِمام صاحب سے اُسے یہ اُمید نہیں تھی کہ وہ ایک مسلمان کو چھوڑ کر کافر کی طرف داری کرے گا۔ ''ویسے تقریروں میں تو بہت باتیں کرتا ہے کافروں کو مار مُکانے کی مگر اب پھٹتی ہے نواب کے خوف سے۔ اُونہہ۔ نواب کا خوف کہاں، اپنا مطلب ہو تو نواب کا خوف شوف کچھ باقی نہیں رہتا۔ یہاں مفاد جو میرے جیسے غریب کا ہے تبھی مُلا کو نواب کا خوف دامن گیر ہو رہا ہے۔ منافق کہیں کا۔ میں اب اگر یہی دوکان مدرسے کو دان کر دوں تو پھر دیکھتا ہوں کہ سارے جگ جہان کے مُلا ڈنڈے، لاٹھیاں اور تلواریں نکال کر بازار میں کیسے نہیں آتے؟'' وادھو دماغی طور پر عدم توازن کا شکار ہو کر ہذیان بکتا ہوا دوکان پر آیا تو اُسے کھولے بغیر دھچر کی دُوکان کے سامنے رکھی چوکی پر بیٹھ کر حکیم کے مطب کی جانب دکھ، بے چارگی اور اُداسی کی ملی جلی کیفیت سے تکنے لگا۔

دھچر گاہکی سے فارغ ہوا تو وادھو کو دل گرفتہ دیکھ کر اُس کے قریب آ بیٹھا۔ ''کیوں یار خیریت تو ہے، دُوکان کھولی نہ کوئی بونی شونی اور یہ کیا صورت بنا کر چوکی پر چڑھ بیٹھے ہو۔ گھر میں تیری عورت تو اچھی بھلی ہے ناں۔''

''ناں اُس منحوس کو کیا ہونا ہے۔ بندہ بشر ہوں میں بھی، مجھے اُسے رانڈ کے علاوہ اور

کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا کیا۔'' وادھو نے زچ ہو کر جواب دیا مگر دھچر ناراض ہونے کی بجائے ہنس دیا اور استری میں سے راکھ جھاڑتے ہوئے آہستہ سے وادھو کے کان میں کھسر پھسر کی۔

''حکیم کی دُکان کی فکر ہے ناں میرے یار کو۔''

وادھو نے حیران ہو کر دھچر کو دیکھا کہ اُسے کیسے پتا ہے۔

''یار بُھول جاؤ اِس دوکان کو، یہ تمہارے نصیب میں نہیں۔'' وادھو کو یوں لگا کہ دھچر کے دِل میں کوئی راز ہے لیکن پھر بھی وادھو نے اِس کی ٹوہ لگائے بغیر اُسے جھڑک دیا۔'' جاؤ جاؤ، اپنا کام کرو...... تمہیں کیا خبر۔''

''خبر ہی تو میرے پاس ہے''۔ دھچر کی آنکھوں میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ شرارت ابھی تک موجود تھی۔

''اچھا بات سنو.... تم ابھی بڑے مدرسے سے ہو کر آ رہے ہو ناں اور تمہیں اِمام صاحب نے دُوکان کے لیے امداد دینے سے انکار کر دیا ہے۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟'' وادھو نے یکا یک سبھی ہتھیار پھینک دیے۔'' مجھے اِس لیے پتا ہے کہ تمہارا دوست احمد شاہ خود اِسی دُوکان کے لیے باؤلا ہوا پھر رہا ہے اور اِمام صاحب بھی اُس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ مدرسے کے کچھ طالبِ علم ظہر سے پہلے یہاں سے دو بار ہو کر گئے ہیں۔ اُن میں سے ایک لڑکا میرا جاننے والا تھا، اُس نے بتایا ہے کہ بہت جلد اِس دوکان میں احمد شاہ اپنی حکمت چلائے گا۔ بس آج رات عشاء ہونے کی دیر ہے اُس کے بعد کام ٹھک پھک اور قبضہ احمد شاہ کے پاس''۔

''پھر یار تو نہ ہوا، یار مار ہوا۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ یہ دوکان کیسے مل کے رہتی ہے احمد شاہ کو۔ اِمام صاحب کے طالبِ علم تو عشاء پڑھ کر آئیں گے، اب تم دیکھنا کہ وادھو کیا کرتا ہے۔''

یہ کہہ کر وادھوں نے دھچر کی دُوکان کی تھَلی سے چھلانگ لگائی اور گھر کی طرف زِیٹ ہو گیا۔

(22)

فیاض نے آج پہلی بار تُلسی کو اچھی طرح سے آنکھیں بھال کر دیکھا تھا۔لگ یوں رہا تھا کہ وہ بھی اُسے ہی تکے جا رہی ہے مگر اِدھر اُدھر تکتے ہوئے ۔ویسے تو یہ موقع ہی نہیں تھا ایک دوسرے کو دیکھنے کا مگر جب گماں ہو کہ پھر کبھی جیتے جی ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع نصیب ہی نہیں ہونا تو پھر انسان ہر قسم کی جھجک ایک طرف کرتے ہوئے اِس طرح دید سے دِل کا کام لیتا ہے کہ جیسے فیاض اور تُلسی لے رہے تھے۔

14 اگست کی دوپہر کو جب جمعدار محمد نواز کے مشورے پر حکیم رام لعل نے روہی کی طرف سے بارڈر پار کر کے ہندوستان جانے کا فیصلہ کیا تو سوڈھی مَل اور وِشنو اُسی وقت سے گردنیں جھکائے اور دَم سادھے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے ۔احمد پور سے آتے ہوئے سوڈھی اپنا پیسہ ٹکا ساتھ لیتا ہوا آیا تھا اور اب تو بس ایک دَم تھا اپنا اور دوسرا بیٹے کا۔حکیم کی بیوی رادھی تو بالکل بوکھلائی ہوئی پھر رہی تھی ۔بھرا پرا گھر چھوڑ کر مہاجر ہو جانا اِتنا آسان بھی نہیں تھا۔سبھی آرزوئیں سبھی خواہشیں پَل بھر میں مٹی ہوگئی تھیں ۔اُس نے بہت زور لگایا کہ جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنے کی بجائے نواب صاحب کے فیصلے کا انتظار کر لیا جاوے مگر حکیم تو اور کوئی بات

سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ جمعدار نے اُسے کوئی ایسی خبر سنائی کہ جس کے سننے کے بعد حکیم صاحب حوصلہ ہی چھوڑ بیٹھا۔ کچھ دیر تو فیاض کو اپنے قریب بٹھا کر چھوٹی چھوٹی ہدایات دیتا رہا کہ کس کس کا کیا کیا کرنا ہے۔ پھر اپنی صندوقچی اُٹھا کر ایک طرف ہو بیٹھا اور اُس میں سے نئے خریدے گئے اسٹامپ پیپر نکال کر فیاض کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

''یہ میرے مکان اور دُکان کے کاغذات ہیں۔ دونوں تمہارے نام لکھوا دی ہیں۔ یہ سبھی کچھ تمہارا، تانگہ گھوڑا بھی تمہارا۔ قسمت میں ہوا اور واپس آ گئے تو پھر دیکھا جائے گا''۔

کاغذات لیتے ہوئے فیاض کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تو حکیم بھی رُو دیا۔ کچھ پرے ہو کر بیٹھی ہوئی ماں بیٹی سب دیکھ رہی تھیں، اُن کے آنسو صرف آنکھوں میں ہی نہیں تھے بلکہ گالوں سے بھی بہہ رہے تھے۔ یہ سبھی کچھ فیاض کے حوالے کرنے کے بعد حکیم رام لعل دوسرے کوٹھے کی نکڑ میں جا کر رَب جانے کونسی تھیلی کھول کر کھڑا ہو گیا۔ کئی دنوں کی گُم سُم تُلسی میں بھی ایکدم نجانے کہاں سے اتنی ہمت آئی کہ ماں کی موجودگی میں چہرے پر آیا ہوا دوپٹے کا پلو اوپر اُٹھا کر فیاض کے قریب آئی اور عجیب سے اعتماد کے ساتھ اُس کے دائیں ہاتھ کی اُنگلیاں اپنی اُنگلیوں میں پھنسانے کے بعد آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سینہ تان کر اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

اِس اچانک حرکت کے بعد نہ تو رادھی میں اتنی سکت کہ بیٹی کو منع کر سکے اور نہ فیاض میں اتنی جرات کہ تُلسی سے ہاتھ چھُڑا سکے یا اُس کے چہرے سے نگاہ تک ہٹا سکے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو آج پہلی بار دیکھ رہے تھے شاید پھر کبھی نہ دیکھنے کے لیے۔ اُس لمحاتی فاصلے میں نجانے کتنی صدیاں گزر گئیں۔ تُلسی کو فیاض کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وہ سَواد آ رہا تھا جو اُس رات کے خودخواہش کردہ عذابوں میں بھی نہیں آیا تھا۔ فیاض کا ہولے ہولے کانپتا ہوا ہاتھ جسمانی شراکت کی تمام سیڑھیاں پھلانگتا ہوا حساسیت کی انتہا کو چھو رہا تھا اور تُلسی کی اُنگلیوں کی گرفت فیاض کے بدن کی ساری حدت اپنے بدن کی روہی ریت پر بہائے جا رہی تھی۔ تُلسی کو یوں لگا کہ ایک فیاض کیا، مردانگی کی پوری کائنات کیا، محبت کا سارا جہان کیا، خود محبت کا دیوتا اُس کی نسائی جکڑن میں

ہے۔ تُلسی جسمانی شراکت کے اس مکاشفے میں سے گزرتے ہوئے اُس مقام تک پہنچی کہ جس کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ عورت مرد کی جسمانی سانجھ کچھ مخصوص اعضاء کے ملاپ کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ اس عمل میں ایک منزل ایسی بھی آتی ہے کہ جہاں محض ہاتھ کا ہاتھ کو مَس ہونا اور آنکھ کا دوسری آنکھ کو دیکھنا ہی منزل منتہا پر پہنچا دیتا ہے۔ شاید اسی لیے کہ عورت اور مرد کا پورا جسم ہی جسمانی سانجھ کا تقاضے دار ہونے کے سبب اِس عمل سے گزرتے ہوئے اپنا آپ اپنے جسمانی مخاطب پر کھول کر کبھی کچھ ظاہر کر دیتا ہے۔ اُن دونوں نے شاید ایک ساتھ سوچا ہو کہ کسی طبیب کے کسی مریض کی نبض پر اُنگلیاں رکھتے ہی اُس کا پورا جسم کیونکر طبیب کو اپنے بھیتر کا محرم بنانے کے واسطے اُس پر اپنا آپ وا کر دیتا ہے۔

لمحہ کیا گزرا، اُبلتی آنکھوں والی تُلسی کی آنکھیں جھک گئیں تو فیاض کے ہاتھ پر اُس کی اُنگلیوں کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی۔ فیاض نے اُس کا ہاتھ زور سے دبا کر چھوڑ دیا اِس ارمان کے ساتھ کہ وہ شبِ گذشتہ کو واپس لائے تو کیسے لائے۔ تُلسی کی آنکھیں جھکیں تو چہرے پر آیا ہوا دوپٹے کا پلو بھی تھوڑا سا نیچے گر گیا۔ فیاض کی نگاہ اُس کی گردن میں جھولتی سُرخ رنگ کے موٹے موتیوں کی مالا پر جا ٹکی جس کے موتیوں کا سانس کے ساتھ ساتھ اوپر نیچے ہونا آہستہ آہستہ قرار میں آتا جا رہا تھا۔ اپنے تئیں تُلسی نے آخرِ کار وہ امانت بھی فیاض کے حوالے کر دی کہ جس کے سامنے اُس کے اَبا کے دیے ہوئے مکان اور دُکان کی بھی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ اِس بات پر بھی راضی کہ حق دار کا انتخاب اُس کملی کا بھی وہی تھا جو اُس کے سیانے ویانے اَبا حکیم صاحب کا تھا۔

رادھی یہ سب دیکھ کر بالکل ہی گُنگ، اُلٹا سہم کر بیٹھ گئی۔ حکیم صاحب کوٹھے سے باہر آیا تو معلوم ہوا کہ اُس کا دوست محمد نواز جمعدار پولیس کی جیپ لے کر مطب کی عقبی جانب آ چکا ہے۔ رام لعل نے فیاض کو گلے سے لگایا تو آنکھیں ایک بار پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔ جب کہ تُلسی، رادھی، وشنو اور سوڈھی مَل کے چہروں پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا، ویسے ہی جیسے ہتھیار پھینک چکے سپاہی کو اِس سے کوئی غرض نہیں رہ جاتی کہ اُس کی باقی ماندہ عمر قید میں گزرے گی یا وہ تختے پر

لگے گا۔ زندگی کسی وقت اتنی بھی غیر متعلقہ ہو جاتی ہے کہ اُس کے سامنے جینے کی خواہش اپنے معنی کھو بیٹھتی ہے۔

فیاض کو الوداع کہتے ہوئے حکیم کے پاس لفظ تو باقی نہ بچے، صرف آنکھیں تھیں کہ جن میں پھر سے وطن نصیب اور شناخت یافتہ ہونے کی آرزو تھی جس کے پورے ہونے کا امکان آنسوؤں کے سوا کچھ نہ تھا۔

اپنے ہم وطنوں سے چوری چھپے یہ پانچ افراد جیپ کے عقبی حصے میں گُھس مُس کر بیٹھ گئے جب کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور کے ساتھ براجمان ایک مسلح سپاہی نے اُن کو قلعہ دراوڑ سے آگے مَڑ یچی والی جھوک پر پہنچا کر واپس آنا تھا۔ جیپ کے ٹائروں میں جنبش ہوئی تو محمد نواز جمعدار کے ساتھ ساتھ فیاض نے بھی رخصتی کے لیے ہاتھ ہلایا مگر جیپ کے اندر سے کچھ دکھائی نہ دیا۔ شاید مسافروں کے پاس نہ تو ہاتھ ہلانے جتنی جگہ بچی تھی اور نہ ہی اتنا حوصلہ۔

(23)

اگرچہ ریاست بہاول پور میں کچھ بھی ایسا ہونے نہیں جا رہا تھا کہ جسے ہندوستان کے دیگر علاقوں کی سیاسی ٹوٹ پھوٹ سے جوڑا جا سکتا خاص طور پر پنجاب کے حالات کے مقابلے میں مگر پھر بھی 14 اگست 1947ء کی حبس زدہ شام کو ایک عجیب سا خوف ہر طرف نازل ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ساون کے مہینے کی اِس آخری شام کو حبس نے چوکھا جوبن دکھایا تو ڈیرہ نواب میں غربی جانب سے پہلے بادلوں اور پھر گرج چمک کے تیور دکھنے شروع ہو گئے مگر بارش کو ابھی کچھ دیر تھی۔ لیکن اِدھر اُدھر کی خبروں کے بعد اب تو ہر شخص کو یقین ہو چکا تھا کہ آج چودہ اور پندرہ اگست کی درمیانی شب جب بارہ بج رہیں گے تو اگلے سیکنڈ کے کھڑکار کے ساتھ ہی ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل پاکستان نام کے ایک ایسے مُلک کا پیکر تراش لیا جائے گا کہ جس کے مغربی اور مشرقی حصوں کے درمیان ایک ہزار میل کے بھارتی علاقے کی دوری ہو گی۔

مغرب کی نماز کب کی ہو چکی تھی مگر وادھو سمیت آج کئی دُکاندار مسجد نہیں گئے تھے۔ کچھ نے تو نماز گھر پر پڑھی مگر وادھو کا اَتا پتا بظاہر کسی کو بھی نہیں تھا کہ وہ گیا کہاں ہے؟ ڈیرہ نواب کے بازار میں کمیٹی کا ملازم کم و بیش ایک گھنٹہ پہلے آ کر چمنیاں روشن کر گیا تھا مگر اندھیرا کسی طور بھی

قابو میں آنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ایک عجیب سا اندھیرا تھا کہ جس میں شام کی لالی رات ہونے کے باوجود ختم ہونے کو نہیں آ رہی تھی۔ سڑکوں پر پولیس اور نواب صاحب کے گھوسوار باڈی گارڈ دستوں کی گشت بھی اُس خوف کو کم نہ کر سکی جو سورج غروب ہونے کے بعد ریاست کے ہر اُس علاقے میں گھر کر گیا تھا کہ جہاں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو، سِکھ اور عیسائی بھی رہائش پذیر تھے۔ نواب صاحب کی جانب سے اَمن امان کی تَسلیوں کے باوجود ہندو اور سِکھ آبادی میں یہ احساس رو کے رُک نہیں پا رہا تھا کہ نواب صاحب کا فیصلہ چاہے جو بھی ہوا نہیں ریاست بہر صورت چھوڑنی ہوگی۔ یہ احساس پہلے تو اتنا نہ تھا مگر ریاست میں مسلم لیگ اور کانگریس کی پراکسی جماعتوں کی سرگرمیوں نے مسلم اکثریت کے دِلوں میں نفرت اور ہندوؤں سمیت سبھی اقلیتوں کے ذہنوں میں خوف کو اُس حَد تک بڑھا دیا تھا کہ جہاں سے واپسی ممکن نہیں تھی۔ یہ اِسی خوف کی انتہا تھی کہ ریاستی ہندو اپنا بوریا بستر پاکستان بننے کے اعلان کے ساتھ ہی باندھ بیٹھے تھے۔ اُن میں سے جو اپنی ریاستی شناخت کو بھلانے کے لیے کسی صورت تیار نہ تھے، وہ اپنی جائیدادیں امانتاً اپنے اعتباری ہمسایوں کے حوالے کیے جا رہے تھے۔

عشاء کی اَذان سے کچھ دیر پہلے چار گھُڑ سوار باڈی گارڈ بوہڑ والے چوک سے ڈیرہ نواب صاحب کے بازار میں داخل ہوئے اور گھوڑوں کو دُلکی چال چلاتے ہوئے عیدگاہ کی طرف چلے گئے۔ ابھی بمشکل وہ ہائی اسکول کی عمارت کے سامنے سے گزرے ہی ہوں گے کہ پانچ چھ لوگوں کا جتھا، ڈھاٹے مارے ہوئے جلتی ہوئی مشعلیں اُٹھا کر سیدھے حکیم رام لعل کی دُکان پر گیا اور دُکان کو گھیرے میں لے کر اِس کے بڑے دروازے پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ اَبھی آگ نے لکڑیوں کو پکڑا ہی نہیں تھا کہ ایکدم دروازہ اندر سے کُھلا اور ایک بل دی ہوئی گھنی مونچھوں والا بھاری بھر کم ٹیٹن باوردی پُلسیا دَروازہ روک کر اِس طرح کھڑا ہو گیا کہ پستول کا رُخ فسادیوں کی طرف تھا۔ اُس کے عقب میں تین بندوق بردار پولیس کے سپاہی کسی دیوار کی اینٹوں کی مانند آپس میں جُڑ کر کھڑے تھے۔ فسادیوں کا جَتھا جہاں تھا وہیں ساکت ہو گیا۔ پھٹی ہوئی

آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ یہ سب کچھ اُن کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ مگر پھر بھی کچھ حوصلہ کرنے کے بعد اُن کا پردھان آگے بڑھا اور کھڑکا کر بولا کہ اسلحہ تو اُن کے پاس بھی ہے مگر زیب نہیں دیتا کہ وہ پولیس والوں پر ہاتھ اُٹھائیں، اِس لیے شرافت اِسی میں ہے کہ ایک طرف ہو کر حکیم اور اُس کے گھر والوں کو اُن کے حوالے کر کے دوکان خالی کر دی جائے۔

''اُوئے وادھو چبل آ..... تم یہ تڑی لگا کس کو رہے ہو.... محمد نواز جمعدار کو۔ میں تمہارے سات جنم سے واقف ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے پاس اسلحہ کتنا ہے۔ اِس سے پہلے کہ میں تجھے پکڑ کر حوالات میں ڈال دوں، جاتے دکھائی دو مجھے بھڑ وے کہیں کے''۔ یہ کہہ کر جمعدار محمد نواز نے سب کے آگے کھڑے ہوئے جوان کے منہ پر ایک ایسا ہاتھ رسید کیا کہ اُس کے ڈھاٹے میں سے وادھو نِکل آیا۔ وادھو نے شرمسار ہونے کی بجائے اُلٹا آکڑ دکھائی۔

''میں تجھے بھی جانتا ہوں جمعدار صاحب، چار چھلڑ رشوت کے پکڑ کر ایک کافر کی طرف داری کر رہے ہو، یہ سارے غازی اُس کے ساتھ ساتھ تجھے بھی جلا کر راکھ کر دیں گے۔ دُکان میری ہے اور حکیم کرائے دار، میں تو قبضہ لے کر رہوں گا۔'' وادھو کا یہ کہنا ہی تھا کہ تینوں سپاہی بندوقیں تان کر جمعدار کے سامنے آگئے اور اُن کے عقب میں سے فیاض بھی نِکل کر سامنے آگیا۔

''لالہ وادھو..... یونہی خوامخواہ اُبھر نہ توڑ۔ دُوکان حکیم صاحب کی تھی اور یہاں سے جاتے ہوئے وہ اِسے میرے نام کرا گئے ہیں۔ اور یہ ہے اِس کا کاغذ''۔ فیاض نے دور سے ایک سرکاری اِسٹامپ پیپر نکال کر اُسے دکھا دیا۔ فیاض کو دیکھ کر تو وادھو کا دماغ سوچنے سمجھنے سے بھی عاری ہو گیا۔ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے۔

''اوئے چل چل..... یہ سب جھوٹ ہے۔ سیدھی نیت سے حکیم کو باہر نکال نہیں تو دُکان کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی جلا کر راکھ کر دوں گا۔'' وادھو کچھ کچھ حوصلہ پا کر اب تڑیاں لگانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ اِتنی دیر میں دور کہیں گشت کرتے ہوئے باڈی گارڈز کے گھوڑوں کی ٹپ

ڑپ کی آوازیں آنا شروع ہوئیں تو وادھو کے ڈھاٹے باندھے ساتھی تیزی سے اِدھر اُدھر کھسک کر اندھیرے میں اندھیرا ہو گئے۔ جب کہ وادھو کو سپاہیوں نے قابو کر لیا۔ اُنہوں نے تو کُلاس لگائی سو لگائی، باڈی گارڈز نے بھی آ کر اُس کا کچومر نکال دیا۔ مُنہ سَر سوجا تو جمعدار محمد نواز کے کہنے پر کاں کُوڑا کرنے کے بعد پولیس چوکی روانہ کر دیا گیا۔ جب کہ دوکان کو لگی آگ، آگ بننے سے پہلے ہی بجھ چکی تھی۔

''کا کا! اب تو کسی کا خوف نہیں ناں.... یہ موزی تو گیا اب سرکار کی مہمانی میں۔ میں تو اب یہی دعا کر رہا ہوں کہ ہمارا بھائی حکیم صاحب اور اُس کا ٹبر کسی طور بارڈر کراس کر گیا ہو''۔

مغموم ہوئے فیاض نے جمعدار کو پھر بھی روک لیا کہ ہو سکتا ہے کوئی اور جتھا حکیم صاحب کی دُوکان کے سَر ہوا پھرتا ہو۔ وادھو تو کُھلا دشمن تھا، تبھی سامنے آ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اور چھپا وار داتیا تاک میں ہو اور وار کر کے چلتا بنے۔ فیاض کی بات سُن کر جمعدار محمد نواز جاتا جاتا رُک گیا اور گشت پر مامور پولیس اور باڈی گارڈ دستوں کو بھی ادھر نگاہ رکھنے کا کہہ دیا کہ نزدیک رہیں کہیں دور نہ چلے جائیں۔

وہی ہوا جس کا اندیشہ فیاض کو تھا۔ عشاء کی نماز سے کوئی گھنٹہ ایک بعد میں آنے والا جتھا ہو گا یہی کوئی پچیس تیس افراد پر مشتمل۔ اُنہوں نے بھی چہرے ڈھاٹوں میں چھپا رکھے تھے، ہاتھوں میں جلتی مشعلیں اور دور سے ہی نعرے لگاتے ہوئے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ شور شرابا سُن کر محمد نواز جمعدار اور اُس کے تینوں سپاہی باہر نکل آئے اور دور ہی سے جتھے کو آتا دیکھ کر وِسلیں بجانا شروع کر دیں تا کہ گشت والی پولیس اور باڈی گارڈ دونوں موقع پر پہنچ جائیں۔ لیکن پولیس اور باڈی گارڈز کے آنے سے پہلے ہی فسادیوں کا جتھا بالکل قریب آ گیا۔ اِس سے پہلے کہ وہ دکان کو آگ لگاتے یا قبضہ کرنے کی کوشش کرتے، جمعدار محمد نواز نے بازار والی سڑک کے وسط میں آ کر دو تین ہوائی فائر کیے اور تینوں سپاہی بھی اُس کے عقب میں پوزیشن سنبھالتے ہوئے سڑک پر گوڈی مار کر بیٹھ رہے۔

ہوائی فائرز کی آواز پر یہ دوسرا جتھا بھی ٹھٹک کر وہیں کھڑا ہوگیا۔ اُن کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ فائر کرنے والے لوگ کون ہیں اور یہاں کیسے آ گئے ہیں۔ اُنہوں نے تو بے فکر ہو کر حکیم اور اُس کے ٹبر کو جلا کر راکھ کرنا تھا مگر یہ کیا ہو گیا۔ شاید کوئی اور لوگ تھے کہ جنہوں نے اُن کے آنے سے قبل ہی حکیم کی دوکان پر قبضہ کر لیا تھا۔ اِس اُدھیڑ بُن میں اُنہوں نے مشعلیں اُونچی کر کے فائرنگ کرنے والے جوانوں کو پہچاننے کی کوشش کی تو ایسے گماں ہوا کہ جیسے پولیس والے ہوں۔ کسی نے آواز دی کہ حکیم نے جان بچانے کے لیے کرائے کے نقلی پُلسیے منگا کر بٹھا دیے ہیں۔ کسی دوسرے نے اُڑائی کہ وادھو نے دوکان ہتھیا کر اِس طرح کی بدمعاشی کا چکر چلا رکھا ہے۔ بہرحال طے یہی ہوا کہ چاہے جو بھی ہو اور چاہے جو بھی ہیں، حضرت صاحب کے حکم کی تعمیل ضرور ہو کر رہے گی۔ یہ طے کرنے کے بعد جتھے کے سبھی ساتھیوں نے پھر سے نعرے لگانا شروع کر دیے اور حکیم کی دوکان کی جانب چل پڑے۔ ابھی ایک دو قدم ہی اُٹھے ہوں گے کہ محمد نواز جمعدار نے دو تین فائر سڑک کے درمیان میں ٹھوک دیے۔ پتھروں کی چھوٹی چھوٹی چپڑیاں اُکھڑ اُکھڑ کر فسادیوں کے پیروں پنڈلیوں میں یوں لگیں کہ جیسے چھرے والی بندوق سے بوچھاڑ نکلتی ہے۔ اَبھی مدرسے کے یہ طالب علم سنبھلنے نہ پائے تھے کہ بوہڑ والے چوک کی جانب سے گھڑ سوار پولیس اور عیدگاہ کی طرف سے گھڑ سوار باڈی گارڈز دونوں نے گھیرا ڈال کر نکل بھاگنے کے راستے بند کر دیے اور پھر لوہے کی ٹوپی والی لاٹھیوں سے جو بھی وار کیے وہ سَروں پر کیے۔ کہاں گئیں وہ مشعلیں اور کدھر گئے وہ ہا ہو کے نعرے۔ چند لمحوں کے بعد سڑک بالکل صاف ہو چکی تھی۔ جسے جہاں سے، جس طرف سے موقع ملا اُس نے وہیں سے بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔

شور شرابا ختم ہو رہا تو فیاض دوکان سے باہر نِکل آیا۔ جمعدار نے اُسے دیکھتے ہی آواز دی۔ ''بیٹا تم ٹھیک کہتے تھے۔ یہاں کئی فسادی بے چارے حکیم کی جائیداد پر دیدے ٹکائے تاک میں ہیں۔ پتا نہیں اُدھر احمد پور والے مکان کا کیا بنا۔ بندوبست تو میں ٹھیک کر آیا تھا۔ مگر اِن حالات میں پھر بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اِس شہر میں حکیم کے خاندان نے باپ دادا سے حکمت

کرتے ہوئے ہزاروں لوگوں کو نئی زندگی دی ہوگی مگر آج صرف ایک ہی شب میں نہ تو اُس کی جان محفوظ رہ پائی ہے اور نہ ہی جائیداد۔ میرے دوست حکیم نے سمجھداری کی اور میرا کہا مان کر بارڈر پار کرنے روانہ ہوگیا ہے وگرنہ جو حالات ہیں، اُن میں آج نجانے کیا ہو چکا ہوتا۔''

فیاض کی عمر کے نوجوانوں کے لیے یہ سب کچھ ایک معمہ سا تھا۔ باہر کی صورت حال کے احساس سے اُس کا چہرہ اُتر گیا۔ دماغ کچھ سمجھنے سے قاصر اور زندگی پھر سے ایک نئے گرداب کے دہانے پر۔ وہ دکان کے اندر جانے لگا تو جمعدار محمد نواز نے ایک بار پھر اُسے تسلی دی کہ بیٹا تم آرام کرو، میں صبح تک بیٹھا ہوں باہر۔ بس کل کے دن کا سورج طلوع ہو جائے پھر اللہ نے چاہا تو سب بہتری ہی بہتری۔

(24)

حکیم رام لعل کا چوری چھپے بُری سمیت بارڈر کی طرف نکل جانا فسادیوں کے منصوبوں کو تو ضرور اُجاڑ گیا مگر فیاض کے لیے عذابوں کا ایک لا متناہی سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ جو ختم ہونے کو ہی نہیں آ رہا تھا۔ محمد نواز جمعدار صحیح النسب مردوں کی طرح ہر مشکل گھڑی میں کسی لوبھ لالچ کے بغیر اُس کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا رہا۔ بس اُسے فکر لاحق تھی تو یہی ایک کہ حکیم رام لعل کی کوئی خبر کہیں سے نہیں آ رہی تھی۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ گئے تو گئے کہاں! البتہ اتنا ضرور باعثِ اطمینان تھا کہ اُس نے حکیم کی دُکان کے ساتھ ساتھ گھر کو بھی قبضہ گیروں سے بچالیا تھا۔

شروع شروع میں تو وادھوا اور اِمام صاحب، دونوں نے دوکان کے لیے بہت جتن کئے کہ کسی طور فیاض کمزور پڑ جائے یا کسی لالچ میں آ جائے مگر جب کچھ بھی نہ بنا تو اُس پر مقدمے ٹھوک دیے گئے۔ اُن دنوں احمد پور میں انور نام کے ایک نوجوان وکیل نے نیا نیا پَھٹا لگایا تھا۔ جمعدار صاحب نے دونوں دعویٰ جات اُس کے ذمے لگا دیے۔ اُدھر حکیم صاحب بھی فیاض کے حق میں رجسٹریاں کرا کے تگڑا کام کر گیا تھا اِسی سبب دونوں مقدمے دیکھتے ہی دیکھتے داخل دفتر ہو گئے۔ مقدمات سے جان چھوٹی تو پنچائتیں شروع ہو گئیں کہ فیاض دوکان مسجد کے نام لگوا دے،

اِس کے کون سے باپ کی ہے۔ دوکان اگر فیاض کی اپنی رہی ہوتی تو وہ شاید مان بھی لیتا مگر اب دنیا کو کیسے بتاتا کہ یہ سبھی کچھ اُس کے پاس امانت ہے کسی اور کی۔ اور اگر اصل مالک آ پہنچا تو وہ کیا منہ دکھائے گا اُس کو۔ پنچائیتوں سے بھی کام نہ نکلا تو اُس کے خلاف ہر نماز کے بعد تبرا شروع کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو ٹانواں ٹانواں مریض مطب پر آ جایا کرتے تھے وہ بھی آنے سے کترانے لگے۔

اُدھر احمد پور والے گھر کو ہتھیانے کے واسطے پہلے تو پیری بدمعاش نے بدمعاشی کی مگر جب جمعدار محمد نواز درمیان میں آیا تو وہ خود ہی اِدھر اُدھر ہو گیا۔ ابھی پیری کے گڑ کار کی گرد اُڑ ہی رہی تھی کہ فیاض کا چچا رال ٹپکاتا ہوا آ گیا۔ پہلے تو اپنی ڈیرہ داری کے لیے مکان عارضی طور مانگا مگر جب فیاض انکاری ہوا تو حقہ پانی بند کرانے کی دھمکیوں کے بعد محکمہ متروکہ وقف املاک میں عرضی ڈال دی کہ یہ مکان اور ڈیرہ نواب والی دوکان دونوں ایک ہندو کی متروکہ جائیدادیں ہیں مگر فیاض نے حکومت کو دھوکہ دینے کے لیے اِن کی ملکیت کے جعلی کاغذات اپنے نام بنوا لیے ہیں اِس لیے محکمے کا فرض ہے کہ اِن جائیداد ہائے کو قبضے میں لے کر ہندوستان سے آنے والے مہاجروں کو اَلاٹ کرے۔

جائیدادوں کا قیمتی ہونا اور خود سگے چچا کا مخبری کرنا فیاض کے لیے اچھا بھلا عذاب بن گیا۔ محکمے کے اَفسر نے کاروائی شروع کرنے سے پہلے فیاض کو نرمی سختی ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کسی طرح کچھ دینے دلانے پر تیار ہو جائے مگر اِدھر فیاض کو بھی اپنے کاغذات کے سچے ہونے کا مان تھا، تبھی اُس کے تئیں رشوت کس لیے۔ مگر اَفسر بھی ہٹ دھرمی میں ٹیٹی واقع ہوا تھا۔ اُس نے بھی کیس بنا کر ہیڈ آفس میں بھجوا دیا اِس حکم نامے کے ساتھ کہ جب تک اوپر سے کوئی فیصلہ نہیں آتا، فیاض نہ تو مکان میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ ہی دوکان میں۔ فیاض ہر طرف سے گھیرے میں آ گیا تو ایک بار پھر جمعدار محمد نواز ہی کام آیا جس نے اَنور وکیل سے کہہ کر نہ صرف دیوانی عدالت میں محکمے کے حکم کے خلاف دعویٰ کرا دیا بلکہ اُس کے حق میں سٹے بھی ہو گیا کہ

مقدمے کے فیصلے تک وہ جیسے چاہے مکان اور دوکان کو استعمال کر سکتا ہے۔ یہ سٹے ہونے سے معاملہ اگرچہ طوالت کی نذر ہو گیا مگر آس پاس اور بجن دشمن میں ٹھنڈ پڑ گئی کہ عدالت کا حکم امتناعی فیاض کے حق میں ہے۔ لہذا جو بھی دخل دے گا وہی اندر ہو گا۔ پیشی پر پیشی ہوتی رہی اور ہر پیشی وہ بھی دو تین ماہ بعد کی۔

حالات کچھ گرفت میں آئے تو مطب کی رونقیں بحال ہونا شروع ہو گئیں۔ وادھو نے اَب تڑیاں لگانا تو چھوڑ دی تھیں مگر پھر بھی ماتھے پر بَل جوں کے توں۔ آتے جاتے فیاض سے ٹوک بازی الگ۔ کسی وقت اگر فیاض کو کسی چھوٹی موٹی چیز کی ضرورت ہوتی تو اُسے بوہڑ والے چوک سے منگانی پڑتی کہ وادھو کی طرف سے ہمیشہ انکار۔ فیاض آہستہ آہستہ عادی ہوتا چلا گیا کہ چار چفیر دشمنی کے ماحول میں بھی جینے کی رَمز کیسے تلاش کی جاتی ہے مگر دن بھر کی مشقت کے بعد جب رات اپنا دامن پھیلانے لگتی تو یہ سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا کہ نجانے حکیم صاحب اور اُن کی ٹبری کس حال میں ہوگی! نئی جگہ پر جا کر اپنی پہچان کرانی کتنی مشکل ہوتی ہوگی خاص طور پر اُس وقت کہ جب ایک بڑی پہچان بن چکنے کے بعد انسان ایکدم خود اپنے تل وطنیوں میں بھی اجنبی ہو کر رہ جائے۔

ریاست کے حالات ہر آنے والے دن کے ساتھ ہی عجیب سے عجیب ہوتے جا رہے تھے۔ جن دنوں فیاض کو حکیم صاحب کے مطب اور اُس کے گھر کو قبضے گیروں سے بچانے کے لیے جان مارنی پڑ رہی تھی اُنہی دنوں پاکستان بننے کے ڈیڑھ مہینے بعد اکتوبر میں نواب صادق محمد خان خامس عباسی نے ریاست کے انڈیا کی بجائے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ اِس فیصلے کی توقع کی جا رہی تھی مگر پھر بھی ریاست کی مسلمان آبادی نے اِس فیصلے کو سَر آنکھوں پر رکھا اور کئی دنوں تک جشن منانے کا اہتمام کئے رکھا۔ مگر اگست اور اکتوبر کے اِس درمیانی عرصے میں ریاست کی ہندو اور سِکھ آبادی تقریباً تقریباً ریاست کو الوداع کہتے ہوئے بھارت روانہ ہو چکی تھی۔ اُس وقت اگرچہ ریاست میں پاکستانی قوانین لاگو نہیں ہوئے تھے مگر پھر بھی مشرقی پنجاب

سے آنے والے مہاجروں کی ایک بہت بڑی تعداد متروکہ ہندو اور سکھ جائیدادوں پر قبضہ کرنے کے لیے ریاست کے ہر اُس شہر میں پہنچ گئی تھی کہ جہاں قیمتی اور وسیع و عریض سکنی اور تجارتی جائیدادوں کی سُن گُن مِل رہی تھی۔

اِس دوران نواب صاحب نے نئے مُلک پاکستان کی ہر قسم کی امداد کرنے کے علاوہ ریاست چھوڑ کر جانے والی ہندو اور سکھ آبادی کی حفاظت کے لیے حفاظتی انتظامات اور کوششوں میں اِس قدر ذاتی دلچسپی لی کہ سبھی قافلے باامن وامان ریاست سے روانہ کئے گئے کیوں کہ اس سے پہلے ہی مقامی فسادیوں اور قبضہ گیروں کو نتھ ڈالی جا چکی تھی۔ لیکن ایک بات ضرور تھی۔ اگرچہ پاکستان میں شامل ہونے والی باقی دس ریاستوں کی طرح بہاول پور کا ریاستی وجود بھی ابھی تک قائم تھا لیکن ستمبر 1948ء میں قائداعظم کی وفات کے بعد پاکستانی حکمران اشرافیہ کا نواب بہاول پور کے ساتھ رویہ اُس طرح کا نہ رہا کہ جیسا قائداعظم کی زندگی میں ہوا کرتا تھا۔ اس ناروا سلوک نے نواب صاحب کو جذباتی لحاظ سے اِس قدر صدمے سے دوچار کیا کہ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے۔ نتیجتاً جب پاکستان کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے ریاست کو 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ایک صوبے کے طور پر پاکستان میں شامل کرنے کے لیے دباؤ ڈالا اور ڈلوایا تو نواب صاحب بالکل ہی برداشت نہ کر سکے اور چُپ چاپ اِس بارے میں ہونے والے معاہدے پر 30 اپریل کو دستخط کر دیے کہ جس کے تحت دفاع، مواصلات اور خارجہ امور مرکزی حکومت کے حوالے کرنے کے بعد بہاول پور میں 49 ممبران پر مشتمل صوبائی قانون ساز اسمبلی کے الیکشن کرا دیے گئے کہ جس نے 1952ء سے اپنا کام شروع کرنا تھا۔ باقی کے محکمے صوبائی قرار دے کر بدستور سابقہ ریاست کے پاس رکھے جانے کے ساتھ ساتھ نواب صاحب کو صوبے کا آئینی سربراہ بھی تسلیم کر لیا گیا۔ البتہ کہہ دیا گیا کہ یہ بندوبست دیگر دس ریاستوں میں بطور مثال کے اختیار نہیں کیا جائے گا۔

ریاست کے بعد صوبہ بننے کے اِس عمل نے عوامی زندگی کے ہر پَکھ کو ہلا کر رکھ دیا۔

ریاستی ملازموں کی ایک بڑی تعداد ملازمتوں سے فارغ ہو کر گھروں کی ہو رہی۔ ہڈیوں ٹوٹا تو کما کھائے مگر دِل ٹوٹا کیسے کمائے والا حال تو پہلے ہی تھا مگر ان کے شب و روز کو مزید پاتال میں دھکیل دیا یہاں آباد ہونے والے مہاجروں نے کہ جنہوں نے اپنی محنت سے پوری سابقہ ریاست کے کاروبار خاص طور پر جنس اجناس کی منڈیوں کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا اور یوں مقامی آبادی صرف اپنے گُزرے کل کو یاد کر کے آنسو بہانے پر لگ گئی۔

کبھی فرصت ملتی تو فیاض مطب کی بیرونی تَھلی پر موڑھا رکھ کر بیٹھ جاتا۔ وادھو کی دُکان تو اب بھی موجود تھی مگر مال اسباب سے خالی۔ نہ کوئی چلت نہ کوئی دُکانداری۔ اُسے یہی وہم کہ رب نے بیٹا تو عطا کیا ہے مگر پرلے درجے کا منحوس۔ جب سے پیدا ہوا ہے دُکانداری برباد ہو کر رہ گئی ہے۔ اِس لیے نہ تو اُسے گود اُٹھاتا اور نہ ہی اِدھر اُدھر کھلانے یا بہلانے لے جاتا۔ ماں کچھ کہے یا بیوی، وادھو سُنی اَن سُنی کر دیتا۔ ویسے بھی آس پاس کے حق ہمسائے یہی کہتے تھے کہ اچھا ہوا کہ بیٹا ماں پر گیا ہے باپ کی طرح بڑے کانوں والا ''کنیلا'' نہیں ہوا۔ بیٹے کو منحوس سمجھنے والے کو کون سمجھائے کہ اگر دُکاندار ہی اصل سرمائے کو کھانے پر آ جائے تو دکان کیا خاک چلے گی۔ یہی حال کم و بیش دھچر کا کہ جس کے پاس کبھی کبھی کوئی گاہک آ ہی جاتا تھا۔ مگر اب نہ وہ پہلے والی سج دھج کے فالودے اور نہ ہی عیش عیاشی والی ربڑی مَلائیاں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈیرہ نواب کے پورے بازار میں نحوست اپنا دوپٹہ پھیلا کر بیٹھ گئی۔ فیاض کو بیتے دن یاد آتے تو کلیجہ منہ کو آ جاتا۔ کوئی وقت تھا کہ وہ اپنی پہچان کی تلاش میں سرگرداں رہاں کرتا تھا مگر اب تو پوری ریاست کی پہچان گرداب کی گردشوں کا لقمہ ہو چکی تھی۔ حالات دگرگوں ہوئے تو نواب صاحب نے ولایت میں بسرام کو ترجیح دی اور اِدھر شہزادوں نے محلات سے باہر نِکلنا چھوڑ دیا۔ خوشامدی ملازم دن رات اُن کے روبرو تاش کی بازی جمائے رکھتے اور اگر وہاں سے بیزاری ہوئی تو مُٹھی چاپی اور نیند کی وادیوں میں جھولے پے جھولا۔

صاحبزادے کہلائے جانے والے نواب صاحب کے دور نزدیک کے رشتے دار بھی

بے روزگار ہوئے تو پہلے پہل چاپلوس سنگت کی واہ واہ کے سرور میں کچھ دن گزار تو گئے مگر جب جیب خالی ہوئی تو سنگت ساتھ بھی بُرڑ ہا یعنی ہوا۔ اُلٹا تو کون اور میں کون۔ مقدر سے جھگڑا تو کسی طور نہیں بنتا تھا مگر یہ صاحبزادگان مونچھوں کو بَل دے کر بوہڑ والے چوک میں رنگلے پایوں والی چارپائیاں بچھوا کر مرغ اور بٹیر لڑوانے کے محبتی بن بیٹھے۔ کسی نے ساوی کا پیالہ پلا دیا تو کسی نے چلم کا سُوٹا لگوا دیا۔ شروع شروع میں تو اُن کے گھروں سے چنگا چوکھا کھانا پکوا کر چوک ہی میں منگا لیا جاتا مگر کچھ دنوں کے بعد نوبت دال تک پہنچی تو اُن کے چوک میں آ کر بیٹھنے کے باوجود کوئی سلام بھی نہ لیتا۔ بازار کے دکانداروں نے اُدھار سودا دینے سے کترانا شروع کیا تو عزت بے عزتی گھروں سے نِکل کر چوک بازاروں میں آ گئی۔

اُدھر احمد پور میں حال تو کم وبیش یہی تھا مگر فرق یہ کہ یہاں نہ تو کوئی شہزادے تھے اور نہ صاحبزادے بس مقامی یا پھر مہاجر۔ مقامیوں کا حال اِس لیے بھی ابتر کہ ریاستی شناخت کے خاتمے اور نواب کے ولایت میں ڈیرہ لگانے کے سبب یوں لگتا تھا کہ جیسے یتیمی نے گھیرا ڈال لیا ہو۔ تبھی تو نہ گھر میں دل لگتا اور نہ ہی کسی کام کاج میں جب کہ مہاجروں نے ہر اُس دوکان کو سنبھال لیا جہاں تھوڑی سے بھی خریداری یا لائی چلائی کا امکان ہو سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شہر کا تمام کاروبار اُن مہاجروں کے ہاتھ میں آ گیا جو ریاست کو اپنی پہچان بنانے کو تیار نہیں تھے اور مقامی لوگ، ریاستی ہوتے ہوئے بھی غربت اور احساس کمتری کے کولہو میں اِس طرح آئے کہ اپنے گھر میں ہی اپنی شناخت گم کر بیٹھے۔ بہاول پور ریاست، صرف نام کی حد تک صوبہ بننے کے بعد مہاجر اور مقامی آبادی کا ایسا غیر فطری سنجوگ بن کر رہ گئی کہ جہاں بود و باش رکھنے والے کسی فرد کی بھی کوئی پہچان باقی نہیں رہی تھی۔ کیا نئے کیا پُرانے سبھی لُنڈے لَنڈ ورے، اَدھ ادھورے لوگ۔

فیاض کے چچا کی طرف سے مخبری والے واقعے کے بعد اُلٹا فیاض کے ابا اور دیگر رشتہ داروں نے بول چال، آنا جانا اور ملنا ملانا بھی چھوڑ دیا۔ اماں تو پھر بھی کسی وقت آ کر مل جاتی تھی مگر شوہر سے چوری چھپے کیونکہ اُس نے فیاض کے محراب والا آنے پر بھی پابندی لگا رکھی تھی۔ سب ایک

ہی بات سے نالاں تھے کہ اس منحوس نے مفت ہاتھ آئی کراڑ کی جائیداد سگے چچا کو عارضی طور پر بھی بیٹھنے کے لیے نہیں دی۔ اس بات پر چچا سے کوئی ناراض نہیں تھا کہ اُس نے بھتیجے کے خلاف مخبری کر کے اُسے کچہری کا منہ دکھا دیا تھا۔ حد تو یہ ہوئی کہ محراب والا کی پوری بستی پھر بھی چچا کی حمایتی اور اُسی کے ساتھ ایک جان ایک زبان۔ اماں نے بھی کئی بار سمجھایا کہ پتر دفع کر، دے دے مکان چاچے کو، کہاں سے وہ موا کراڑ ہندوستان سے واپس آ رہا ہے۔ مگر فیاض کے ہر بار انکاری ہونے کے بعد وہ بھی کنارا کر کے بیٹھ گئی۔

جب کبھی فیاض کو اپنی بستی اور اپنا گھر یاد آتا تو وہ تڑپ کر رہ جاتا۔ سوچتا کہ دفع کرے، مکان چاچے کے حوالے کر دے مگر جب یہ چوبھ لگتی کہ حکیم صاحب لوٹ آیا تو وہ اُسے کیا منہ دکھائے گا تو وہ پھر سے دل کو مضبوط کر لیتا۔ فیاض ''ہاں'' اور ''ناں'' میں ڈبکیاں اس لیے بھی کھا رہا تھا کہ حکیم صاحب کے اِس مکان نے اُسے اُس وقت اپنے ہونے کی پہچان عطا کی تھی کہ جب وہ نہ ہونے کے اندھیروں میں ٹامک ٹویاں مارتا پھر رہا تھا۔ جب کوئی اُس پر اعتماد تک بھی نہیں کرتا تھا، اُس وقت حکیم صاحب نے گھر کا فرد بنا کر اُسے مان دیا اور تُلسی جیسی حسین لڑکی نے اپنا آپ حوالے کرنے کی بنیاد رکھ کر اُس مان کو آسمان جتنا بلند کر دیا۔ اب وہ صرف چچا کے لوبھ کی بہتی رالیں پونچھنے کے لیے اِس سب کچھ کو کیسے توڑ پھوڑ ڈالے، راکھ اور خاک کر دے۔ فیاض کو یہ مکان بہاول پور کی ریاست کی مانند لگتا تھا کہ اگر یہ ہے تو اِس کی پہچان کی امید بھی ہے اور اگر نہیں تو کسی بہت بڑے میلے میں گمشدہ بچے کی طرح نہ کوئی پہچان اور نہ ہی نام ونشان۔

فیاض کے ساتھ ایک عجیب واردات یہ بھی ہوئی کہ اُسے اُس شب کی کوئی بات یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آتی تھی کہ جب وہ حکیم رام لعل کی ڈیوڑھی میں سویا تھا مگر ڈیرہ نواب سے رخصت ہوتے ہوئے تُلسی کا اُسے آنکھیں بھر کر دیکھنا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں دبا لینا بھلائے نہیں بھول رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے تُلسی کی انگلیوں کی تمازت سے کوئی جیتی جاگتی دوشیزہ اُس کے جسم میں حلول کرنے کے بعد چوکڑی جما کر بیٹھ گئی ہے کچھ اِس

طرح کہ نہ تو اُس حدت کے احساس میں کہیں کوئی کمی ہوتی محسوس ہوتی اور نہ ہی اُس مہ وش کا وجود اُس کے وجود سے باہر آنے کو تیار۔ کوئی قیدی قید تھی کہ اُس کے اندر اُتر چکی ایک عورت کے جزو نے اُس کے کُل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا یا کسی بندی نے پورے بندی خانے پر اپنی عملداری کا اعلان کر دیا تھا۔

یہ بھی تو انوکھی بات تھی کہ فیاض کو تُلسی یا تُلسی کے ٹبر کی کبھی اُس طرح فکر نہ ہوئی تھی کہ جیسے محمد نواز جمعدار کو ہوتی تھی۔ اُس کے آنے پر ہی فیاض کو خیال آتا کہ اتنے عرصے سے اگر حکیم صاحب کی ٹبری کا کچھ اَتا پتا نہیں تو معلوم ہی کر کے دیکھنا چاہیے۔ مگر جب چاچا جمعدار واپس چلا جاتا تو فیاض کے بھیتر پھر وہی ساری آماں گھاماں اور رنگ رونقیں ویسے ہی شروع ہو جاتیں کہ جیسے حکیم رام لعل کے ہوتے ہوئے ہوا کرتی تھیں۔ چند ماہ بعد جب جمعدار محمد نواز بھی رخصت ہو گیا تو فیاض کا کوئی بانہہ بیلی، کوئی سہارا باقی نہ رہا۔ ویسے بھی ڈیرہ نواب کے بازار میں جب بھوک نے ڈیرے جما لیے تو نفسا نفسی میں کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ ہر آنے والا دن اگرچہ فیاض کے لیے سماجی اعتبار سے سُکھ کے سندیسے لانا شروع کر چکا تھا مگر اُس کے اندر کا اندھیرا پہلے سے زیادہ سیاہ اور ہیبت ناک کہ جس کے ہوتے ہوئے اُس کی پہچان کا سفر ہر قدم پر فزوں تر ہونے کی بجائے معکوس سمت میں اُترتا چلا جا رہا تھا۔

(25)

نوزائیدہ مملکت پاکستان میں سیاسی استحکام کا نہ ہونا، پاکستان کے ساتھ ساتھ، ظاہری طور پر صوبائی حیثیت پانے والی سابقہ ریاست بہاول پور کو بھی سیاسی، معاشی اور سماجی طور پر بکھیر کر روبہ زوال کر رہا تھا۔ اپنی آئینی سربراہی کے باوجود ولایت میں ڈیرا جمائے نواب صادق محمد خان خامس عباسی نے بھی بہت کم اِدھر کا رُخ کرنا۔ نتیجہ کیا نکلا کہ ہندوستان میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو خبر ہوگئی کہ یہاں کی قیمتی اراضی ٹکے ٹوکری ہو چکی ہے لہذا 1950ء کے بعد بہت سی آبادی ایسی بھی بھارت کے مختلف علاقوں سے سابقہ ریاست بہاولپور میں آکر آباد ہوگئی کہ جس کی نگاہ صرف زرعی اراضیات پر تھی۔ نواب جب کبھی اِدھر آتا اُسے اپنے بدنیت اور خائن عمال سے یہی رپورٹ ملتی کہ مقامی آبادی کام چور ہے، آلسی ہے لہذا زمینیں اُن کو دی جائیں جو آبادکاری کا گر جانتے ہیں۔ نواب صاحب اِن نئے لوگوں پر اتنا مہربان ہوا کہ زمینیں تو عطا کیں سو کیں، اسٹامپ پیپر کے آٹھ آنے بھی سرکاری خزانے میں سے ادا کرنے کا حکم دے دیا۔

یہ وہ دور تھا کہ جب بیوروکریسی نے پاکستانی حکومت اور سیاست، دونوں کو سیاست دانوں کے ہاتھوں سے پھسلا کر اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ ملک غلام محمد گورنر جنرل بن بیٹھا اور

وزیراعظم محمد علی بوگرہ۔ مشرقی بنگال کی عوامی اکثریت کا گلا گھونٹنے کے لیے ملک غلام محمد نے سوچا کہ ادھر کے سبھی صوبوں کا ایک یونٹ بنا کر اُس کا نام رکھ دیا جائے مغربی پاکستان اور اُدھر کے یونٹ کا نام مشرقی بنگال کی بجائے مشرقی پاکستان، تا کہ بنگالیوں کے ساتھ برابری کی سطح پر آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کی جا سکے۔ اس تجویز کا باضابطہ اعلان کرتے ہوئے وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے کہا کہ اب کوئی بنگالی، پنجابی، سندھی، پٹھان، بہاول پوری یا خیر پوری نہیں ہوگا۔ اس اعلان کا اُلٹا اثر جتنا کہ سندھ، سرحد اور خیر پور کے عوام پر ہونا تھا سو ہوا مگر بہاول پور کی مقامی آبادی جو پہلے ہی اپنی گم کر دی گئی شناخت کے کُھرے تلاش کرتی پھر رہی تھی، اِس نئی آندھی کے بعد تو بالکل ہی گرد و غبار میں اَٹ کر اپنی رہی سہی شناخت بھی گنوا بیٹھی۔ یہاں کے لوگوں کو ایسے لگا کہ بنگالیوں کی شناخت مِٹانے کی کوشش میں سندھی، پشتون اور ریاستیوں کی شناخت پر جھاڑو پھیر دیا گیا ہے۔

سات دسمبر 1954ء کو پاکستان کے نویں وزیراعظم چوہدری محمد علی نے نواب بہاول پور کی گردن پر پاؤں دھرتے ہوئے بہاول پور کے صوبہ مغربی پاکستان میں شامل کئے جانے کے معاہدے پر دستخط کرا لیے۔ پوری ریاست کی مقامی آبادی اِس جبری شمولیت پر باقی ماندہ چھوٹی قوموں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کُھلی مخالفت پر آ گئی۔ اُن کو یہ توقع نہیں تھی کہ نواب صاحب سابقہ وزیراعظم محمد علی بوگرہ کے پاکستان میں شامل ہو چکی قدیم ثقافتوں اور اُن کی زبانوں کا مذاق اُڑانے والے بیان کے بعد بھی وہ وَن یونٹ میں شامل ہونے پر تیار ہو جائیں گے۔

بہاول پور کے ریاستیوں کی تاریخ، تہذیب، ثقافت، زبان اور خود مختیاری کا مول بتیس لاکھ روپے لگایا گیا تو نواب صاحب یہ وظیفہ بھی جیب میں ڈال کر پھر سے ولایت روانہ ہو گئے۔ اِس معاہدے کی رو سے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی نے 30 ستمبر 1955ء کو ویسٹ پاکستان ایکٹ منظور کر لیا جس پر عمل درامد چودہ اکتوبر سے ہونا تھا۔ یہ چودہ دن احمد پور اور ڈیرہ نواب کے لوگوں پر بہت گراں گزرے۔ ڈیرہ نواب میں تو معاملہ صرف ہڑتال تلک رہ گیا مگر احمد پور میں ہڑتال کے ساتھ ساتھ جلسے جلوسوں نے عوامی زندگی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ لوگوں نے اِسے باقی ماندہ

پاکستانی اِکائیاں کے خلاف پنجابی سازش کے طور پر لیا کہ جس کا مقصد گریٹر پنجاب قائم کرنا تھا۔
وَن یونٹ کے رَدِعمل میں فوری طور پر خان عبدالغفار خان نے ''اینٹی وَن یونٹ فرنٹ'' کے نام سے سابقہ صوبہ سرحد میں ایک سیاسی تنظیم قائم کی۔ اِس تنظیم نے بہت جلد اُن علاقوں میں زور پکڑ لیا کہ جو وَن یونٹ کے سبب اپنی لسانی اور ثقافتی پہچان گم کر چکے تھے۔ اِس تنظیم کا فوری مقصد وَن یونٹ کا خاتمہ اور خاتمے کے بعد متاثرہ ثقافتوں کی بحالی تھا مگر کچھ اِس طرح کہ ریاستوں کی سابقہ پہچان سے اُلگ کوئی اور شکل لیکن بہاول پور کو اِس لیے استثناء حاصل تھی کہ یہ ثقافت کے ساتھ ساتھ لسانی طور پر بھی علیحدہ شناخت کا حامل تھا۔
فیاض کو اِس سیاسی تنظیم میں اپنی گمشدہ پہچان کی جھلک دکھائی دینے کی امید دکھائی دی تو اُس نے اِس کا ورکر بننے میں ذرہ سی دیر بھی نہ لگائی۔ کیسا انقلاب تھا کہ جس نواب کی چاکری اُس کے اجداد کی شناخت اور عزت آبرو کا باعث تھی، اب اُسی نواب کے خلاف، اُنہی چاکروں کا بیٹا گلی گلی محلے محلے تقریریں کرتا پھر رہا تھا۔ وَن یونٹ کے خلاف نعرے لگاتے وقت فیاض کے سامنے اُس باپ کا چہرہ ہوا کرتا تھا کہ جس نے اُس کی بقا کی کوشش میں اُس کا ساتھ دینے کی بجائے اپنے غاصب بھائی کا ساتھ دیا تھا۔ اگر محمد نواز جمعدار اُس کی مدد کو نہ آیا ہوتا تو چاچے کی مخبری کے بعد اُس کے جیل جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ وَن یونٹ کے خلاف تقریریں کرتے وقت فیاض کو کہیں کہیں اپنے باپ کی صورت میں نواب بہاول پور کا بھی شائبہ ہوتا شاید اِس لیے کہ دونوں نے اپنی اپنی جگہ اُس کی تل وطنی پہچان کا سفر کھوٹا کیا۔ فیاض کا باپ اپنے بیٹے سے اِس لیے نفرت کرتا تھا کہ اُس نے نواب کا باڈی گارڈ بن کر اُس کی مَن منشا پوری نہیں کی تھی اور نواب اِس لیے اپنی ریاست سے بھگل کہ سَن سینتالیس کے حالات کی جکڑ بندی میں سے اپنے قدموں کے زور پر نکلنا اُس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اینٹی وَن یونٹ تحریک میں شامل ہونے کے بعد تُلسی کو پھر سے دیکھنے کی آرزو اور ریاستی جھوک کے ایک صوبے کی صورت آباد ہونے کی خواہش، دونوں اِس تحریک کا مقصد بن کر رہ گئے تھے۔ اِن سبھی مقاصد کا نکتہ مُنتہا تو ایک ہی تھا کہ

اپنی تہذیبی، ثقافتی اور لسانی شناخت کی رکھوالی۔

اینٹی وَن یونٹ فرنٹ کی قیادت نے بہت جلد وَن یونٹ ٹوٹنے کی صورت میں مغربی پاکستان کے پانچ صوبے یعنی پنجاب، سندھ، بلوچستان، سرحد اور بہاول پور بنانے کا مطالبہ کر دیا کیونکہ الگ صوبہ بنانے کی پانچ شرائط تھیں؛ جغرافیائی لحاظ سے طبعی وجود، معاشی خود کفالت، انتظامی سہولت، مستقبل میں ترقی کرنے کی صلاحیت اور لسانی اقدار کا تحفظ کرنے کی اہلیت۔لیکن فیاض جیسے ہزروں ورکروں کے ذہنوں میں اُس وقت مایوسی کے ساتھ ساتھ ایک نئے قسم کے ردِ عمل نے بھی اُبھرنا شروع کر دیا جب فرنٹ کے مرکزی قائدین خان عبدلغفار خان اور عبدالصمد خان اچکزئی کو گرفتار کرنے کے بعد اُن کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں بغاوت کے مقدمے کی سماعت کا واقعی آغاز کر دیا گیا۔ فیاض کو معلوم ہوا کہ عبدالصمد خان اچکزئی کی پیروی بہاول پور کا وکیل ریاض ہاشمی کر رہا ہے تو اُس نے ہفتے میں ایک بار چھٹی والے دن ریاض ہاشمی وکیل کے ڈیرے پر جانا شروع کر دیا جہاں وکیل صاحب کی لاہور سے واپسی پر آٹھوں پہر سینکڑوں لوگوں کا اکٹھ ہونا شروع ہو گیا تھا۔

ریاض ہاشمی وکیل کو پورا یقین تھا کہ نہ صرف دونوں لیڈر مقدمے سے بری ہو جائیں گے بلکہ وَن یونٹ ٹوٹنے کے نتیجے میں بہاول پور کی صوبائی حیثیت بھی بحال ہو جائے گی۔ ریاض ہاشمی وکیل کی شکل میں فیاض کو اپنی گمشدہ شناخت تک رسائی کی راہ دکھائی دینے لگی تھی۔ اُس کے من میں پھر سے وہی جوش اور جذبہ جاگ اُٹھا جو پاکستان کے قیام کے دنوں میں ایک نئی اُمید کی لہر بن کر بدن کے مسام مسام میں رقصاں ہوا کرتا تھا۔ فیاض سمیت ریاست کی پوری نئی نسل کا خواب تھا کہ بہاول پور پاکستان کا حصہ بنے جہاں وہ اپنی لسانی، ثقافتی اور تہذیبی پہچان کے ساتھ اِس نوزائیدہ مُلک کی تگڑائی کا باعث ہوں گے۔ اگرچہ وَن یونٹ کے قیام نے ریاستی نوجوانوں کی سبھی اُمیدوں کو ڈالے پھالے کر دیا تھا مگر اب اُمید بندھ گئی تھی کہ وَن یونٹ ٹوٹنے کی صورت میں مصائب کے شب و روز ختم ہونے والے ہیں۔

فیاض نے اپنے مطب کے باہر ''اینٹی وَن یونٹ فرنٹ'' کے دفتر کا بورڈ لگا دیا اور آنے جانے والوں کے ساتھ وہ سبھی باتیں سانجھی کرنی شروع کر دیں کہ جو وہ ہر ہفتے ریاض ہاشمی وکیل کے ڈیرے سے سُن کر آیا کرتا تھا۔ بہت ہی جلد اُس نے ڈیرے کے بازار کے دُکانداروں سمیت کچھ نوجوانوں کا ایسا گروپ تیار کر لیا جو نہ صرف اُس کی بات سُنا کرتے تھے بلکہ اُس سے سُن کر آگے بھی بڑھاتے تھے۔ یہ گروپ بننے کے بعد فیاض کی حیثیت ایک چھوٹے موٹے قوم پرست سیاسی لیڈر کی ہوگئی کہ جسے ریاض ہاشمی وکیل کے علاوہ احمد پور اور ڈیرہ نواب میں کام کرنے والی دیگر سیاسی پارٹیوں کے مقامی رہنما بھی توجہ سے دیکھنے اور سننے لگ گئے تھے۔

لیکن یہ اُمید افزاء صورت حال بہت جلد مایوسی میں بدلنا شروع ہوگئی۔ خان عبد الغفار خان کے وکیل میاں محمود علی قصوری نے بہر طور فرنٹ کی قیادت کو راضی کرنے کے بعد اپنی سیاسی پارٹی ''آزاد پاکستان پارٹی'' کو فرنٹ میں ضم کرا کر دونوں کے ملاپ سے نئی سیاسی جماعت ''نیشنل پارٹی'' کی بنیاد رکھ دی جس نے پہلا وار ہی بہاول پور صوبے کے مطالبے پر کیا۔ وَن یونٹ کے خاتمے کے بعد اگر چہ چار صوبوں کے علاوہ پانچویں صوبے کا مطالبہ بھی نیشنل پارٹی کے مقاصد میں شامل تھا مگر اِس کا نام بہاول پور ختم کر کے ''کوئی بھی دیگر صوبہ'' کر لیا گیا۔ اِس انتہائی مایوس کُن تبدیلی کے بعد ریاض ہاشمی وکیل کے لیے ممکن نہ رہا کہ وہ عبدالصمد خان اچکزئی کی وکالت کر سکے یا نیشنل پارٹی کا حصہ بن کر رہے۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف دونوں خان صاحبان کو مقدمے میں جرمانے کی سزا ہوئی بلکہ پوری سابقہ ریاست میں جہاں جہاں فرنٹ کا دفتر تھا وہاں چھاپے مار کر مقامی قیادت کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔

فیاض پر بھی بھینس چوری کا پرچہ کاٹا گیا اور مجسٹریٹ کے پاس چالان پیش کئے بغیر ہی اُسے اُٹھا کر جیل میں پھینک دیا گیا۔ اب کون اُس کی خبر لیتا یا ضمانت کا جتن کرتا! لہذا لاوارث جانتے ہوئے اُس کے جوڈیشل ریمانڈ کی روبکار پر مجسٹریٹ کی فرضی مُہر لگا کر کسی بھی عدالت میں پیش کئے بغیر جیل ہی میں اگلی تاریخ ڈالی جانے لگی۔ جس جرم کی سزا مہینوں میں تھی اُس میں کسی

سماعت کے بغیر سال کے سال گزرتے چلے گئے۔ تھانے والے بھی اُس کے خلاف پرچہ کاٹ کر بُھول گئے کہ اُس کی تفتیش بھی کرنی ہے اور چالان بھی عدالت میں بھجوانا ہے۔ باپ چچا تو پہلے ہی حقہ پانی بند کئے ہوئے تھے لہذا وہ خبر کیا لیتے کہ جوان ہے کہاں۔ زندہ بھی ہے یا کہیں مر کھپ گیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اُس کے اندر ہونے کے بعد مطب والی دوکان پر پہلے وادھو اور پھر وادھو کو چلتا کئے جانے کے بعد مولوی صاحب نے قبضہ کرلیا۔

اِسی طرح احمد پور والے مکان کا بھی جب کئی مہینوں تک تالا نہ کھلا تو ایک روز فیاض کی گرفتاری کا یقین کر لینے کے بعد پیری بدمعاش نے اطمینان سے تالے کو توڑا اور گھر کے اندر گھس گیا۔ اُس کے تئیں فیاض بغاوت کے مقدمے کے سبب کاں کوڑا کر کے لاہور کے شاہی قلعے میں پھینک دیا گیا تھا جہاں سے جیتے جی نکلنا اتنا بھی ممکن نہیں تھا۔ مشہور یہی کیا گیا کہ فیاض مکان کی قیمت وصولنے کے بعد کہیں شکل گم کر گیا ہے۔ اُس کا چچا تو پہلے ہی سے ٹوہ میں تھا، مکان بکنے کا پتا چلا تو دل گرفتگی طیش میں بدل گئی۔ دھاں لے کر اُس کے باپ کے پاس بھی گیا کہ اگر چار چھلڑ ہتھیانے ہی تھے تو اُس سے لے لیتا مگر جس طرح اُس نے واردات کی ہے کسی حلالی کو زیب نہیں دیتی۔ والدین تو پہلے ہی زچ آئے ہوئے تھے، بیٹے کے خلاف یہ شکایت سُن کر چار لفظ بددعا کے دینے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے!

(26)

فیاض کی گرفتاری کے بعد اُسے کچھ دن تو ڈیرہ نواب کے تھانے کی حولات میں رکھا گیا اور پھر بہاول پور کی سنٹرل جیل بھجوا دیا گیا جو محض ایک برس پہلے 1955ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ تقریباً بیاسی ایکڑ پر پھیلی ہوئی اِس نئی جیل کی اپنی دنیا تھی۔ اگر چہ فیاض کو ابھی تک سزا نہیں ہوئی تھی اور وہ محض حوالاتی تھا مگر پھر بھی اُسے جیل کی دیواروں پر سفیدی کرنے اور احاطوں میں پھولوں کی کیاریاں بنانے کی مشقت پر اِس لیے لگا دیا گیا کہ جیل کے کھاتے میں وہ لاوارث تھا۔ نہ اُس کی کوئی ملاقات کبھی آئی اور نہ اُس کے لیے کبھی کوئی آنہ ٹکہ دینے آیا۔ جیل کا سُپر نٹنڈنٹ ایسے قیدیوں سے بہت خار کھاتا مگر نجانے کیوں یہاں کا چیف چکر فیاض پر اتنا مہربان ضرور تھا کہ مشقت کی آڑ میں اُسے اُس کُٹاس سے بچائے رکھتا جو جمعرات کے جمعرات سُپر نٹنڈنٹ کی فرمائش پر محض اُس کی ہیبت قائم کرنے کے واسطے سبھی لاوارث قیدیوں کو چڑھائی جاتی تھی۔

جیل کی دنیا فیاض کو اِس لیے بھی اپنے مزاج کے قریب لگی کہ یہاں نہ تو کوئی پہچان کا مسئلہ اور نہ ہی کہیں کوئی شناخت اور قبضہ گیری کے لیے مہم جویا اُتاولا۔ یہاں تو نام، قومیت، شہر اور علاقے جیسی سبھی شناختی علامتیں محض ایک نمبر کی صورت اختیار کر گئی تھیں۔ ہر قیدی کا ایک نمبر

اور وہی نمبر اُس کا نام، قومیت، شہر اور علاقہ۔ جب تک کوئی قیدی یہاں سے رخصت نہ ہو جاتا، اُس کا نمبر کسی اور کو الاٹ نہ ہوتا۔ نہ کوئی اِن نمبروں کا سفارشی اور نہ کوئی اِن کے واسطے اُتاولا۔

جیل میں خبروں کا بھی منفرد نظام تھا۔ شاید باہر کی دنیا میں لوگوں کی خبروں تک رسائی اتنی سہل نہ تھی جتنی کہ جیل میں تھی۔ ہر بیرک میں کوئی نہ کوئی قیدی ایسا ضرور ہوتا کہ جو کسی وی آئی پی یا بی کلاس قیدی کا مشقتی ہوتا۔ اُس کی زبانی نئی نئی خبریں اور خبروں پر اپنے اپنے مزاج اور حساب کے تبصرے سب سے پہلے بیرکوں میں پہنچتے اور پھر ایک بیرک سے دوسری بیرک تک فاصلہ ہی کتنا ہوتا۔

کئی دنوں کے بعد فیاض کو معلوم ہوا کہ ''انٹی وَن یونٹ فرنٹ'' کے ورکروں میں سے وہ اکیلا ہی جیل میں نہیں بلکہ پشاور تک کے کئی دیگر ورکر بھی اُس کے ساتھ اِسی جیل میں قید ہیں۔ بہاول پور کی صوبائی حیثیت کی بحالی کے لیے کام کرنے والے بہت سے سیاسی کارکن ملتان اور لاہور کی جیلوں میں ڈال دیے گئے تھے۔ اِن میں سے جو تو وارثوں والے تھے، اُن کی ضمانتیں بھی ہو گئیں اور وہ گھروں کو بھی آ گئے مگر فیاض جیسے کئی لوگوں کو بندی خانوں میں پہنچانے کے بعد شاید حکومت بھول گئی تھی کہ اِن گائے بھینس چوروں کو باہر بھی نکالنا ہے یا نہیں۔

فیاض کی عمر کے قوم پرست نوجوانوں کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا کہ جس نے اُن کے اندر سے جینے کی آس بھی اکھیڑ کر ایک طرف پھینک دی۔ یہ تو پھر بھی کارکن تھے جب کہ اس قسم کا دھچکا تو ریاض ہاشمی جیسے وکیل بھی نہ سہہ سکے اور سیاست سے بدظن ہو کر ایک طرف ہو گئے۔ صوبہ بہاول پور کی بحالی کے لیے جنونی ہو چکے یہ نوجوان سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ خان غفار خان اور اچکزئی جیسے لیڈر بھی اُن کی امنگوں اور جذبات کے ساتھ اِس طرح کھلواڑ کر سکیں گے کہ جو اپنی قوم کے لیے انگریزوں کی مار کھائے ہوئے تھے۔ اتنے بڑے قد کاٹھ کے لیڈروں کا آزاد پاکستان پارٹی کے رہنماؤں کی باتوں میں آ کر بہاول پور کے ریاستیوں سے دھوکہ کرنا کسی طرح بھی انہیں زیب نہیں دیتا تھا۔ اِس کے سبب بہاول پور صوبے کی تحریک کو تو جو نقصان پہنچا سو پہنچا،

ایک اور معاملہ اُس سے بھی بدتر ہوا کہ ریاست کے فیاض جیسے نوجوانوں کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے دراڑ پڑگئی کہ وَن یونٹ واقعی ایک ایسی سازش تھی جو غیر فطری ہونے کے علاوہ آبادی کے لحاظ سے چھوٹی قومیتوں کی حق تلفی کے لیے تیار کی گئی تھی۔

اِس دوران چہار جانب سے اُمڈے ہوئے گھپ اندھیرے میں روشنی کی ایک ہلکی سے لکیر اُس وقت ظاہر ہوئی کہ جب سات اکتوبر1958ءکو پاکستان کے پہلے صدر اسکندر مرزا نے 1956ء کے آئین کو لپیٹ کر اسمبلی کو تحلیل کرتے ہوئے مارشل لاء لگا دیا۔ اِس کے محض بیس دن بعد پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان نے اسکندر مرزا کو دیس نکالا دیتے ہوئے اقتدار خود سنبھال لیا۔ اِس انقلاب کی فوری وجہ وَن یونٹ اسکیم کی ناکامی بھی تھی کہ جس نے سیاست دانوں کے لیے حکومت چلانی مشکل بنا دی اور نہایت قلیل مدت میں چار وزرائے اعظم تبدیل کرنے پڑے۔ حکومت کی یہ تبدیلی پوری ریاست میں خوشی کی خبر کے طور پر سنی گئی اِس اُمید پر کہ شاید اب وَن یونٹ ٹوٹے اور ریاست ایک صوبے کے طور پر بحال ہو جائے۔ مارشل لاء لگنے سے فیاض جیسے انٹی وَن یونٹ فرنٹ کے درجنوں کارکنان جو مال مویشی کی چوری کے الزام میں بنا کوئی مقدمہ چلائے دو دو برس سے جیل میں سڑ رہے تھے، پھر سے اچھے دنوں کی اُمید سے بندھ گئے۔ اُن کو یقین ہو گیا کہ اب اُن کی رہائی کی کوئی تدبیر ہو کر رہے گی۔

مگر یہ سبھی کچھ محض خیال ہی ثابت ہوا۔ نہ تو وَن یونٹ ٹوٹا، نہ صوبہ بنا اور نہ ہی فیاض جیسوں کو قید سے رہائی مِلی۔ کسی نے کہا کہ نواب صاحب کے نام عرضی بھیج کر تو دیکھو اور بتاؤ انہیں کہ یہاں بے قصور قید ہو مگر کئی چٹھیاں لکھنے کے بعد بھی نہ کوئی ڈَانٹا اور نہ کوئی جواب۔ بالکل ہی چُپ غُڑپ۔ مارشل لاء کے بعد جیل کے چیف چکر نے کچھ اور ہمدردی کی اور مغربی پاکستان کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا پتہ لکھوا کر فیاض کو دیا کہ اِس پتے پر عرضی بھیج مگر فیاض کسی ایسے حاکم کو اپنی رہائی کی دُہائی نہیں دینا چاہتا تھا کہ جس کے نام یا عہدے کے ساتھ مغربی پاکستان لکھا ہوا ہو۔ فیاض کا جواب سُن کر چیف چکر اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ خاصی زور کی ہنسی تھمی تو بولا۔ ''جوان تم تو بالکل ہی

کاوَدَن ہو، تمہارے تسلیم نہ کرنے سے مغربی پاکستان کو کیا فرق پڑتا ہے، جیل میں تو تم پڑے ہو۔ اب تم کہو گے کہ جیل تو بہاول پور کی ہے، مانا جیل تو بہاول پور کی ہے مگر ہے تو مغربی پاکستان میں۔ چَل چھوڑ نہ بھیجو عرضی۔ تمہارے جیسے احمق پیدا ہی جیل میں سڑنے مرنے کے لیے ہوتے ہیں۔''

''میں عرضی اُس وقت دوں گا جب ایوب خان وَن یونٹ توڑ کر میرے بہاول پور کو صوبہ بنانے کا اعلان کرے گا۔'' فیاض کے لہجے میں دو برسوں کی قید کے باوجود وہی پہلے دن والا لااُبالی پَن تھا۔ چیف چکر نے بھی اُس کے بے وقوفانہ جواب پر ایک بار پھر قہقہہ لگایا اور جاتے جاتے پوچھنے لگا ''حکیمن یار، کوئی چنبل کا علاج تو بتاؤ، پانچویں بیرک کے دوحوالاتی کب کے اِس عذاب میں پکڑے ہوئے ہیں۔''

~~~
~~~

(27)

1966ء کا پہلا سورج طلوع ہوتے ہی فیاض کی قید کو دسواں برس شروع ہو گیا۔ ایوب خان کے مارشل لاء کے ساتھ جڑی ہوئی سبھی امیدیں راکھ ہوئیں تو پوری سابقہ ریاست میں مونجھ اور مایوسی نے ڈیرے ڈال لیے۔ قیامِ پاکستان کو اُنیس برس ہو گئے مگر مقامی لوگوں کی آس، اُمید اور توقع کی کونپل نہ تو کھلنی تھی اور نہ ہی کھلی۔ اِن اُنیس برسوں میں مہاجر ہو کر آنے والوں کی ایک نسل جوان ہوئی تو مقامی ریاستیوں کی وہ نسل جس کی آنکھوں کے سامنے ریاست کا الحاق پاکستان سے ہوا تھا، اِس جہان سے رُخصت ہو چکی تھی۔ ایک جگہ، ایک محلے اور ایک شہر میں رہنے والوں کے دِل ابھی تک آپسی قربت کے دائرے میں نہیں آ سکے تھے۔ ایک عجیب سا کھچاؤ تھا دونوں کے درمیان۔ مہاجر اور آباد کاروں کو ریاست میں آباد کرنے کے لیے نواب صاحب نے خصوصی فنڈ قائم کیا اور ریاستی وسائل کے دروازے اُن پر کھول دیے۔ اِس کے نتیجے میں مہاجر ہو کر آنے والوں کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں تو آسانی ہو گئی مگر مقامی لوگ جن کی معاشی حالت پہلے ہی دگر گوں تھی، احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے کہ ریاستی وسائل پر پہلا حق اُن کا ہونے کے باوجود اُن کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جا رہا تھا۔ مقامی لوگوں نے اِس صورتِ حال کو اپنے مہاجر بھائیوں

کی امداد سمجھنے کی بجائے اپنی حق تلفی پر محمول کیا اور دل مسوس کر کے ایک طرف ہو بیٹھے۔

زیادہ کمانے کے لیے زیادہ کام کرنا مہاجروں کی بقاء کے ساتھ جُڑا ہوا تھا تبھی اُن کو مقامی لوگ آلسی اور نکھٹو لگتے تھے۔ بازار، کاروبار اور وپار تو پہلے دن سے ہی مہاجروں کا ہو رہا، آبادکاری کے لیے اراضیات کی تقسیم نے اِس پر لسانی اور ثقافتی فرق اِس طرح چوکھا کر کے ظاہر کیا کہ ہر آنے والے دن کے ساتھ اِن دونوں طبقات میں دوری بڑھتی ہی چلی گئی، گھٹنے کی گنجائش ہی نہ رہی۔

مقامی آبادی کے اندر احساس کمتری پیدا ہونے کے عمل میں نواب صاحب کی ریاست میں عدم موجودگی کا بھی دخل تھا۔ ریاست کے صوبہ مغربی پاکستان کا حصہ بننے کے بعد نواب صاحب کے پاس صرف امیر آف بہاول پور کا خطاب اور بتیس لاکھ روپے سالانہ وظیفہ ہی رہ گیا۔ انتظامی اختیارات نہ رہے تو نواب یہاں بیٹھ کر کیا کرتا تبھی تو ولایت میں ڈیرے جما کر بیٹھ گیا۔ لوگوں کے واسطے نواب صاحب اب بھی امیر آف بہاول پور تھا جسے انگلینڈ میں ہونے کی بجائے اُن کے سَر پر ہاتھ رکھنا چاہئے تھا مگر نواب صاحب کے اِتنے دور ہونے کی وجہ سے مقامی ریاستیوں میں یتیمی اور لاوارثی کا احساس بڑھتا چلا گیا۔ باقی جلتی پر تیل کا کام یہاں پر تعینات ہونے والے غیر مقامی اُفسر مقامی لوگوں کے ساتھ اپنے ہر وقت کے ''حسنِ سلوک'' سے کیئے رہتے۔ اِس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری دفتروں میں مہاجرین کی پہنچ زیادہ ہوتی چلی گئی۔ اُن کے تعلقات ہر اُس مقام تک اُستوار ہو گئے کہ جہاں سے اختیار اور اقتدار کے سوتے پھوٹتے تھے۔ ہر ایسے دفتر میں اُن کا کوئی نہ کوئی جاننے والا پہلے سے موجود یا تعینات پایا جاتا تھا۔ اِس صورت حال کے سبب سابقہ ریاست بہاول پور میں جہاں سیاسی قیادت کا خلاء پیدا ہو گیا وہاں سماجی گانٹھیں بھی مزید گنجلک اور پیچیدہ ہوتی چلی گئیں۔ فیاض کو جیل کی چار دیواری میں یہ خبریں پہنچتیں تو آسمان کی طرف دیکھ کر دل ہی دل میں دعا کرتا کہ اُسے کبھی رہائی نصیب نہ ہو کیوں کہ اِن سبھی معاملات کی خبر ہونے کے باوجود اُسے کوئی خبر نہیں تھی اپنے گھر دَر کی یا اُس امانتی جائیداد کی جو حکیم رام لعل اُس

کے حوالے کر گیا تھا۔ چالیس برس کی عمر کو چھونے والے فیاض کے لیے اب نہ تو اپنی پہچان کا معاملہ کچھ اتنا ضروری رہ گیا تھا اور نہ ہی کوئی اور سوال جواب۔ اُس کی پہچان اُس کا جیل کا نمبر اور شناخت جیل کی چار دیواری۔

یہ مارچ 1966ء کی کوئی چمکتی ہوئی صبح تھی۔ فیاض زران کرنے کے بعد اپنی بیرک کے سامنے کی کیاریوں میں کھلے ہوئے پھولوں پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ وہ حیران تھا قدرت کی صناعی پر کہ اُس کے اپنے ہاتھوں سے لگے ہوئے دو دو بیجوں کے چوپے پہلے سبز کونپل بن کر زمین سے باہر نکلے اور پھر بڑھتے بڑھتے اِس طرح رنگ برنگ پھولوں سے لد گئے کہ نہ تو رنگ ختم ہونے کا نام لیتے تھے اور نہ ہی پھول۔ ابھی صبح کے آٹھ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ جیل کا بڑا اٹل کھڑک اُٹھا اور ہر طرف سے سیٹیوں کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ اِس اعلان کا مطلب یہی تھا کہ کوٹھی لگے قیدیوں کے علاوہ سبھی قیدی جیل کے مرکزی گراؤنڈ میں جمع ہو جائیں، کوئی خاص خبر ہے یا کوئی اعلیٰ اَفسر دورے پر آ رہا ہے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر سوائے سزائے موت کے چکی لگے قیدیوں کے باقی ساری گنتی ایک خاص ترتیب میں قطار بنا کر کھڑی ہوگئی۔

جیل کی بڑی گزرگاہ کے دو دروازے تھے۔ ایک بیرونی اور دوسرا اندرونی اور اِن کے درمیان میں کوئی پچیس فُٹ چوڑی اور پچیس فُٹ لمبی ڈیوڑھی۔ بیرونی دروازہ سڑک پر کھلتا تھا جب کہ اندرونی دروازہ ڈیوڑھی کو جیل کے اندرونی حصوں سے جوڑتا تھا۔ ڈیوڑھی میں جیلر سمیت دیگر جیل اَفسروں کے دفتر اور اِس کے ایک جانب ملاقات والی بیرک بنی ہوئی تھی۔ باہر سے آنے والے وزیٹر بیرونی دروازے سے گزر کر پہلے جیلر کے دفتر میں بیٹھتے اور پھر اپنے اپنے عہدے کے مطابق اُسی عہدے کے جیل اَفسر کی معیت میں جیل کا دورہ کیا کرتے۔ قیدیوں کو بڑے میدان میں اکٹھے ہوئے کوئی آدھا گھنٹہ گزرا تو جیلر، ڈپٹی اور دو اسسٹنٹ سُپرنٹنڈنٹ کے ہمراہ ایک بڑا صاحب، دو بیگمات، کچھ عملے کے لوگ اندرونی دروازہ کُھلنے کے بعد اُن کی طرف آتے دکھائی دیے جن کے آگے آگے چیف چکر پریڈ کے انداز میں لیفٹ رائٹ کرتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ قریب پہنچے

تو اعلان ہوا کہ گورنر مغربی پاکستان کے حکم پر ریذیڈنٹ مجسٹریٹ صاحب قیدیوں کے مسئلے مسائل معلوم کرنے اور معمولی جرائم میں گرفتار قیدیوں کی ضمانت کا بندوبست کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ بیگمات کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ سوشل ویلفیئر کی ایسی تنظیم چلاتی ہیں کہ جو بے گناہ قیدیوں کے واسطے قانونی امداد کا انتظام کرتی ہے۔

مجسٹریٹ صاحب اور باقی کے افسر سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور چیف چکر نے باری باری ایک ایک قیدی کو مجسٹریٹ صاحب کے سامنے سے گزارنا شروع کر دیا۔ ہر قیدی کے ہاتھ میں ایک کارڈ ہوتا جس پر اُس کے مقدمے کی مکمل تفصیل لکھی ہوئی ہوتی۔ چیف چکر، قیدی کے ہاتھ میں سے کارڈ اُچک کر اُس کا نامۂ اعمال پڑھتا اور مجسٹریٹ صاحب وہیں موقع پر سزا، جزا یا ضمانت کی کاروائی کر دیتے۔ جرم بڑا ہوتا تو آواز لگائی جاتی کہ اِس کی درخواست ضمانت سیشن جج صاحب کو پیش کی جائے۔ فیاض کی باری قریب آئی تو اُس کی ٹانگوں میں تھرتھراہٹ سا ہونے لگا۔ اُسے یقین تھا کہ آج وہ جیل سے باہر نکال پھینکا جائے گا لیکن وہ جیل سے باہر جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اُس کا دِل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ ٹھاکوں کی آواز باہر تک آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے کئی بار کوشش کی کہ اُٹھ کر بھاگ جائے۔ مگر مجبور تھا، چاروں طرف جیل کی فورس اور بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جیل سے باہر نکلنے کے خوف سے اُس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا مگر اِس کے باوجود آخر کار اُس کے نام کی پکار ہو ہی گئی۔

فیاض کا مجسٹریٹ صاحب کے روبرو پیش ہونا کسی توپ کے گولے کے پھٹنے سے کم نہیں تھا۔ ایک بار تو مجسٹریٹ سمیت سبھی وزیٹرز کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر کی طرف آ گئے جب کہ سُپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ساتھ جیل کے دیگر افسروں نے بھی گردن جھکا لی جیسے اپنے گریبانوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ فیاض کا کسی عدالت میں پیش کیے بغیر دس برس تک جیل میں پڑے رہنا جہاں فوجداری نظامِ انصاف کے ناقص ہونے کی دلیل تھا وہاں عدالتی تاریخ کا ایسا واقعہ تھا کہ جس کے طشت از بام ہونے پر بڑی بڑی کُرسیاں نہ صرف ڈگمگا سکتی تھیں بلکہ ٹوٹ

کر گر بھی سکتی تھیں۔ یہ ایک ایسا مقدمہ تھا کہ جس کا ملزم اپنے اوپر لگے الزام کے ثبوت، سماعت اور فیصلے کے بغیر ہی جرم کی مقرر کی گئی سزا سے تین گنا زیادہ قید بھگت چکا تھا۔ جیل حکام کے پروردہ مجسٹریٹ نے بھی جیل افسروں کو بچانے کی خاطر جلدی جلدی فیاض کو رہا کرنے کا حکم سنایا اور اگلے قیدی کو پیش کرنے کا اشارہ کر دیا۔ حکم سنتے سپرنٹنڈنٹ سمیت جیل کے سبھی افسروں کی جھکی ہوئی گردنوں کو پھر سے کلف لگ گیا کیونکہ ہمارا ڈانواں ڈول نظامِ انصاف پھر سے محفوظ کر لیا گیا تھا۔

شام کو جیل کا بیرونی دروازہ کھلا تو فیاض کو دھکا دے کر باہر نکال دیا گیا۔ دس برس کے بعد باہر کی دنیا سے اُسے اِس طرح خوف آ رہا تھا جیسے وہ کوئی ناجائز بچہ ہے جسے اُس کی ماں جنم دینے کے بعد کوڑے کے ڈھیر پر پھینک گئی ہو۔ وہ وہیں سکتے کی سی کیفیت میں جامد کھڑا ہوا تھا۔ وہاں سے گزرنے والا ہر شخص فیاض کو یوں دکھائی دیتا کہ جیسے کوئی بھیڑیا، خونخوار کُتا یا جنگلی بلا ہے جو اُس پر جھپٹے گا اور اُٹھا لے جائے گا۔ اُس کا دماغ مسلسل گردش میں اور ہوش حواس گہرے پانیوں میں ڈبکیوں کی نذر کہ جائے تو جائے کہاں۔ محراب والے میں شاید ہی اُس کا کوئی شناسا رہ گیا ہو۔ ڈیرہ نواب والے تو ویسے بھی اُس کے دشمن کہ کہیں دکان واپس نہ لے لے اور احمد پور جانا بھی اُتنا ہی مشکل کہ جیسے بھڑ کے چھتے میں پتھر مارنا۔ وہاں بھی گزرے اُنیس برسوں میں حکیم صاحب کا مکان نجانے کتنے ہاتھوں بِک چکا ہو گا۔ وہ اپنی پہچان تلاش کرتا کرتا اُلٹا بے نام ونشاں ہو کر رہ گیا تھا۔

''تو کیا بہاول پور میں ہی رہ جاؤں؟..... لیکن بہاول پور میں رہوں گا کہاں، کھاؤں گا کہاں سے، جاؤں گا کس کے پاس.... '' فیاض انہیں سوچوں میں غلطاں دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے شیشم کے دیمک زدہ مُنڈھ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ سامنے سڑک پر بڑا سا آئینہ لادے گدھا ریڑھی گزری تو ایک لمحے کے لیے فیاض کو اپنا آپ بھی دکھا گئی۔ اپنی صورت سے گھبرا کر اُس نے غیر شعوری انداز میں بدن پر ہاتھ پھیر کر باقی بچے ہوئے اپنے آپ کو محسوس کیا۔

''میں تو اچھا بھلا ہوں.... نوجوان نہیں تو کیا ہوا جوان تو ہوں، تگڑا ہوں، کما کھا سکتا ہوں، حکمت پھر سے شروع کر سکتا ہوں، یہ میرا شہر ہے، میری ریاست ہے۔ نہ میں حرامی اور نہ یہ کوڑے کا ڈھیر۔ بس کچھ دنوں کی مشقت تو کرنا ہی ہوگی۔ میں کیوں ناں ریاض ہاشمی وکیل کے ڈیرے پر جاؤں، اور کچھ نہیں تو نئے سرے سے جینے کا حوصلہ تو ملے گا، اُمنگ تو ہوگی۔'' یہ سوچ کر فیاض کو یوں لگا جیسے اُس کے بدن میں پھر سے وہی لہریں مچل رہی ہیں کہ جو اُسے انٹی وَن یونٹ فرنٹ کے دنوں میں چین نہیں لینے دیتی تھیں۔ وہ شیشم کے مُنڈھ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ جی چاہا کہ ایک ہجوم اکٹھا کر کے گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگائے ......بہاول پور کو صوبہ بناؤ، بہاول پور کو صوبہ بناؤ۔

اِس سے پہلے کہ فیاض واقعی نعرے لگانے شروع کر دیتا، ایک درمیانے سے بھی قدرے چھوٹے قد کا اَدھیڑ عمر آدمی اُس کے پاس آیا اور اُس کے نام کی تسلی کرنے کے بعد سڑک کے پار کھڑی بگھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ آؤ تمہیں بی بی صاحب بلا رہی ہیں۔ فیاض نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے ساتھ چل پڑا اور بگھی کے قریب آ کر کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں منہ کھولے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بگھی کا عقبی حصہ موٹے ریشمی کپڑے کے پردوں کے ذریعے اِس طرح بند کیا گیا تھا کہ بگھی کا ہر کُنڈا پردے کے کُنڈے کے ساتھ اٹکا ہوا تھا۔ جب کہ بگھی کی اگلی سیٹ خالی تھی۔ مَدھرے قد والے شخص نے فیاض کو اگلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر وہ جھجک کر وہیں سڑک پر ہی ساکت کھڑا رہا۔ اتنی دیر میں بگھی کی اگلی اور پچھلی سیٹ کے درمیان میں لگا ہوا پردہ ہلا اور اُس کی اوٹ سے فیاض کو اُن بیبیوں میں سے ایک بی بی کا چہرہ دکھائی دیا جنھوں نے آج مجسٹریٹ صاحب کے ہمراہ جیل میں آ کر اُس کی رہائی کی کوشش کی تھی۔ بی بی ہاتھ کے اشارے سے فیاض کو بگھی میں بیٹھنے کا کہہ رہی تھی۔ فیاض خاموشی سے کسی بردے کی طرح بگھی میں بیٹھ گیا۔ اُس کے بیٹھنے کے ساتھ ہی مدھرا شخص بھی اُچھل کر بگھی کے بائیں بمب کے ساتھ بنی ہوئی ٹیکی کے ساتھ ٹِک گیا جب کہ کوچوان نے اِدھر دائیں بَمب پر بیٹھ کر گھوڑے کی لگام کو جھٹکا

دیا اور بگھی کے پہیے گھوم اُٹھے۔

کچھ دیر بہاول پور شہر کے سرکلر روڈ پر ہلکے ہلکے دوڑتی ہوئی بگھی ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک خاصی وسیع وعریض کوٹھی میں داخل ہوگئی اور پھر ایک طویل اندرونی راستے سے گزرتی ہوئی سیدھی گھر کے مرکزی دروازے کے سامنے کشادہ پورچ میں جا کر رک گئی۔ کوٹھی کے اندر گھومتی ہوئی اس سڑک پر بھٹے کی اینٹوں کا برادہ بچھا ہوا تھا جس کے دونوں طرف گھرے سبز گھاس کے بڑے بڑے مخملیں قطعات اور اِن قطعات کے کناروں پر موسمی پھولوں کی کیاریوں نے رنگ جمائے ہوئے تھے۔ مَدھرا شخص اور کوچوان دونوں چھلانگ لگانے والے انداز میں نیچے اترے اور فیاض کو بھی جلدی سے نیچے اترنے کا شارہ کیا تو وہ بھی شتابی سے اتر گیا۔ بگھی کی ٹلی کی آواز سُن کر اندر سے دو ملازمائیں بھی تیزی سے باہر نکلیں اور آتے ہی بگھی کا پچھلا پردہ کھولنے لگیں تا کہ بی بی سہولت سے اتر سکے۔ بی بی نیچے اتری تو ایک نگاہ بھر کر فیاض کو دیکھا، ہلکا سا مسکرائی اور باوقار انداز میں قدم اُٹھاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ دونوں ملازمائیں بھی فیاض کو حیرت سے تکتے ہوئے بی بی کے پیچھے پیچھے اندر چلی گئیں۔ اب مَدھرے قد والا شخص فیاض سے مخاطب ہوا اور اُسے ساتھ لے کر مہمان خانے پہنچانے چل پڑا۔

مہمان خانے پہنچ کر فیاض کو علم ہوا کہ مَدھرے قد والے شخص کا نام رسول بخش میرانی ہے اور وہ بی بی کا کارمختیار ہے۔ جب کہ بی بی سیٹھ بدرالدین کی اکلوتی بیٹی سلمیٰ بی بی ہے۔ سلمیٰ بی بی کی شادی میجر تو قیر داد پوترے سے ہوئی تھی اور ایک بیٹا اکبر نام کا بھی پیدا ہوا مگر شادی کے تین برس بعد ہی میجر تو قیر رو ہی میں جیپ گلٹی ہونے کے سبب زندگی ہار گیا۔ لاہور کنیئرڈ کالج کی پڑھی ہوئی سلمیٰ بدرالدین جوانی میں ہی بیوہ ہوئی تو بابا نے کچھ دنوں بعد دوسری شادی کی بات چلائی مگر سلمیٰ بی بی نے صاف صاف بتا دیا کہ شادی وہی تھی جو ہوگئی، اب گلے میں اور پھندا اچھا نہیں۔ بابا نے پھر تجویز دی کہ اگر شادی نہیں کرنی تو لڑکیوں کا کوئی بڑا کالج کھولا جائے مگر بیٹی کی جانب سے اب بھی انکار۔ آخر کار اُس نے سماجی بھلائی کے کام کاج کے لیے ''سماج سیوا'' کے نام

سے تنظیم قائم کر لی اور کئی بڑے گھروں کی پڑھی لکھی خواتین کو ساتھ ملا کر عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور قیدیوں کے لیے امدادی اور فلاحی کام شروع کر دیے۔ سیٹھ بدر نے بھی سکھ کا سانس لیا کہ اور کچھ نہیں تو بیٹی کا دل تو بہلا رہے گا۔

پانچ چھ برس بمشکل گزرے ہوں گے کہ سیٹھ بدرالدین بھی قضا کے دام میں آ گیا اور اس کے کچھ مہینے بعد سیٹھ کی بیگم صاحبہ بھی رخصت ہو گئیں۔ اتنے بڑے گھر میں سلمیٰ بی بی کا بیٹے کے ساتھ اکیلا رہنا اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا کہ جتنا بڑا گرو دھال سیٹھ بدر کی دو کاٹن فیکٹریوں اور زرعی اجناس کے کاروبار کے عذابوں کو سنبھالنا تھا۔ اِس کے لیے رسول بخش میرانی ایک بہت بڑی ڈھارس بن کر سامنے آیا۔

رسول بخش میرانی باپ دادا سے سیٹھ بدرالدین کی ملازمت کرتا چلا آ رہا تھا۔ وہ ناں صرف صرف بارہ جماعتیں پاس تھا بلکہ سیٹھ صاحب کے پورے کاروبار اور اُس کی کاروباری پالیسیوں سے بھی اتنا واقف ضرور تھا کہ کسی طور کسی معاملے میں نقصان کا امکان نہ رکھے۔ میرانی نے پہلے کے ملازمین میں سے اپنی مرضی کا چناؤ کیا۔ کام کے لوگوں کو رکھا اور باقیوں کو جھنڈی کرا دی اور اِس کے ساتھ ساتھ ہر یونٹ پر اپنا ایک ایک اعتمادی منیجر تعینات کرنے کے بعد انہیں مکمل اختیار دیتے ہوئے خود بی بی کا کارمختیار بن بیٹھا۔ رسول بخش میرانی چاہے جتنا چلتا پرزہ تھا مگر بی بی کے روبرو چوبیس گھنٹے مودب اور دستیاب۔ زبان کی جنبش سے پہلے ہی حکم کی تعمیل ہو چکی ہوتی تھی۔ اِن حالات میں سلمیٰ بی بی نے پورے کا پورا کاروبار اُس کے حوالے کیا اور خود فلاحی کاموں کے واسطے اپنی تنظیم ''سماج سیوا'' بنانے کے بعد اُسے ضلع بہاول پور کے طول و عرض میں پھیلا دیا۔ ضلع کے بعد ہر تحصیل میں تنظیم کا دفتر بناتے ہوئے بہت سے منصوبے شروع کر دیے جن کی نگرانی خود سلمیٰ کرتی رہتی تھی۔ اِس دوران اکبر اسکول کی عمر کو پہنچا تو اُسے گھر کے قریب واقع صادق پبلک اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ ہوسکتا تھا کہ واحد ماں کے لاڈ پیار سے بچہ بگڑ جاتا تبھی اُسے ڈسپلن میں رکھنے کے لیے اُس کی رہائش کا بندوبست بھی ہوسٹل میں کرا دیا گیا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد سلمیٰ بی بی نے فیاض کو اندر ڈرائنگ روم میں بلا بھیجا۔ فیاض ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا تو سامنے والے صوفے پر بیٹھی عورت کو دیکھ کر پہچان بھی نہ سکا کہ یہ کل والی سلمیٰ بی بی ہی ہے۔ وہ جو کل عورت تھی وہ تو ادھیڑ عمر لگ رہی تھی مگر آج والی تو اچھی بھلی جوان لیکن پُر وقار۔ فیاض سامنے گیا تو آنکھیں نہ مِلا سکا جو سلمیٰ کو دیکھتے ہی خود بخود جھک گئی تھیں۔ سلمیٰ بی بی نے اُسے دروازے کے ساتھ رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ فیاض تو سَر جھکا کر کچھ آگے سرکتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا جب کہ رسول بخش میرانی اُلٹے پاؤں باہر نکل گیا۔ سلمیٰ بی بی جیل کے ریکارڈ کے مطابق فیاض کا نام ولدیت اور کیا ہوا جرم تو جان چکی تھی مگر پھر بھی اُس کے جھیلے ہوئے عذابوں کی دلجوئی کے لیے اُس کا احوال سننے بیٹھی تو اچھا بھلا دن چڑھ آیا۔ وہ حیران تھی کہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کی زندگی سے پورے دس برس اِس قسم کی واردات کے ذریعے چرا لیے جائیں کہ نہ تو اُس کی کوئی رَپٹ اور نہ ہی اُس کی جزا سزا۔ مجسٹریٹ صاحب نے بھی صرف رہائی کے پروانے پر دستخط کیے اِس معاملے کی انکوائری کرائے بغیر کہ دس برس تک کس سبب نہ تو اُس کے خلاف کوئی چالان تیار ہوا اور نہ ہی اُسے کبھی جیل سے نکال کر مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا جب کہ جیلر کچی حوالات والوں کو تو ہر چودہ دن بعد علاقہ مجسٹریٹ کے روبرو پیش کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ عجیب رُولا تھا کہ نہ ہی کسی سے پوچھ پُچھ اور نہ ہی ذمہ داری کا تعین۔ ہر شے پر مٹی اور ہر شے راکھ اور مٹی۔

"اب کیا ارادے ہیں.... میرے پاس رہنا ہے یا احمد پور جانا ہے"۔ سلمیٰ بی بی نے فیاض کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اِس طرح دیکھا کہ جیسے کہہ رہی ہو "تم نے تو میرے پاس ہی رہنا ہے۔"

فیاض کو بھی کل شب سے یونہی احساس ہو رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر حکیم رام لعل کی دُکان تک تو پہنچ گیا ہے مگر گدی پر بیٹھنے یا نہ بیٹھنے کا خواب نئے سرے سے دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ قدرت کی اِس پرکھ پرچول پر بھی حیران تھا کہ پہلے تو اُسے بے شناخت اور لاوارث کر دیا جاتا ہے

اور جب کسی طرف سے کوئی آس باقی نہیں رہتی تو اُسے ایک نئی کوشش ،ایک نئی راند کا حصہ بنا دیا جاتا ہے۔جیل میں دس برس تو چیختے چلاتے گزارے مگر جب اُسے اپنی پہچان اور اپنا گھر بنالیا تو اُسے جڑوں سے اُکھیڑ کر باہر پھینک دیا گیا۔فیاض نے پہلی بار سوچا کہ قدرت نے اُسے برباد تو پہلے سے کر رکھا ہے مگر نجانے اب کون سی راند،کون سا کھلواڑ اُس کی انتظار میں ہے۔

فیاض کو سوچ میں غلطاں دیکھ کر سلمٰی بی بی نے اُسے پھر سے مخاطب کیا۔"ان دو جگہوں کے علاوہ کوئی اور جگہ بھی ہے؟".......

"کوئی اور جگہ......؟؟؟" کسی اور جگہ کا تو فیاض کو کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا......

"کیوں نہ وہ اِنڈیا چلا جائے اور حکیم رام لعل کو تلاش کر کے اُس سے معافی مانگے کہ وہ اُس کی امانت کی حفاظت نہیں کر سکا۔مگر وہ کس منہ سے تُلسی کا سامنا کرے گا کہ جس نے لڑکی ہو کر بھی جو سوچا وہی کیا لیکن وہ مرد ہو کر بھی صرف اپنے آپ کو تلاش کرنے کے لیے در بدر بھٹکتا رہا ہے۔اُن کا خاندان تو پھر بھی اپنے ہونے کے یقین کے ساتھ ایک دوسرے مُلک میں جا مقیم ہوا ہے،بغیر کسی پہچان کے جھنجٹ کے،مگر اُس نے کیا کیا،سوائے اپنی زندگی میں سے دس برس کی کٹوتی کرانے کے۔"فیاض کا دِل چاہا کہ سلمٰی بی بی کا ترلا کر کے سرحد پار چلا جائے مہاجر بن کر۔کم از کم شناخت تو ہوگی کہ مہاجر ہوں جب کہ اِس ریاست میں رہنے کے باوجود بھی ریاست کی تلاش میں وہ اپنا آپ ہی کیا،اپنا سبھی کچھ گنوا بیٹھا ہے۔

فیاض کی جانب سے کوئی جواب نہ ملا تو سلمٰی بی بی اُٹھ کھڑی ہوئی۔"لگتا ہے تم کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے...... کوئی بات نہیں،اطمینان سے سوچ لو۔"

فیاض بھی اُٹھ کھڑا ہوا مگر اُٹھتے ہوئے پورے اعتماد سے بولا"میں نے فیصلہ کر لیا ہے بی بی،میں یہیں رہوں گا آپ کے پاس،مگر ایک بار احمد پور اور ڈیرہ نواب جاؤں گا ضرور،صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ خطے کی تاریخ کیسے بدلتی ہے اور جغرافیہ کیونکر ساتھ چلنے سے انکار کر دیتا ہے۔"

"ہاں..... کیوں نہیں،احمد پور اور ڈیرہ دور ہی کتنے ہیں۔میں وہاں اپنے پراجیکٹس

کے دورے پر جاتی رہتی ہوں، میرے ساتھ موٹر پر چلے چلنا، کام کاج بھی دیکھ لینا اور اگر زیادہ جلدی ہو تو کسی بھی دن چلے جانا۔ مگر خیال رہے لڑائی بھڑائی کسی کے ساتھ نہیں کرنی۔" یہ کہہ کر سلمٰی بی بی اندر کی طرف چلی گئی۔ فیاض بھی اِس بڑے سے کمرے نکل کر باہر جانے لگا تو سامنے رسول بخش میرانی آ گیا۔ فیاض کو یوں لگا کہ جیسے وہ باہر کھڑا اندر کی گفتگو سُن رہا تھا۔ باہر نکلتے ہی اُس نے فیاض کو ڈھیلے ڈھالے ہاتھوں کلائی سے پکڑا اور اُسے اپنے ساتھ چلاتا ہوا مہمان خانے تک چھوڑ آیا۔ اِس دوران دونوں چُپ کا روزہ رکھے رہے؛ میرانی بولا اور نہ ہی فیاض۔

(28)

فیاض کو سلمیٰ بی بی کے مہمان خانے میں آئے ہوئے دوسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا مگر اِس دوران نہ تو اُدھر سے کوئی بُلاوا آیا اور نہ ہی فیاض نے کسی جانب جانے یا اِدھر اُدھر ہونے میں کوئی اُتاوِلی کی۔ مہمان خانے میں تین وقت کا اچھے سے اچھا کھانا اور کپڑے وغیرہ دُھلے دُھلائے ملتے۔ فیاض آیا تو اُس کے بدن پر ایک جوڑا کپڑوں کا تھا۔ اگلے دن وہ کمرے کے ساتھ بنے ہوئے سقاوے میں جا کر کپڑے دھونے ہی لگا تھا کہ کالو نام کا ملازم اُس کی ناپ کے دو نئے سلے ہوئے کپڑوں کے جوڑے اور نئی گُرگابی لے کر آ گیا کہ بی بی صاحبہ نے بھجوائے ہیں۔ واپس جاتے ہوئے وہ اُس کا میلا جوڑا بھی ساتھ لے گیا کہ مہمانوں کے کپڑے اندر سے دُھل کر آیا کرتے ہیں۔ کھانا پینا مرضی کا اور آرام بے حساب ملا تو دنوں میں ہی فیاض کا منہ مَتھا چمک آیا۔

مہمان خانے میں اُس کی سب سے بڑی عیاشی ریڈیو کا ہونا تھا۔ مرفی کمپنی کا بڑا سا کھوکھے نما ریڈیو مہمان خانے کی نکڑ میں پڑی ہوئی میز پر رکھا ہوا تھا۔ اُس کے اوپر کروشیے سے بُنا ہوا گول رومال آدھا آگے کی طرف اور آدھا پیچھے، جھالر کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ بجلی سے چلنے والے اِس ریڈیو کے اَرتھ کا تار فرش پر رکھے ہوئے مٹی کے گھوگھڑے میں بھری مٹی میں دبا ہوا اور

اریئل کا تار کھڑکی کی لوہے والی جالی میں سے نکال کر کوٹھے کی چھت پر لگے ہوئے اریئل سے جڑا ہوا تھا۔ صبح سویرے ریڈیو سیلون اور رات کو ریڈیو ایران زاہدان کے علاوہ دوپہر کو ریڈیو لاہور کے پروگرام سننے کا اپنا ہی لطف تھا۔ پہلے تو کئی دنوں تک فیاض صرف گانے ہی سُنتا رہا مگر پھر رفتہ رفتہ خبریں بھی مزہ دینے لگیں جن میں سب سے زیادہ چسولی خبریں ریڈیو بی بی سی کی ہوا کرتیں۔

فیاض حیران ہوتا کہ صرف اُنیس برس پہلے سَن سینتالیس میں دنیا کتنی بے خبری میں اور کتنی بے چنتی ہوا کرتی تھی مگر اب دیکھیں تو ہر بڑے گھر میں گانے بھی چل رہے ہیں اور خبریں بھی۔ دنیا باخبر ہوئی تو ہے مگر بے چنتی نہیں رہی۔ صبح سویرے کی کوئی ایک خبر دن بھر دماغ گھمائے رکھتی ہے۔ اگر یہ گیت بھی ریڈیو سے نشر نہ ہوتے تو لوگ کہاں جاتے؟ خبریں سُن سُن کر ایک دوسرے کا سَر پھاڑتے۔

اُس روز سورج طلوع ہوتے ہی خبریں پڑھنے والے نے بتایا کہ سَن چھیاسٹھ کے پانچویں مہینے کی چوبیس تاریخ ہے۔ فیاض آئے روز کی طرح ریڈیو سیلون سے محمد رفیع، لتا منگیشکر، مُکیش اور آشا بھونسلے کے گانے سُنتا ہوا نہانے کے لیے سقاوے میں گھسا ہوا تھا مگر جب باہر نکلا تو نیوز ریڈر بتا رہا تھا کہ نواب بہاول پور سَر صادق محمد خان عباسی ولایت کے شہر لندن میں وفات پا گئے ہیں۔ اُن کی میت ڈیراور کے قبرستان میں تدفین کے لیے کچھ دنوں میں ڈیرہ نواب لائی جائے گی۔ خبر سن کر فیاض سکتے کی سی کیفیت میں آ گیا۔ ''ریاست کا دولہا سئیں آج رخصت ہو گیا۔'' فیاض کی آنکھوں کے سامنے اُس کے بچپن سے لے کر اب تک کا سارا زمانہ کسی مَنڈوے میں لگی ہوئی فلم کی طرح پردے پر چلنا شروع ہو گیا۔ پہلی اور دوسری لام کے زمانے میں پریڈ گراؤنڈ میں ہونے والی گاڈر جوانوں کی پریڈ اور ''کھڑی ڈیندی آں سنیہڑا اِناں لوکاں کوں، اللہ آن وَساوے ساڈیاں جھوکاں کوں'' جیسے ریاستی ترانے کی سینے میں اُترتی دُھن۔ پوری ریاست میں تعمیر و ترقی کا دور، خوشی اور خوشحالی اور ریاست بہاول پور کی پاکستان میں شمولیت تک تو سبھی کچھ ٹھیک اور عوام کی خواہش کے مطابق مگر اِس وَن یونٹ کا تو کسی نے سوچا تک نہ تھا کہ اِس طرح

ریاست اور ریاستیوں کی شناخت پر مٹی ڈال دی جائے گی۔ یہ تو نواب صاحب کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ اُن کی ریاست وَن یونٹ کے نام پر کسی ویران قبرستان میں اپنے تعویز سمیت زمین میں دھنسی ہوئی بے نام ونشاں قبر بنادی جائے گی جہاں ریاست کے باسی اپنی زمین کی پیداوار، اپنے دریاؤں کے پانی اور اپنی لسانی توقیر کو بھی ترس جائیں گے۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ نواب صاحب اپنی رعایا سے شرمسار ہو کر ولایت جا بیٹھے اور اب اُن کا جنازہ اُن کی ریاست میں واپس آرہا تھا۔ فیاض نے تصور کی نگاہ سے دیکھا، نواب صاحب اُس سے نظریں نہیں ملا پا رہے تھے۔ فیاض نے پھر سوچا کہ مرے ہوئے کے ساتھ ایسا بھی کیا جھگڑا۔ ''میں نواب صاحب کو معاف کرتا ہوں، دس برس کی بے قصور قید بھی معاف کرتا ہوں، مگر وَن یونٹ کا گناہ معاف نہیں کرسکتا کیوں کہ اِس کے لیے نواب مجھ اکیلے کا نہیں بلکہ پوری ریاست اور ریاستیوں کا گنہگار ہے۔''

نواب صاحب کی میت آنے کی اطلاع مِلی تو فیاض بے چین ہو کر لاری پر بیٹھا اور احمد پور جا پہنچا۔ لاری اڈے سے بہت پہلے ڈیرہ نواب چوک میں کہ جہاں جی ٹی روڈ احمد پور اور ڈیرہ نواب کو درمیان میں سے الگ کرتی ہے، اتنی خلقت جمع ہو چکی تھی کہ وہاں سے آگے کوئی سواری جا ہی نہیں سکتی تھی۔ فیاض لاری سے اُتر کر خلقت کے ساتھ شامل ہو گیا۔ لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ نواب صاحب کی میت کراچی سے اُن کے اپنے سیلون کے ذریعے ڈیرہ نواب صاحب ریلوے اسٹیشن پر نہ صرف پہنچ چکی ہے بلکہ بگھی میں رکھے جانے کے بعد ریلوے اسٹیشن سے ڈیرا اور کے لیے روانہ ہو چکی ہے لیکن خلقت اسٹیشن سے ڈیرہ نواب تک سڑک پر اِس طرح جُڑ چکی تھی کہ کسی اور کے گزرنے کا راستہ تک نہیں رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ صبح سے دوپہر ہو چکی تھی مگر ڈیرہ نواب چوک تک کا دو میل کا راستہ ختم ہونے کو ہی نہیں آرہا تھا۔ بوڑھے ریاستی ایک دوسرے سے گلے لگ کر رو رہے تھے اور نوجوانوں کی آنکھیں بھی اپنے بزرگوں کو روتا دیکھ کر تر ہو چکی تھیں جب کہ بچے حیران تھے کہ ان سبھی لوگوں کو ہو کیا گیا ہے۔

کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد بگھی قینچی موڑ مڑی تو ڈیرہ نواب چوک تک لوگوں کی

دھاڑیں نکل گئیں۔ ولی عہد محمد عباس عباسی کالی عینک لگائے ہوئے دوسرے بھائیوں کے ساتھ بگھی میں آگے آگے بیٹھا ہوا تھا جب کہ صندل کی لکڑی کا تابوت اُس بگھی کے درمیان میں رکھا تھا کہ جہاں نواب مرحوم اپنی ملکہ کے ساتھ براجمان ہوا کرتے تھے۔ بگھی قریب آئی تو کسی نے بلند آواز میں بین کیا کہ لکھ مرے مگر لکھ پال نہ مرے۔ دل گرفتہ لوگوں کی آہ و بکا آسمان کو چھونے لگی اور بگھی بھی دھیرے دھیرے ڈیرہ نواب کی چھاونی کی حدود میں داخل ہوتی چلی گئی۔

فیاض کی آنکھوں کی ڈناریں تک بھیگ چکی تھیں۔ اُس کے پورے خاندان نے نواب صاحب کی فوج کی ملازمت سے اپنا رزق کشید کیا تھا۔ اگرچہ اُس کی اپنی پرورش بھی نواب کی طرف سے دی گئی تنخواہ سے ہوئی مگر فیاض کے نزدیک یہ تنخواہ ریاستی خزانے سے ادا ہوئی تھی نہ کہ نواب کی ذاتی جیب سے۔ تبھی اُس نے اپنے خاندان میں تو کیا پورے محراب والے میں نواب صاحب کی فوجی ملازمت کے خلاف مزاحمت کی بنیاد رکھی تھی لیکن آج اُسے احساس ہو رہا تھا کہ اگر وہ نواب صاحب کا باڈی گارڈ بھرتی ہو جاتا تو کم از کم اُس کی ریاستی شناخت تو باقی رہ جاتی۔ لیکن اب اُس کی ایک ہی پہچان تھی، ایک ایسا شخص کہ جس نے وَن یونٹ کے خلاف مزاحمت میں اپنی زندگی کے دس برس تیاگ رکھے تھے لیکن ریکارڈ پر اُس کی شناخت پھر بھی ریاست کے حوالے سے تو نہیں تھی، اُس کی پہچان کے ٹھپے پر بھینس چور لکھا ہوا تھا۔ اِس سے زیادہ کچھ نہیں۔

فیاض کا دل ڈوبنے لگا تو وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے واپس جانے والی لاری میں بیٹھا اور بہاول پور کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ احمد پور میں مڑھی کی طرف جاتا، حکیم رام لعل کے گھر کو دیکھتا کہ جہاں پہلی بار اُسے ٹُلسی کی ایک جھلک دکھائی دی تھی اور پھر وہ آخری شب کہ جب وہ اپنے آپ کو گم کر بیٹھا تھا۔ وہ گھر جس کی ایک ایک اینٹ پر اُس کے امین ہونے کی مہر لگی ہوئی تھی وہ گھر اب کسی اور کے ناجائز قبضے میں تھا۔ وہ ڈیرے کی بازار میں اُس دُکان کو دیکھنا چاہتا تھا کہ جہاں اُس نے ریاستی نوکری کو ٹھکرا کر اپنی روایتی شناخت کے خلاف بغاوت کی اور پھر اُسے بھی گم کر بیٹھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس دُکان کو ایک بار پھر چھو کر محسوس کرے کہ جہاں ٹُلسی نے

ریاست سے رخصت ہوتے ہوئے اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر خدا جانے کیا ایسا محسوس کیا اور کرایا کہ خود تو شانت ہوگئی مگر اُسے ہمیشہ کے لیے اپنے آپ سے چھین گئی۔ اُس کے ہاتھ کی حدت میں سے لرزاں لذت اُسے اب بھی سوئی ہوئی راتوں میں جگا دیتی تھی کہ جیسے ٹلسی اپنے رَس بھرے وجود سمیت اُس کے اندر لُھکانا کیے بیٹھی ہو۔ مگر ڈیرہ نواب کے بازار کی وہ دکان اب اُس کے لیے اس طرح اُوپری ہو چکی تھی کہ جیسے وَن یونٹ کے بعد یہ ریاست۔

لاری بہاول پور جاتے ہوئے پکی پُل سے گزری تو محراب والے کی طرف جانے والا موڑ سامنے تھا کہ جہاں بستی میں سے آنے والی سڑک بہاول پور روڈ سے جُڑ جاتی تھی۔ بہاول پور سے آتے ہوئے اِس مقام پر بہاول پور احمد پور روڈ ایک دم غلیل کی مانند دوشاخہ ہو جاتا تھا، دائیں سڑک احمد پور کی جانب اور بائیں محراب والے کی طرف۔ اِس موڑ سے تھوڑا سا آگے بستی کا قبرستان تھا جہاں فیاض کے آباء دفن تھے۔ لاری میں بیٹھا ہوا فیاض اگرچہ قبرستان سے دور تھا مگر پھر بھی اپنے بزرگوں کی موجودگی اور خوشبو محسوس کر سکتا تھا کہ جو اُس کے ساتھ خفا ہونے کے باجود اُس سے منہ نہ موڑ سکتے تھے۔ اُس کا دل چاہا کہ یہ لاری خراب ہو جائے اور وہ یہیں اُتر کر گھر کی جانب دوڑ لگا دے۔

گھر کون سا دور تھا، گھر میں جا کر اَماں کے پاس چُلہانے پر جا بیٹھے اور کہے کہ میں تو نہیں آ رہا تھا، یہ تو بس خراب ہوگئی اور میں اِدھر چلا آیا۔ اَماں اُس کی یہ چلتری سُن کر ضرور مُسکراتی اور شاید دو چار چمٹے بھی جڑ دیتی۔ فیاض کی آنکھوں میں سے آنسو اُمڈے تو اُس نے سَر کے رومال کے ساتھ غیر محسوس انداز میں پونچھ لیے۔ ساتھ بیٹھے ہوئے بوڑھے نے اُسے روتا دیکھا تو تسلی دی کہ بیٹا تمہارا رونا برحق ہے، صادق تھا جو لکھ پال، نوابوں کا نواب۔

فیاض بوڑھے کو کیا سمجھاتا کہ وہ کون سے صادق کو رو رہا ہے۔ اُس نے کوئی جواب دیے بغیر لاری کی کھڑکی کے شیشے کو کچھ اور اوپر اُٹھا کر باہر دیکھنے لگا۔ دور دور تک گندم کٹائی کے بعد زمینیں اگلی فصل کے انتظار میں خشک بھوسے کے ساتھ بھوسہ ہوئی پڑی تھی۔

''میری ماں بھی میرے انتظار میں یونہی بھوسہ ہو کر مری ہوگی۔ اگر میں ایک بار بھی اماں کے پاس چلا جاتا اور چچا کا سارا احوال خود سناتا تو وہ ضرور چچا کی بجائے اُس کی طرف داری کرتی۔'' فیاض کی آنکھیں بھیگنے کے بعد اب ٹپکنے کی طرف آئیں تو اُس نے اپنا چہرہ لاری کے باہر کی جانب پھیر لیا۔

(29)

احمد پور سے واپسی کے بعد فیاض کئی دنوں تک بجھا بجھا سا رہا۔ ریڈیو بھی اکثر خاموش رہتا اور چلنا پھرنا بھی صرف کمرے تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اِن دنوں نہ تو بی بی صاحب نے اُسے بلوایا اور نہ ہی پہلے کی طرح اُس نے خود سے ملنے کی کوئی کوشش کی۔ بس رسول بخش میراثی کبھی کبھار آ کر اُس سے سلام دعا کر جاتا۔ یوں لگ رہا تھا کہ رسہ کشی کے کھیل کی مانند بی بی اور فیاض دونوں ایک دوسرے کو تناؤ کی حالت میں رکھے ہوئے ہیں اور آزما رہے ہیں کہ پہلے کون حوصلہ ہار کر کِلی والی لائن کراس کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو دونوں کے درمیان کوئی ایسا رشتہ بھی نہیں تھا کہ یوں ایک دوسرے کو تناؤ میں رکھنے کی نوبت آتی مگر پھر بھی فیاض کے دِل میں کچھ ناں کچھ اچنبا ایسا ضرور تھا کہ اُس پر یہ سبھی مہربانی کس واسطے۔ ضرور اُس سے کوئی ایسا کام لینا مقصود ہے کہ جو اور کوئی نہیں کر سکتا۔

''کیوں کوئی اور نہیں کر سکتا۔ کوئی کمی ہے اُس کے پاس لوگوں کی یا پیسے ٹکے کی''..... بے کاری سے زِچ ہو کر وہ اکثر اپنے آپ سے پوچھنے لگتا مگر کسی طرف سے کوئی جواب نہ مِلتا۔

''اگر میں اتنا ہی کوئی خاص آدمی ہوں اور مجھ سے کوئی بہت بڑا کام لینا مقصود ہے تو

پھر اتنے دنوں سے وہ کام بی بی لیتی کیوں نہیں۔ کیوں مجھے کھلا کھلا کر ریچھ بنایا جا رہا ہے۔'' فیاض کو
یوں محسوس ہو رہا تھا وہ کوئی شکاری کُتا ہے جسے خاص دشمن کا شکار کرنے کے لیے زنجیر سے باندھ
کر کسی مناسب وقت کے انتظار میں پالا جا رہا ہے یا پھر کوئی قربانی کا بیل جسے اِس لیے کھلا کھلا کر
فربہ کیا جا رہا ہے کہ ذبح کرنے پر گوشت اچھا نکلے گا۔ اِس چڑ چڑے پن کا ایک سبب نواب
صاحب کی موت بھی تھی۔ جب تک نواب صاحب حیات تھے، فیاض کی بغاوت کو نفرت کی چاند
ماری کے واسطے ایک نشانہ ملا ہوا تھا مگر جب سے نواب صاحب رخصت ہوئے فیاض کو سمجھ نہیں آ
رہی تھی کہ وہ اپنی گمشدہ شناخت کا ذمہ دار اب کسے ٹھہرائے۔

دوپہر کا کھانا فیاض نے کھائے بغیر واپس کر دیا اور بازو سَر کے نیچے رکھ کر کسی کملے کی
طرح آم کے درخت کی آدھی چھاؤں اور آدھی دھوپ تلے سویا رہا۔ سہ پہر ڈھلے جاگ ہوئی تو
کُھرپا اُٹھا کر اپنے آپ ہی بیرونی کیاریوں کی گوڈی کرنے لگا۔ پسینہ پیروں تک بہنا شروع ہوا
تو اُسے ہوش آیا کہ وہ تو میل سے بھرا ہوا کوئی ٹین بنا ہوا ہے جس سے بدبو کے بھبھکے اُٹھ رہے
ہیں۔ میلے پَن کے احساس سے کراہت ہونے لگی تو فیاض کُھرپا پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پسینہ آنے
سے بدن نہ صرف کُھل گیا تھا بلکہ ہَلکی ہَلکی بھوک بھی لگنے لگی تھی۔ کمرے میں آ کر اُس نے الماری
میں ہاتھ مارا تو ایک پُڑی میں سے تِل شکری کا ٹکڑا نکل آیا جو اُس نے احمد پور میں نواب صاحب
کے جنازے کے انتظار میں ایک ریڑھی والے سے خریدی تھی۔ تِل شکری کے اِس ٹکڑے نے اُس
کی بھوک کو بھڑکنے سے بچا لیا۔ بھوک کچھ کم ہوئی تو خیال آیا کہ کیوں ناں آج وکیل ریاض ہاشمی
سے مُلاقات کی جائے۔ یہ سوچ کر اُس نے جلدی جلدی دھلے ہوئے جوڑے کو الماری میں سے
نکال کر سیدھا کیا اور خود نہانے کے لیے سقاوے کی جانب چل دیا۔

آج کافی دنوں کے بعد اُسے بدن میں زندگی کی لہریں رقصاں محسوس ہو رہی تھیں۔
ٹھنڈے پانی کی دھار نے اُس کی رَگ رَگ میں سوئے ہوئے جذبوں کو چابک مار جگا دیا
تھا۔ شاید اُس کے لیے ریاض ہاشمی وکیل سے ملاقات کا تصور ہی کہیں پھر سے اپنی پہچان کے سفر

پر روانہ ہونے کا پروانہ تھا۔ اُسے دس برس پُرانا وقت یاد آ گیا۔ دِل چاہا کہ جا کر کچھ بڑا سا جھگڑا کرے کہ اُس کا لیڈر ہوتے ہوئے بھی ہاشمی وکیل نے اُس کی خبر ہی نہ لی۔ وہ چاہتا تو اُسے جیل سے چُھڑا سکتا تھا مگر اُس نے تو پرواہ ہی نہ کی، یکسر بھلا دیا۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اُسے خبر ہی نہ ہو کہ میں بہاول پور جیل میں ہوں۔''

''یہ کیا بات ہوئی کہ لیڈر کو اپنے ورکروں کا علم ہی نہ ہو۔ پھر کس کام کی ایسی لیڈری۔''

''پھر بھی جو کچھ ہے، لیڈر نہ سہی سنگتی تو ہے وَن یونٹ کے خلاف کوشش کا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ خود کسی جیل میں کسی عذاب میں مبتلا رہا ہو۔ جو بھی ہے ایک ملاقات تو بنتی ہے، پھر کیا ہو یہ بعد میں دیکھا جائے گا''۔ فیاض تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو رسول بخش میرانی اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

''بی بی یاد کر رہی ہیں تمہیں۔''

''بی بی صاحبہ کو کیسے پتا چلا کہ میں آج یہاں سے کھسکنے والا تھا۔''

میرانی پہلے تو تھوڑا سا جھجکا، حیران ہوا اور پھر زور کا قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''تم کیا سمجھتے ہو بی بی اتنی بے خبر ہے، پتا نہیں ہل سکتا اِس گھر میں اُسے بتائے بغیر۔''

''ناں میں تو نہیں سمجھتا مگر میرے ساتھ بے خبری بہت ہوئی ہے۔ مجھے تو یہ پتا بھی نہیں کہ مجھے یہاں لایا کیوں گیا ہے۔ میرا کام کیا ہے، میں نے کرنا کیا ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ایک جیل سے نکل کر دوسری میں آ گیا ہوں۔'' فیاض تو یوں پھٹ پڑا کہ جیسے اِسی لمحے کا منتظر ہو۔ میرانی نے چُپ سادھ لی اور پھر کچھ لمحوں کے بعد وہ دونوں سلمٰی بی بی کے ڈرائنگ روم نما بڑے کمرے میں کھڑے ہوئے تھے۔ سلمٰی بی بی کے وہاں نہ ہونے کے سبب اب وہ دونوں خاموش تھے۔ میرانی کے چہرے پر ناگواری اور فیاض دل کی بھڑاس نکال کر خود کو بہت ہلکا پُھلکا محسوس کر رہا تھا۔

سلمٰی بی بی آئی تو حسبِ معمول فیاض کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جب کہ میرانی

خود ہی اُلٹے پاؤں باہر نکل گیا مگر جاتے جاتے آنکھوں آنکھوں میں اُسے ایسا اشارہ ضرور کر گیا جسے سلمیٰ بدرالدین جانتی بھی تھی اور سمجھتی بھی تھی۔ سلمیٰ بی بی صوفے پر براجمان ہونے کے بعد بھی کچھ دیر تک خاموش رہی اور فیاض بھی گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ چند ثانیوں کے بعد سلمیٰ بی بی بولی ''سنا ہے کہ تم یہاں اُکتا چکے ہو۔''

فیاض ابھی جواب دینا چاہ ہی رہا تھا کہ سلمیٰ بی بی اُس سے پہلے بول پڑی۔ ''ٹھیک ہے، اُکتا جانا تو بنتا ہے کہ تمہارے جیسا جوان ایک جگہ کسی کام کاج کے بغیر نکما بیٹھا رہے تو پریشانی اِدھر اُدھر سے گھیر انہیں ڈالے گی تو کیا کرے گی۔ تم بھی سوچتے تو ہو گے کہ مجھے یہاں لایا کیوں گیا ہے، میرا کام کیا ہے، میں نے کرنا کیا ہے، ہے ناں ایسے؟''

فیاض نے حیرت سے سلمیٰ بی بی کو دیکھا۔ اُسے حیرت اِس بات کی تھی کہ بی بی کو اُن باتوں کا بھی علم تھا جو اُس نے صرف سوچی تھیں، کی نہیں تھیں مگر پھر بھی اُس نے اُس کی خبر تک نہ لی اور اب دل جلانے کے لیے اُس کے سامنے بیٹھی مسکرائے جارہی ہے۔

''اگر آپ کو علم تھا...... تو پھر یہ سب کچھ کیا۔ کم از کم میری خبر گیری تو کرتیں۔'' فیاض کے لہجے میں شکوے شکایتوں کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔

''خبر تو سبھی تھی مگر ضروری نہیں کہ اظہار بھی ہو۔'' سلمیٰ بدستور مسکرائے جارہی تھی کہ جیسے یہ سب کچھ اُس کے واسطے انتہائی غیر اہم ہو۔ وہ یوں لگ رہی تھی کہ جیسے کوئی سولہ برس کی شرارتی لڑکی کسی منہ لگتے کو زچ کر رہی ہو۔ فیاض نے آنکھ بھر کر اُسے دیکھا اور پھر گردن جھکا لی۔

''شاید ریاض ہاشمی آج بہت یاد آ رہا ہے۔'' فیاض نے گھبرا کر پھر سلمی کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک مسکرائے جارہی تھی۔ فیاض حیران تھا کہ اِس ارادے کا اُسے کیسے علم ہوا ہے۔ یہ تو ابھی تک اُس کے ذہن میں تھا، عمل تک تو نہیں پہنچا تھا۔ سلمیٰ کی نسبت اُس کے سارے اندازے غلط ثابت ہوتے چلے جارہے تھے۔

''کچھ خبر ہے کہ ایوب خان نے مارشل لاء لگانے کے بعد ایبڈ (EBDO) نام کا

قانون نافذ کیا تھا آٹھ برسوں کے لیے؟'' سلمیٰ بی بی نے ایکدم پینترا بدلا تو فیاض کے لیے حیرت کا ایک اور چابک جیسے اُس کا منتظر تھا۔ اُس کی نگاہ ایک بار پھر سلمیٰ کی طرف اُٹھی تو یوں لگا کہ جیسے وہ اُسے جانتی تک نہ تھی۔ مُسکان کی بجائے اب اُس کے چہرے پر انتہائی سنجیدگی اور وہ بھی اتنی کہ کسی کو چہرے پر نگاہ روک رکھنے کی جرات ہی نہ ہو سکے۔

''جی اِس قانون کے تحت سیاست، سیاستدانوں اور منتخب اداروں پر آٹھ برس کے لیے پابندی لگا دی گئی۔'' فیاض نے جواب دیا تو پھر بھی سلمیٰ بی بی کے چہرے کے تاثرات نہ بدلے۔ وہ پھر بھی اُس سے روکھے لہجے میں بات کر رہی تھی۔

''اور آٹھ برس کی یہ پابندی اِس برس یعنی 1966ء کے دسمبر میں ختم ہونے جا رہی تھی Elected Bodies Disqualification Order نام کے اِس کالے قانون کے تحت نیشنل عوامی پارٹی اور مشرقی پاکستان عوامی لیگ کے 75 لیڈروں کو نااہل قرار دے دیا گیا تھا۔ قصور اُن کا بھی یہی تھا جو تمہارا قصور۔ یعنی وَن یونٹ کی مخالفت کیوں؟ جب کہ مسلم لیگی لیڈروں کو چھوا تک نہیں گیا۔''

''جی سب کچھ جانتا ہوں..... دس برس کی جیل نے بہت کچھ بتا دیا ہے، بہت کچھ سِکھا دیا ہے۔'' فیاض کافی حد تک سکون میں آ گیا تھا۔

''یہ پابندی ختم ہونے میں صرف پانچ مہینے رہ گئے ہیں لیکن آٹھ برس کی پابندی نے سبھی سینئر لیڈروں کو ذہنی اور جسمانی طور پر ناکارہ کر دیا ہے۔ ایبڈو کی پابندی اُٹھائے جانے کے بعد سارے مُلک میں ایک بہت بڑا سیاسی خلا پیدا ہونے والا ہے اور اِس خلا کو پُر کرنے اور وَن یونٹ کے خلاف تحریک کو پھر سے آج کے حالات سے جوڑنے کے لیے نئی اور نوجوان سیاسی قیادت کی ضرورت ہوگی۔ کیا ہمارے پاس ایسی قیادت ہے کہ جو وَن یونٹ کے خلاف مزاحمت کو وہیں سے شروع کر سکے کہ جہاں سے اِسے ایبڈو کے بندی خانے میں قید کر کے اپنے تئیں ختم کر دیا گیا تھا''۔

''ہونہہ.......!'' فیاض نے ایک لمبا سانس لیا اور صوفے پر ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بی بی سماجی کام کاج کے بعد اب سیاست میں کود رہی ہے اور اس کے لیے اُس کے تجربے سے فائدہ اُٹھانے کی فکر میں ہے۔ فیاض کو ایک لمبی سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر سلمیٰ اپنی جگہ سے اُٹھی اور خلافِ توقع اُس کے اتنے قریب آ کر بیٹھ گئی کہ اُس کا سانس لینا بھی فیاض کو اپنی سانس بجھائی دے رہا تھا۔ فیاض بھونچکا ہو کر کھڑا ہو گیا مگر سلمیٰ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر پھر سے صوفے پر بٹھا لیا۔ فیاض کے ہاتھ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔ بلا سوچے سمجھے اُسے تُلسی کے رخصت ہونے کا وقت یاد آ گیا۔ اُس نے بھی تو ایسے ہی اُس کا ہاتھ تھاما تھا۔ مگر ہاتھ کی یہ گرفت اُس طرح کی نہیں تھی۔ تُلسی کے ہاتھ پکڑنے سے ایک سالم شہوتی عورت اُس کے اندر چلی آئی تھی جس نے پھر وہیں بسیرا کر لیا تھا۔ جب کہ سلمیٰ بی بی کے ہاتھ میں نہ عورت تھی اور نہ ہی عورت ہونے کا احساس۔ کسے معلوم اِس عورت کے احساس کو رَد کرنے میں اُس کے اندر بسیرا کر کے بیٹھی ہوئی تُلسی کی مزاحمت کا کوئی ہاتھ نہ ہو۔ عجیب مشکل میں پھنسا دیا تھا فیاض کو دو عورتوں کی دو الگ الگ جسمانی تمازتوں اور اِن تمازتوں کے احساس نے۔ تُلسی نے اپنی ایک ساعت کی نسوانی گرفت سے اُس کے اندر ایک وَن یونٹ بنا دیا تھا جب کہ سلمیٰ کی آج کی ڈھیلی ڈھالی گرفت اُس وَن یونٹوں کے خلاف مزاحمت کی بنیاد رکھ رہی تھی۔

فیاض کے اپنے آپ میں گُم ہو جانے کے سبب سلمیٰ سمجھی کہ وہ اُس کے قریب آ کر بیٹھنے اور ہاتھ پکڑنے کے سبب گھبرا گیا ہے۔ تبھی ذرا سا الگ ہو کر بیٹھی اور پوچھا۔ ''تم جانتے ہو کہ بہاول پور میں کون سی شخصیت ایسی ہے جو نواب صاحب اور سیاسی قیادت، دونوں کی کمی پوری کر سکے۔''

فیاض کے لیے یہ سوال اچانک نہیں تھا۔ اِس لیے تھوڑا سا اور پرے، کھسک کر بولا۔

''مجھے تو کوئی دکھائی نہیں دیتا۔''

''جیل کی کیا خبریں ہیں''....... سلمیٰ کے چہرے پر پھر سے مسکراتی ہوئی ملائمت

آ گئی تھی۔

''جیل میں تو یہی خبریں تھیں کہ نواب صاحب خود آئے گا نہ کسی اور کو آنے دے گا۔ لیکن یہ اُس وقت کی باتیں ہیں کہ جب نواب صاحب زندہ تھا۔ اب نہیں معلوم کہ کس کے کیا ارادے ہیں۔ نواب صاحب کی اولاد میں سے تو کوئی آنے سے رہا۔'' دھیرے دھیرے فیاض کچھ اور سکون میں آ گیا تھا۔

''مگر مجھے پکی خبر چاہیے۔'' سلمیٰ کی ملائمت میں پھر سے عجیب طرح کی سختی آ گئی تھی۔

''پکی خبر تو ریاض ہاشمی وکیل کے دفتر سے ملے گی۔'' یہ کہتے ہوئے فیاض اُٹھ کھڑا ہوا۔ فیاض کو اُٹھتا دیکھ کر سلمیٰ بدرالدین بھی کھڑی ہوگئی اور ایک بار پھر اُس کا ہاتھ پکڑا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''فیاض! جانے سے پہلے ایک بات سُن لو؛ پہلے تو میں کسی پر اعتماد کرتی نہیں اور اگر کر لوں تو اُسے قائم رکھتی ہوں۔ اِس وقت یہ کہنا ضروری ہے کہ میں نے تم پر اعتماد کر لیا ہے۔ اور ہاں، ایک اور بات۔ نہ تو میں دھوکہ دیتی ہوں اور نہ کسی کو دینے دیتی ہوں، لہذا سوچ سمجھ کر میرے ساتھ چلنا ہوگا تمہیں۔'' سلمیٰ کے مُسکراتے ہوئے چہرے پر آنکھوں کی خطرناکی کی حد تک استقامت دیکھ کر کسی کو بھی پسینے چھوٹ سکتے تھے۔ غالباً اسی لیے فیاض نے کوئی جواب دینے کی بجائے گردن جھکالی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

(30)

فیاض، ریاض ہاشمی وکیل کے دفتر پہنچا تو وہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ جس دفتر میں آج سے دس برس قبل چوبیس گھنٹے رونق لگی رہتی تھی آج وہاں ڈھونڈے سے بھی کوئی نہیں مل رہا تھا۔ اِدھر اُدھر سے معلوم ہوا کہ ہاشمی صاحب اپنی مرضی سے کچہری میں آتے ہیں اور اگر مرضی نہ ہو تو کئی کئی دن شکل ہی نہیں دکھاتے اور مُنشی عدالتوں میں پیش ہو کر پیشیاں لیتے رہتے ہیں۔ فیاض نے دفتر سے باہر پڑی ہوئی ایک نیم خستہ کرسی گھسیٹی اور مٹی جھاڑ کر اُس پر بیٹھ رہا۔

اُسے یاد آیا کہ یہی وہ جگہ تھی جہاں اُس نے پہلی بار ہاشمی وکیل کی زبانی جانا کہ ریاستیوں کی صدیوں کی شناخت کسی غیر نے نہیں بلکہ یہاں کے اُسی نواب نے ختم کی ہے کہ جسے رعایا انتہائے محبت میں دولہا سئیں کہتی ہے۔ دولہا سئیں کا فیصلہ سر آنکھوں پر کہ ریاست پاکستان کے ساتھ شامل ہو مگر نواب صاحب کو یہ اختیار کس نے دیا کہ وہ اٹھارہ لاکھ ریاستیوں کی شناخت کی قربانی دینے کے بعد خود منہ چھپا کر ولایت جا بیٹھے۔ فیاض نے آنکھیں اوپر کو اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے آپ سے مخاطب ہو رہا۔ ''دولہا سئیں آپ کو ریاستیوں سے کیے گئے سبھی مظالم معاف مگر وَن یونٹ کا گناہ تو یہاں کی دھرتی بھی معاف نہیں کر سکتی۔''

فیاض کا دل گھبرایا تو آنکھوں میں سے آنسو امڈ آئے۔ دن ڈھلا تو نہیں تھا مگر پھر بھی ڈھلنے کی جانب گامزن تھا۔ اُس نے چہار جانب کچہری میں نگاہ دوڑائی تو یوں لگا کہ جیسے کوئی حملہ آور ابھی ابھی اِدھر آنکلا تھا اور کچہری کو برباد کر کے آگے بڑھ گیا۔ صبح سویرے دن چڑھے لوگوں کی بھیڑ بھاڑ پھر سے بکھر چکی تھی۔ فیاض کا مقدمہ بھی عجیب مقدمہ تھا، اُس کی اغوا شدہ شناخت کی تلاش اور برامدگی کا۔ مگر نہ تو کہیں تھانے میں اِس کا مقدمہ درج ہوا اور نہ ہی کوئی عدالت اسے سننے کو تیار۔ نہ کوئی منصف، مُنصفی پر راضی اور نہ ہی استغاثہ چالان پیش کرنے پر آمادہ۔ گواہ تو ایک جہان تھا مگر گواہی دینے کی کسی میں ہمت اور نہ ہی حوصلہ۔ جیل میں ہوتے ہوئے فیاض نے ایک بار سوچا ضرور کہ اپنی شناخت کی چوری کا پرچہ تاریخ کے تھانے میں درج کرائے گا مگر جیل سے باہر آ کر معلوم ہوا کہ تاریخ کے تھانے کا محرر تو لکھنا ہی نہیں جانتا، چٹا اَن پڑھ ہے۔ وہ صرف وہی صفحے جوڑ کر ایف آئی آر کا رجسٹر بنائے رکھتا ہے جو اُسے حاکم کے دربار میں سے قاضی کے ٹھپے کے ساتھ وصول ہوا کرتے تھے۔

آج کے دن نے تو فیاض کو بالکل ہی چپا ڈالا تھا۔ صبح کی مونجھ منجھاری کے بعد سلمیٰ بی بی کا رویہ اُس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ گذشتہ چھ مہینوں میں اُس نے کیا کیا سمجھا تھا اِس بی بی کو۔ ایک اللہ لوک امیر زادی جسے جوانی ہی میں بیوگی کا سامنا کرنا پڑا، کس قدر ہمت سے نہ صرف لوگوں کے کام آ رہی تھی بلکہ اپنے خاندانی کاروبار کو بھی سنبھالے ہوئے تھی۔ فیاض کو سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ اتنے مضبوط کردار کی عورت چھ مہینوں کے بعد ہی ایکدم اُس کا ہاتھ پکڑ کر جسمانی قرب کی خواہاں ہو جائے گی اور وہ بھی محض اپنی سیاست کو چمکانے اور بڑھاوا دینے کی خاطر۔ وہ سلمیٰ کے ہاتھ پکڑنے کو شاید کوئی بلا ارادہ حرکت سمجھ لیتا مگر جس طرح اُس نے فیاض کو اپنے سخت گیر مزاج کی سخت گیری کے بارے میں دھمکایا تھا، اِس نے اُس کی ساری مہربانیوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

فیاض حیران تھا کہ لوگ اُسے کیا سمجھتے ہیں؟ اُس کے والد نے اُسے کیا سمجھا۔ اُس نے

حکیم سے طب سیکھنے کی خواہش کی تو حکیم صاحب نے کس طرح اُسے اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا۔ اگر چہ اُس پر اعتماد کیا گیا تھا مگر اِس اعتماد کا مفاد کس کے فائدے میں تھا۔ مہراں اُس پر مہربان ہوئی تو محض حاملہ ہونے کی اپنی خواہش کی تکمیل کی آرزو میں۔ تُلسی نے بھی شاید اُسے ڈاک خانے کا لیٹر بکس ہی سمجھا کہ اگر وِشنو پسند نہیں تو اپنے کنوارے جسم کی چابی کا پہلا بیرنگ پارسل اُسی میں ڈال دے تاکہ باقی کی تمام عمر وِشنو اُسی کھلے ہوئے لفافے کو گوند لگانے کی کوشش میں بسر کرتا پھرے۔ اُس کا چچا اور باقی کے گھر والے صرف اُسی صورت اُس سے راضی ہو سکتے تھے اگر وہ حکیم صاحب کی امانت اُن کے حوالے کر دیتا۔ اَپنی ریاست کے نام نشان کو رہائی دلوانے کے لیے اُس نے اینٹی وَن یونٹ فرنٹ کا دفتر کھولا تو دس برس کی جیل کاٹنی پڑی اور وہ بھی بلا کسی سماعت، وکیل اور دلیل کے۔ اِن دس برسوں میں نہ تو ریاست نے اُس کی خبر گیری کی اور نہ ہی ریاستیوں نے۔ ریاست کی شناخت تلاش کرتا کرتا وہ خود اپنی شناخت گنوا بیٹھا تھا۔

جیل سے نِکلوانے کے بعد بیگم سلمٰی بدرالدین اُسے گھر لے آئی تو اُس نے زندگی کو پہلی بار ایک نئے ڈھب سے محسوس کیا کہ جس میں شناخت کا قضیہ نہ ہونے کے باوجود شناخت کی جستجو کی اُتاول نہیں تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ زندگی بغیر کسی شناخت کے بھی گزاری جا سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ زندگی کا کوئی مقصد ہو، زندگی بلا مقصد بھی چسولی ہو سکتی ہے۔ ریڈیو، خبریں، گانا بجانا، کھانا اور سونا زندگی کا کوئی اور راستہ دکھا رہے تھے کہ جہاں جگ جہان سے یکطرفہ جُڑت بھی آگے چل کر کئی راستوں کے ساتھ جُڑتی جا رہی تھی۔ لیکن وہ تو شاید یکطرفہ ساخت کا بندہ ہی نہیں تھا اِسی لیے بہت جلد اُکتا گیا۔

شروع شروع میں اُس کا خیال تھا کہ بیگم سلمٰی بدرالدین اُسے کسی غرض سبب گھر لے آئی ہے مگر جب ہمہ قسم عیش و آرام بہم پہنچانے کے باوجود کئی مہینوں تک اُس نے فیاض کی طرف توجہ ہی نہ کی تو یقیناً اُسے اپنے ہونے کا احساس بھی ہوا اور اُسے اِس طور رَد کیے جانے کی ذلت کا رنج بھی۔ مگر جب اُسے خود بیگم صاحبہ نے بُلا بھیجا تو وہ حیران بھی ہوا اور خوش گماں بھی کیونکہ اُس کا

وجود ایک بار پھر تسلیم کیا جا رہا تھا۔ لیکن جس طرح سلمیٰ بی بی نے اپنے مفاد کے لیے پہلے اُسے رجھانے اور پھر کھڑ کانے کی کوشش کی، اُس نے اُسے فیاض کے روبرو کوڈی ٹکہ کا بھی نہ رہنے دیا۔ کہاں بیگم سلمیٰ بدرالدین کی پھٹے خانی اور کہاں ایک عورت کا اپنے مفاد کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنے کی پہلی سیڑھی پر قدم دھرتے ہوئے آکڑ دکھانے کی ناکام کوشش۔ فیاض کو یوں لگا کہ ایک اور مہراں اور ایک اور نلسی روپ بدل کر نئے نام سے اُس کے سامنے آکھڑی ہوئی ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ دونوں اپنے رویوں میں بیگم سلمیٰ بدرالدین سے برتر تھیں۔ وہ ہر طرح سے اپنے آپ کی نفی کرتے ہوئے اُس کے قرب میں آئی تھیں، بکمل اطاعت اور سبھی ہتھیار پھینک کر۔ مگر یہ کیسی عورت تھی کہ جو اُسے استعمال تو کرنا چاہتی ہے مگر اُس کی گردن پر پاؤں دھرتے ہوئے۔

فیاض کا دماغ کسی ایسے سیارے کی طرح گھوم رہا تھا کہ جو اپنے مدار سے برگشتہ ہو چکا ہو۔ بیگم سلمیٰ بدرالدین بظاہر اینٹی وَن یونٹ ہونے کا تاثر دے رہی تھی لیکن فیاض کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ وَن یونٹ کی غاصبیت کو توسیع دینے کے مشن پر ہے۔ جس قسم کا وَن یونٹ وہ فیاض کے ساتھ بنانا چاہ رہی تھی وہ اُس وَن یونٹ سے مختلف نہ تھا کہ جو گذشتہ دس برسوں سے پاکستان کی سبھی کمزور قوموں پر زبردستی مسلط کر دیا گیا تھا۔

کافی دیر کے بعد فیاض کو ٹوٹی ہوئی کرسی کی پھٹیاں چبھنے کا احساس شدید ہوا تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ کچہری میں اندھیرا چھا چکا تھا۔ اُس نے سَر کو دائیں بائیں زور سے جھٹکا اور فیصلہ کر لیا کہ اب وہ کسی طور بیگم سلمیٰ بدرالدین کے مہمان خانے میں واپس نہیں جائے گا۔

''اگر وہاں نہیں جانا تو پھر جانا کہاں ہے......؟'' ظاہر ہے فیاض کے پاس اِس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ذہن میں ایک بار خیال ضرور آیا کہ اب اِس آکڑ خانی میں کچھ نہیں رکھا، روٹی کپڑا اور سَر پر چھت میسر ہے، واپس جاؤ اور مزے سے رہو۔ جتنا ہو سکے بے وقوف بناؤ اُس عورت کو اور زندگی کے چار دن اچھے سے گزار لو۔ عمر بھر دوسروں کے ہاتھوں استعمال ہوتے رہے

ہو، اب استعمال کر کے تو دیکھو کہ اِس کا لطف کتنا الگ ہے، کس قدر لذت ہے اِس راند میں کہ جسے سیاست کہا جاتا ہے؟

مگر دِل نہ مانا۔ فیاض نے یہی فیصلہ کیا کہ اب واپس بیگم سلمیٰ بدرالدین کی کوٹھی میں قدم نہیں رکھنا، رات چاہے ریلوے پلیٹ فارم پر ہی کیوں ناں گزارنی پڑے۔ ریلوے پلیٹ فارم کا ذہن میں آیا تو ساری کھچپل ہوا ہو گئی، مسئلہ ہی حل ہو گیا تھا۔ فیاض بہاول پور کے ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے کے لیے چوک فوارے سے گزرا تو بھوک نے مکالمے کا آغاز کر دیا۔ احمد پوری دروازے کے اندر سے توے پر قیمے والی ٹکیوں کے تلے جانے کی تیز مسالے والی چراری خوشبو باہر تک آ رہی تھی۔ فیاض کے پاؤں اپنے آپ ہی وہیں جامد ہو گئے۔ جیب میں ہاتھ مارا تو اچھا خاصا ٹٹولنے کے بعد بھی دس آنے کے سکے ہی دستیاب ہو سکے۔ چار آنے میں پیٹ بھر روٹی کھائی جس کے آخر میں میٹھے کے طور پر دو نوالے ربڑی کے بھی تھے۔ کیا سواد تھا تہہ در تہہ بنائی گئی چھلکوں والی ربڑی کا بھی۔ فیاض کو احمد پور کی نکی بازار کی منظور ٹُنڈے والی ربڑی اور ملائی یاد آ گئی جسے خریدنے کے لیے لوگ عصر سے پہلے دوکان پر برتن رکھ جایا کرتے تھے۔ باری کے مطابق ایک قطار میں رکھے ہوئے مختلف سائز اور اشکال کے کٹورے، مُنگر اور گھوگھڑے۔ سودا تیار ہوتے ہی اونچی چوکی پر بیٹھا ہوا اُستاد منظور ٹُنڈا ترتیب کے ساتھ برتنوں میں حسبِ طلب کہیں مَلائی اور کہیں ربڑی ڈالتا جاتا اور جس جگہ مال ختم ہوتا تو وہیں خالی رہ جانے والا بدقسمت مُنگر اُلٹا کے رکھ دیا جاتا۔ فیاض نے ایک عرصے کے بعد داڑھ کو لذت آشنا تو خوب کیا مگر بھولی بسری باتیں یاد کرتے ہوئے جو ہاتھ کلیجے پر پڑا اُسے چھڑانے اب کون آتا؟ دل تو پہلے ہی بوجھل سا تھا اُس پر اُلٹا اثر پیٹ کے ساتھ ساتھ نیت بھارویں روٹی نے کیا کہ جس کے سبب فیاض کی آنکھوں میں تھکن آلود خمار اُتر آیا تھا۔ اُس نے دُکاندار سے وقت پوچھا تو ابھی بمشکل نو ہی بجے تھے۔ گرمیوں کے نو تو ایسے ہی تھے کہ جیسے سورج ابھی غروب ہوا ہو۔

فیاض احمد پوری دروازے سے نکل کر سامنے چوک میں بنے ہوئے فوارے کی بنّی پر

بیٹھ گیا۔ کبھی جگ مگ کرتا یہ فوارہ نجانے کب سے بند پڑا ہوا تھا۔ مٹی اور کچرے سے اَٹے ہوئے فوارے کے اندر کائی نے سوکھ کر عجیب سی غلاظت کا ماحول پیدا کر رکھا تھا جس پر جا بجا خشک ہو چکے انسانی فُضلے کی جلیبیاں صاف بتا رہی تھیں کہ ان دنوں یہ فوارہ کس مقصد کے لیے اور کون استعمال کر رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد وہاں سے ایک موٹر گزری تو اُس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی فوارے کے اطراف میں بنے ہوئے شیروں کے منہ پر پڑی جن میں سے کسی زمانے میں پانی کی دھاریں نکلا کرتی تھیں مگر اب اِن شیروں نے شرم سے آنکھیں موند رکھی تھیں۔ فیاض کو یوں محسوس ہوا کہ یہ شیروں کے منہ نہیں بلکہ بیگم سلمیٰ بدرالدین کے ہاتھ ہیں جو چاروں طرف سے اُسے اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ بیگم سلمیٰ بدرالدین کے ہاتھوں کا احساس کتنا مُردہ احساس تھا کہ جن کے اندر سے نسائیت کی حدت کی بجائے کسی مُردار کے گلنے سڑنے کی بو ابھی تک آ رہی تھی۔

طبیعت کی سُستی تقاضا کر رہی تھی کہ وہ وہیں کہیں فُٹ پاتھ پر سو جائے مگر وہ ہمت کر کے اُٹھا اور عید گاہ اور گلزارِ صادق کے وسط میں سے گزرتی اسٹیشن روڈ پر قدم بھرنے لگا کہ جو بیگم بدرالدین کی کوٹھی کے سامنے سے گزر کر ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد فیاض، بیگم بدرالدین کی کوٹھی کے سامنے تھا۔ وہ وہاں سے اجنبی بن کر گزرنے لگا تو شاہراہ اُس کے پیروں سے لپٹ گئی کچھ اِس طرح سے کہ اُس کا قدم اُٹھانا محال ہو گیا۔ دل چاہا کہ اندر اپنے کمرے میں جا کر نرم بستر پر سو جائے؛ خفا ہونا نہ تو کسی طور بنتا تھا اور نہ ہی زیب دیتا تھا۔

لیکن اِس تمام تر احساس کے باوجود وہ گھر جو آج صبح تک اُسے اپنا اپنا محسوس ہوتا تھا یکدم بیگانہ ہو کر رہ گیا۔ اُس نے آنکھیں بھر کر گھر کو دیکھا تو دل ڈوبنے لگا۔ اُس نے آج صبح ہی پھولوں والی کیاریوں کی گوڈی کی تھی۔ اُس کا کھرپا بھی ابھی تک وہیں پڑا ہوگا کہ جس کے ساتھ اُس نے کل صبح باقی کی گوڈی کرنی تھی۔ مگر اب یہ گھر اُس کا نہیں رہا تھا۔

''صرف اُسی سے ہی اُس کا گھر بار کیوں چھینا جا رہا ہے۔ گھر کے ساتھ دَر اور دَر کے ساتھ جُڑی ہوئی شناخت، سبھی کچھ پلک جھپکتے ہی کیوں اُس کے نہیں رہتے۔ میں نے تو آخرکار

جیل کو ہی اپنا گھر بنالیا تھا مگر وہاں سے بھی نکال دیا گیا۔ اب اگر یہاں اِس گھر میں تھا تو یہاں رہنا بھی میرے بس میں نہیں رہا۔ نہ تو جیل میری شناخت اور نہ ہی آزادی میری پہچان۔'' اُس کے بھیتر کوئی پورے زور سے چیخا۔ فیاض کے لیے اب یہ کوٹھی جبر اور غاصبیت کے استعارے کے سوا کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ اِس کوٹھی کے نرم بستر کی کشش اور بیگم سلمیٰ بدرالدین کے ہاتھ کے بے حس احساس سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ اِس دیو کی ہر علامت، ہر نشانی سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا جو کمزور قوموں کی باقی ماندہ شناخت کی گردن پر اپنا پاؤں دھر کر براجمان ہو چکا تھا۔

فیاض کے بدن میں ایک بار پھر اپنی سوچ کی قوت کو ایک نکتے پر مرکوز کرنے والی لہریں اُٹھیں اور وہ پوری طاقت سے اپنے پاؤں اُکھڑوا کر اِس قدر تیزی سے بھاگا کہ سانس پھولنے کے سبب سینہ لوہار کی چرمی دھونکنی بن گیا۔ وہ جلد از جلد ہر قیمت پر بیگم سلمیٰ بدرالدین کی کوٹھی کی حدود سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ نکل بھاگنے میں کامیاب تو ہو گیا مگر اُس کا احساس فیاض کو اُس وقت تک نہ ہوا کہ جب تک وہ پلیٹ فارم پر رکھی بینچ پر جا کر بیٹھ نہ گیا۔ پھر بھی اُسے اپنا سانس بحال کرنے میں خاصی دیر لگی۔

یہ کیسا خوف تھا، اِس کی سمجھ خود اُسے بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ کس سے خوفزدہ تھا، یہ بھی ابھی طے ہونا باقی تھا۔ کیا یہ محض شناخت کے نہ ہونے کا خوف تھا یا شناخت کیے جانے کا خوف؟ بہر حال جو بھی تھا اِس کی شدت اِس سے پہلے اتنی کبھی شدید نہیں ہوئی تھی۔ فیاض کو لگا کہ اُس کے اندر کی مزاحمت ہر آنے والے دن کے ساتھ گھٹتی جا رہی تھی۔ جس طرح وہ بیگم سلمیٰ بدرالدین کے روبرو بھگل ہوا تھا اِس قسم کا واقعہ تو اُس کی پوری زندگی میں کبھی نہیں ہوا تھا کہ جب اُس نے مزاحمت کی بجائے فرار کا راستہ اختیار کیا ہو! اُسے اپنے آپ سے کراہت ہونے لگی تھی۔ کچھ ساعتیں گزر چکیں تو فیاض کو ہلکی ہلکی سردی کا احساس ہونے لگا۔ اُس نے اپنے آپ پر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ تیزی تیز چلنے کے باعث وہ پسینے پسینے ہو چکا تھا۔ تھوڑی سے ہوا چلی تو پسینہ خشک ہونے کے سبب ٹھنڈک کا احساس ہونا تو لازمی تھا۔ بدن کی ٹھنڈک نے کچھ دیر بعد اُس کے

کھولتے دماغ کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔ اُس نے سَر کے بالوں میں انگلیاں پھیریں تو بال خشک ہو کر آپس میں یوں جُڑے ہوئے تھے کہ جیسے سریش سے جوڑ دیے گئے ہوں۔

بہاول پور ریلوے اسٹیشن کا وسیع وطویل پلیٹ فارم بالکل ویران پڑا ہوا تھا۔ خاصے فاصلے کے وقفے سے لگے ہوئے زرد بلبوں کی روشنی اتنی بھی نہیں تھی کہ چند فٹ تک ہی اُجالا کر سکتی مگر پھر بھی اتنا احساس ضرور کرا رہی تھی کہ یہاں مکمل اندھیرا نہیں ہے۔ یہاں رکنے والی آخری ٹرین آٹھ بجے کی رخصت ہو چکی تھی۔ فیاض کا جی چاہا کہ وہیں سو جائے مگر پھر خیال آیا کہ ہر کسی آنے جانے والے کی ''تو کون میں کون'' سے بچنے کے لیے ضروری تھا کہ ایک طرف ہٹ کر سویا جائے۔ وہ اُٹھ کر تھوڑا سا آگے کی طرف گیا کہ جہاں پلیٹ فارم ختم ہو رہا تھا۔ اِس جگہ نواب صاحب کے سیلون کے لیے ایک عالی شان عمارت کی صورت چاروں طرف سے قفل زدہ پلیٹ فارم بنایا گیا تھا مگر اب یہ ایک عرصے سے بند پڑا ہوا تھا۔ فیاض کو اِس عمارت کے ساتھ جڑے ہوئے عام مسافروں کے پلیٹ فارم پر رکھی ہوئی ایک اور بینچ دکھائی دی۔ اُس نے ہاتھوں سے اِس پر پڑی ہوئی مٹی جھاڑی اور بازو کا تکیہ بنا کر لیٹتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ ہلکی ہلکی ہوا اِس قدرے دور اُفتادہ جگہ پر اور بھی لطف دے رہی تھی تبھی سارے دن کی تھکن سے چور ہو چکا یہ مردِ دل گرفتہ گام گام نیند کے تالاب میں اُترتا چلا گیا۔ نیند آنے سے پہلے کا آخری احساس بیگم سلمیٰ بدرالدین کی اُس دھمکی کا تھا کہ نہ تو وہ کسی کو دھوکہ دیتی ہے اور نہ ہی دینے دیتی ہے۔

چوتڑوں پر پڑنے والے دو تین بیدوں نے نہ صرف فیاض کی چیخیں نکلوا دیں بلکہ وہ اِس طرح ہڑبڑا کر اُٹھا کہ جیسے واقعی بیگم سلمیٰ بدرالدین کی گرفت میں آ چکا ہو۔ آنکھیں کھلیں تو اُس کے سامنے ہاتھ میں بید پکڑے ریلوے پولیس کا سپاہی کھڑا ہوا تھا جس نے اُس کے بیدار ہوتے ہی دو چار کڑک دار گالیاں مزید اُگل دیں۔ اُس پر بید کے پے در پے وار سونے پر سہاگہ اور ساتھ ہی یہ سوال کہ وہ ہے کون، کہاں سے آیا ہے اور یہاں سو کیوں رہا ہے۔ اِس صورت حال میں اتنا پتا تو فیاض کو بھی چل گیا کہ یہ سلمیٰ بیگم کی بھیجی ہوئی پُولیس نہیں ہو سکتی۔ جسم سہلاتے ہوئے فیاض کے

پاس اب کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ کم از کم اپنا نام تو بتا دیا جائے۔لہذا بتا دیا۔

سپاہی نے لاکھ اُتا پتا پوچھا مگر اُس نے ہر بار یہی بتایا کہ وہ کسی زمانے میں ریاست کی بستی محراب والا میں رہا کرتا تھا مگر جب ریاست ہی چھین لی گئی تو شناخت بھی چوری ہو گئی۔اب صرف نام ہے اُس کا، پتا نشان، بستی مکان کچھ بھی نہیں۔سپاہی تنگ آ گیا تو اُسے گریبان سے پکڑ کر ریلوے پولیس کی چوکی پر لے آیا جہاں تھانیدار تو دھوتی بنیان پہن کر چار پائی پر سویا ہوا تھا مگر حوالدار کُرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔فیاض نے چوکی کی دیوار پر نصب گھڑیال پر وقت دیکھا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔سپاہی کے بوٹوں کے کھڑکار کی آواز سن کر حوالدار نے آنکھ کھولی تو سپاہی کے ساتھ ایک شکار کو دیکھ کر خوشی سے جھوم اُٹھا کہ روٹی روزی آ گئی۔

''اُوئے کسے پکڑ لائے ہو نازو''......

''سئیں مشکوک ہے، سیلون والی سائیڈ پر کسی واردات کے چکر میں تھا۔''

''اچھا اچھا اچھا......اور یہ جو تین چار چوریاں ہوئی ہیں سیلون سے قیمتی سامان کی، یقیناً یہی بہن چود ہو گا''۔حوالدار اُٹھ کھڑا ہوا اور فیاض کے قریب آ کر اُس کے منہ پر دو چار تھپڑ جڑ دیے اِس کمال سے کہ اُس کے منہ سے خون بہنے نہیں بلکہ رسنے لگا۔

''ووئے نازوا.....یہ تو مجھے چور نہیں دکھائی دیتا۔یہ تو کوئی نرم ملوک مخلوق ہے جو میرے دو تھپڑ بھی برداشت نہیں کر سکا۔''

''اُوسئیں یہ تو بہت بڑا بہن تڑیک ہے، اُپنا پتا نشان ہی نہیں بتاتا۔''

''اچھا! تو کہتا کیا ہے۔''

''یہی کہ پہلے تو ریاستی تھا، اب ریاست چھن گئی تو پتا رہا اور نہ ہی نشان۔نہ بستی نہ مکان۔''

''اچھا!.......یہ بھاڑی کوئی شاعر تو نہیں ناں؟''

''معلوم نہیں سئیں.....''

''اچھاتم لے چلو اسے پچھواڑے، کچھ تو خدمت کی جائے مہمان کی۔ یہاں چیخا چلایا تو صاحب کی نیند خراب ہوگی''۔ حوالدار کی بات سن کر سپاہی نے فیاض کو پھر سے گریبان سے پکڑا اور اُسے چوکی کے عقبی دروازے سے باہر دھکیل دیا۔ اُن دونوں کے جانے کے بعد حوالدار بھی باہر پچھواڑے کی جانب چلا گیا۔

آدھ پون گھنٹے کے بعد پچھلا دروازہ کھلا اور حوالدار ہانپتا کانپتا، نازو سپاہی کو گالیاں بکتا پھر سے کرسی پر آن گرا۔ اُس کے پیچھے پیچھے نازو سپاہی بھی اندر چلا آیا اور حوالدار کے سامنے رکھی میز کی دوسری جانب کھڑا ہو گیا۔

''کہا نہیں تھا کہ یہ چور نہیں ہے، میں نے گھاس نہیں کاٹی ساری زندگی، پولیس بازی کی ہے۔ ایسے کئی احمق سڑکوں پر خوار ہوتے پھر رہے ہیں کہ جن کے دماغ میں ابھی تک ریاست کا کیڑا کلبلا رہا ہے۔ اِن کو عقل ہی نہیں کہ ریاست گھس گئی وہیں کہ جہاں سے نکلی تھی اپنے نواب سمیت۔ اب یہ وَن یونٹ ہے، یہی اِن بھڑووں کا پتا نشان ہے لیکن یہ بہن کے تیتے وقت کے ساتھ چلنے کی بجائے وقت کی پرچھائیں کے ساتھ چلتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ اگر وقت کو ریورس گیئر لگ گیا تو اور کسی کا کچھ نہیں بگڑنا، یہ خود ہی کچلے جائیں گے۔ لے آ وَ اِس بھڑوے کو اندر کہ باقی کی رات صاحب کی مُٹھی چاپی کرے۔ صبح سویرے اِسے احمد پور والی پہلی بس پر بٹھا دینا۔ ہونہہ...... رات بھی برباد کی حرامزادے نے اور جیب میں صرف چھ آنے۔ چھلڑ جو ہوتا ایک آدھ اِس بھڑوے کے پاس کم از کم روٹی روزی تو بن جاتی آج کی۔''

(31)

شب بھر تھانیدار کی ٹانگیں اور پاؤں دبانے کے بعد دوسرے دن صبح سویرے فیاض کو ریلوے پولیس کی چوکی سے اس طرح نکالا گیا کہ ناز وسپاہی خود جا کر اُسے احمد پور والی پہلی لاری پر سوار کرا آیا۔ مزید تاکید کنڈیکٹر کو یہ کی گئی کہ اِسے احمد پور آنے تک اِدھر اُدھر کھسکنے نہیں دینا۔ لاری روانہ ہوئی تو فیاض کے لیے آنکھیں کھولنا مشکل ہو رہا تھا۔ ساری رات کا جگارا اور ٹانگیں دبانے کی مشقت کیا کم تھی کہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اُس کے دماغ تک کو سُلا دیا۔

نیند کے غلبے سے پہلے اُس کے ذہن میں کُھد بُد کرتا احساس اب تک کہیں جاگ رہا تھا کہ پولیس اُس جیسے بھوکے ننگے اور عذاب ملزموں سے جان کیونکر چھڑاتی ہے۔ نہر میں بہتی لاوارث لاشوں کو اپنے تھانے کی حدود سے آگے دھکیلنے اور رُولے کی ماری بے ثمر وارداتوں کو دوسروں کے گلے کا ہار بنانے کی کوشش میں جائے وقوعہ اور تھانے کی حد بندی کا جھگڑا کھڑا کر دینا کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ فیاض کو یوں لگا کہ وہ بھی نہر میں بہتی ہوئی کوئی لاوارث لاش ہے کہ جسے بہاول پور ریلوے چوکی کی پولیس نے تھانہ احمد پور کی حدود کی جانب دھکیل دیا ہے۔

بس میں چڑھتی اُترتی سواریوں کی چیخ وپکار کے باوجود سوئے رہے فیاض کی آنکھ

کھلی تو کنڈیکٹر خانپور مرچاں والے اڈے کی آواز لگا رہا تھا۔ خانپور مرچاں والا، احمد پور آنے سے کوئی آٹھ دس میل پہلے ایک چھوٹا سا اسٹاپ تھا جہاں سے نور پور نورنگا اور احمد پور کے درمیانی علاقے کی سواریاں آنا جانا کیے رہتی تھیں۔ فیاض نے سَر کو جھٹکا، ذہن کچھ بیدار ہوا تو اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ لاری کی سبھی سیٹیں نہ صرف پُر تھیں بلکہ کچھ سواریاں تو اپنی بکریوں سمیت سیٹوں کے درمیانی راستے میں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک بکری نے مینگنیاں کرتے ہوئے پچھلی سواری کے کرتے دھوتی پر میناکاری کی کوشش کی تو دونوں سواریوں میں مُکے گھونسے اِس طرح شروع ہوئے کہ بکری کو مینگنیاں کرنی بھی بھول گئیں۔ ساتھی مسافروں نے اُنہیں چھڑا تو لیا مگر کبھی ہلکی کبھی تیز گُر گُر احمد پور کا اڈا آنے تک لگی رہی۔

فیاض اِس تماشے سے بے نیاز سوچتا چلا جا رہا تھا کہ تقدیر اُسے کیسے پھر سے احمد پور لیے جا رہی ہے۔ جس شہر سے دس برس پہلے اُسے پولیس کے ذریعے شہر نکالا مِلا تھا اب اُسی شہر میں اُسے پولیس ہی کے حکم پر لے جایا جا رہا تھا۔ پولیس نے پہلے اُسے زبردستی بہاول پور کی جیل میں رکھا مگر اب اُس کا حق اُسی بہاول پور شہر کے ریلوے اسٹیشن پر دھری ایک بینچ پر بھی تسلیم نہیں کیا جا رہا تھا۔ حقیقت اگر یہ ہے تو وہ کیسے ہو گیا ایک آزاد مُلک کا آزاد شہری۔ اِس آزاد مُلک میں تو عام آدمی کی تقدیر کے سبھی فیصلے انگریز دور کی طرح اب بھی وہی طبقہ کیے جا رہا تھا جس کے ہاتھ میں طاقت کی لٹھ تھی۔ اُن کی رضا کہ جس کو یہاں رہنے کا حق دیں یا چھین لیں۔

بس کو اڈے پر بریک لگی تو باقی سواریوں کی طرح فیاض بھی نیچے اُتر گیا مگر اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جائے تو کہاں جائے؟ دن کا پہلا پہر بھی اچھا بھلا چڑھ چکا تھا۔ بھوک محسوس ہوئی تو اُس کا ہاتھ سیدھا جیب میں گیا۔ مگر اب یہ جیب خالی تھی۔ وہاں رکھے سکے پُلسیوں نے نکالے لیے، بس کنڈیکٹر کے ہاتھ لگے یا کسی جیب تراش کے، حقیقت صرف یہی کہ اُس کی جیب خالی تھی۔ کل شب سے فیاض کی خشک ہو چکی آنکھوں میں نجانے نمی سی کیوں اُترنے لگی تھی۔ وہ شہر جس کے بازاروں کو اُس نے پہلی بار باپ کے کندھوں پر بیٹھ کر دیکھا تھا آج اُس کے لیے بالکل

ہی اجنبی تھا۔کہاں جائے، کس کے ہاں مہمان ہو اور ہو گا کون جو اُس کے واسطے آنکھیں بچھائے بیٹھا ہو۔اُسے اپنی ملکیت میں آیا ہوا حکیم رام لعل کا مڑھی والا مکان یاد آیا جو اُس کے نام ہوتے ہوئے بھی اب اُس کا نہیں رہا تھا۔

کُچھ دیر تک اِدھر اُدھر ٹُر ٹُر دیکھنے کے بعد اُس کے قدم خود بخود تحصیل بازار کی طرف اُٹھ گئے۔ بازار میں داخل ہوتے ہی تقریباً سو گز کے فاصلے پر اُسے تھانے کی عمارت دکھائی دی تو اُس کے قدم تیز ہونے کی بجائے آہستہ ہوتے چلے گئے۔سامنے پکوڑے والے مشہور کھوکھے پر صبح کا پہلا پہر ہونے کی وجہ سے حلوہ قتلما تیار کیا جا رہا تھا جب کہ شام کو یہاں پکوڑے بنائے جاتے تھے۔مگر اچھی خاصی بھوک کے باوجود خالی جیب فیاض کے پاس اِس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ یہاں سے گزر جائے۔لہٰذا اُس نے یہی کیا۔

پُرانی تحصیل کا دروازہ گزرتے ہوئے احمد پور کی غلہ منڈی شروع ہو جاتی تھی۔ گُڑ، شکر، دیسی گھنڈ، کنک، باجرہ، جُوار، مکئی، لال مرچ اور دیگر اجناس کی رَلی مِلی خوشبو اور اُن کی اَدھ کھلی بوریوں کی قطاریں ہر دُکان کے سامنے سجی ہوئیں اور اُن کے درمیان میں پھرتے ہوئے آڑھتیوں کے منشی جن کے آنے جانے کی وجہ سے میٹھی جنس کی بوریوں پر اُڑتی، اُترتی اور پھر سے بیٹھتی مکھیاں اجتماعی طور پر منڈی کا ماحول بنائے ہوئے تھیں۔ فیاض منڈی کے سامنے سے گزرنے لگا تو ایک بیل گاڑی پر لادے جانے کے لیے رکھی ہوئی آٹھ دس بوریوں کے سبب راستہ تقریباً مسدود ہو چکا تھا۔راستہ کھلنے کا انتظار کرتے ہوئے دیگر لوگوں کے ساتھ فیاض بھی وہیں ٹھہر گیا کہ ریڑھی ہٹے تو وہ بھی آگے چلے۔ اِسی آن میں ریڑھی بان نے فیاض کو دیکھا تو غصے سے بولا کہ کھڑے کھڑے شکلیں دیکھے جا رہے ہو بوریاں رکھو پکڑ کر ریڑھی پر۔ فیاض اِسے بھی قسمت کی برہمی سمجھتے ہوئے آگے بڑھا اور پھر پانچ منٹوں میں سبھی بوریاں ریڑھی پر لادی جا چکی تھیں۔ بوریاں لدوا کر فیاض ایک طرف ہوا تو ساتھ کھڑے ہوئے آڑھتی کے منشی نے اُس کے ہاتھ پر ایک چُونی رکھ دی۔فیاض نے حیران ہو کر منشی کی طرف دیکھا تو منشی کا لہجہ اچھا بھلا غصیلا ہو گیا۔

''چل چل یہی کافی ہے۔ایک ریڑھی کی پلے داری کا اور کیا روپیہ ہوتا ہے؟'' فیاض اب سمجھا کہ مُنشی اُسے پلے دار سمجھ رہا تھا۔ دِل چاہا کہ چُونی مُنشی کے مُنہ پر دے مارے مگر بھوک کے شدید احساس نے اُسے وہ چُونی جیب میں ڈالنے پر مجبور کر دیا۔گردن جھکائے وہ واپس پلٹا اور تھانے کے سامنے حلوہ پوری کے کھوکھے پر آ کر گرم گرم پُوریاں اُترنے کے منتظر گاہکوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔محض کچھ لمحوں کی مشقت کے بعد اب وہ اپنی مرضی کا نِران کر سکتا تھا۔تین آنے کی حلوہ پوری کھا کر اُسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ایک جہان کا رزق کھا لیا ہو۔پیٹ میں کچھ گیا تو جسم بھاری اور آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئیں۔فیاض کو کچھ اور نہ سوجھا تو وہ کھوکھے کے پچھواڑے پڑی ہوئی ایک پُرانی کُرسی پر بیٹھنے سے زیادہ لیٹ گیا۔نیند سے بے حال تو پہلے ہی تھا سو گہری نیند آنے میں کچھ دیر بھی نہ لگی۔

فیاض کی آنکھ کھلی تو سورج وسط آسمان پر اور دھوپ اُس کے پورے بدن پر پھیلی ہوئی تھی۔اُس کا جسم پورے کا پورا پسینے پسینے اور حلق پیاس سے لکڑی کی طرح خشک۔وہ گھبرا کر تیزی سے اُٹھا اور اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔حلوہ پوری والا کب کا کھوکھا بند کر کے جا چکا تھا۔پینے کے پانی کی تلاش میں فیاض نے اطراف میں نگاہ کی تو تھانے کے مرکزی دروازے کے ساتھ ہی ہینڈل والا نلکا دکھائی دیا۔ایک ہاتھ سے نلکا گیڑ اور دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی کا کٹورا بنا کر نیت بھر پانی پینے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔جہاں پیاس بجھی وہاں بدن میں ہونے والی خشکی کا احساس بھی ختم ہو گیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو پلے داری کی مزدوری سے بچا ہوا ایک آنہ ابھی تک موجود تھا۔فیاض نے آنے کو ہتھیلی پر رکھ کر غور سے دیکھا اور سوچا کہ آج شام سے پہلے اِس آنے کو روپیہ بنانا کتنا ضروری ہے۔یہ خیال آتے ہی وہ واپس غلہ منڈی کی طرف چل پڑا۔تحصیل دروازے کی اگلی گزرگاہ پر صبح والا مُنشی کھڑا ہوا تھا۔

''ووئے بھکن آ.... کہاں دفع ہو گیا تھا۔صبح سے فرصت ہی نہیں مل رہی۔اب بھی دس ریڑھیاں رَس کُٹ گُڑ کی لادی جانی ہیں۔دو پلے دار پہلے ہی اُدھر کام میں جُتے ہوئے ہیں، آ

جلدی کر اور آ کر بوریاں اُٹھوا"۔ منشی ایک ہی سانس میں ساری روداد کہہ گیا۔ فیاض کو اُس کا خود کو بھکن بلانا بہت بُرا لگا مگر موجودہ صورتحال میں زیادہ غصہ کرنے میں اپنا ہی نقصان تھا اِسی لیے برداشت کر لیا اور آگے بڑھ کر بوریوں کو کمر پر لادتے ہوئے بیل ریڑھی پر ڈالنے لگا۔

شام ہونے سے پہلے فیاض کی جیب میں ایک روپے کی بجائے اڑھائی روپے تو آ چکے تھے مگر اُس کے بدن کا انگ انگ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ منڈی کی دوکانیں بند ہوئیں تو وہ وہیں ایک دوکان کے بیرونی پھٹے پر لمبا ہو گیا۔ کپڑے تو میلے ہوئے سو ہوئے کمر بھی دوہری ہو کر رہ گئی۔ غلہ منڈی کی گزرگاہ میں رش کم ہوا تو وہاں شام کو کھانے پینے کی ریڑھیاں اور چھابے لگانے والے کئی لوگ اِدھر اُدھر سے یوں اکٹھے ہو گئے کہ جیسے پہلے سے اِس قسم کی قبضہ گیری کے لیے منتظر رہے ہوں۔ قیمے کی ٹِکیاں، آلو اور اِملی کی ٹکی والے پکوڑے، سیخ کباب، کلیجی کی بھنی بوٹیاں، سری پائے، اوجھڑی، پکوڑے اور دال مُنگ کی ریڑھیوں نے اتنا رَش برپا کیا کہ لوگوں کا گزرنا محال ہو گیا۔ ریاست کے دیگر شہروں کی طرح احمد پور میں بھی شام کو کھانا پکانا خواتین کے لیے سُستی اور عذاب سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے شوہر عموماً گھر جاتے ہوئے اِسی کوشش میں ہوتے کہ شام کا کھانا بازار سے لیتے جائیں۔ اگر یہ شام جمعرات کی ہوتی تو ازدواجی ماحول کو خوشگوار رکھنے کی خواہش میں مٹی کے گھوگھڑوں میں ربڑی ملائی کا ٹھنگو رسوا ہوتا جس کے باہر چنبیلی کے گجرے لپٹے ہوئے ہوتے۔ جو لوگ وہیں ریڑھی پر کھانا پسند کرتے تو اپنی اپنی چھبی لے کر آڑھتیوں کی دوکانوں کے اگلے تھڑوں پر چڑھ کر بیٹھ جاتے اور موقع پر کھانے کا مزہ لیتے۔

کئی اقسام کے کھانوں کی ملی جلی خوشبو نے فیاض کی بھوک کو چمکا دیا تو وہ تھڑے پر اُٹھ بیٹھا۔ جیب میں اچھی بھلی رقم کے احساس نے کھانے کے انتخاب کو مشکل بنا دیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے دو روٹیوں پر کلیجی کی بھنی ہوئی بوٹیوں کی خاصی مقدار رکھوائی اور پانی کا ترماؤ گلاس بھر کر پھر سے تھڑے پر آن بیٹھا۔ پیٹ میں کھانا گیا تو نیند نے بھی آنے میں تاخیر کو مناسب نہ سمجھا اور فیاض چھبی گلاس واپس کیے بغیر ہی وہیں لَم لیٹ ہوتا چلا گیا۔

یہ جو بھی تھا فیاض کی زندگی میں ایک نیا در کھلا تھا۔ پلے داری میں نہ تو مزدوری کی کمی تھی اور نہ ہی آمدنی کی۔ اُس نے پٹھان چوکیدار سے دوستی جوڑ لی اور منڈی میں ہی ایک کرائے کے چوبارے کا بھائی وال بن بیٹھا۔ دو جوڑے کپڑوں کے بھی لے لیے اور سونے کے واسطے گوندر کی نرم چٹائی بھی۔ زندگی آسان ہوئی تو وہ سبھی باتیں پھر سے یاد آنے لگیں جنھیں وہ زندگی کو قائم رکھنے کی کوشش میں بھلا بیٹھا تھا۔ پلے داری کی مشقت ہڈیوں میں جذب ہوئی تو بدن میں اُتری ہوئی تھکن بھی گھٹتی گھٹتی بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ دن کو تو اس قسم کی فرصت ذرا کم ہی ملتی مگر شام ہوتے ہی روٹی بھاجی کے بعد جیسے ہی وہ چٹائی پر لیٹتا تو ماضی کسی مَنڈوے کی فلم بَن کر آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ فیاض کو روزانہ یہی ایک سوچ بار بار زِچ کئے رکھتی کہ تمام عمر شناخت کی تلاش میں دربدر رہنے والا کیسے بے نام ونشاں کئے جانے کے بعد اپنے ہی شہر کے ایک کوچے میں پھینک دیا گیا ہے۔ بے بسی اِس قدر کہ کسی کو اپنا نام تک بتانے کا نہیں تھا، منہ دکھانے کا نہیں تھا، اِس لیے داڑھی بڑھا، بھیس بدل کر رہتی سہتی پہچان کو بھی خود ناس کرنے کے بعد کس قدر تن آسان اور بے فکرا ہو گیا تھا۔ کیا بے نام ونشاں ہو جانا بھی ایک پہچان ہے! کیا اپنے شہر میں بے وسیلہ اور لاوارث ہو کر رہنا بھی کسی منزل اور کسی مقام کے حصول کی کوئی شکل ہے؟

فیاض کو کہیں سے بھی کوئی جواب نہ ملتا تو اُسے اپنے آپ سے کراہت ہونے لگتی۔ کیا دنیا میں یوں بھی ہوتا ہوگا کہ انسانوں کی ایک پوری نسل کو نسلِ انسانی کے تسلسل کی تختی سے اِس طرح کچے پُرنیوں کی مانند مِٹا دیا جائے کہ نہ تو اُن کی کہیں قبر بنے اور نہ کسی مسوان میں ایک مٹھی راکھ کی دکھائی دے؟ لیکن کیا کیجئے کہ یہی حقیقت ہے۔ فیاض کی ہمراہی میں ایک پوری نسل اپنی شناختی کے لحاظ سے اِس طرح فنا ہوئی کہ نہ تو اُس کا ابتدائی سِرا دستیاب تھا اور نہ ہی آخری۔

فیاض کے چہار اطراف تعلقات کی ایک نئی دنیا آباد ہو چکی تھی۔ تین چار مہینوں کی مسلسل محنت سے اُس نے اتنے پیسے کما لیے کہ اب وہ اگر کئی دن کام پر نہ بھی جاتا تو بھوک اُس کا مسئلہ نہیں رہی تھی۔ اپنے مخصوص حلیے اور اللہ لوک قسم کی طبیعت کے سبب وہ کسی سے گاڑھا میل

جول رکھے بغیر بھی کسی کو اجنبی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ عاجزی اور انکساری نے اُس کے ظاہر کو اتنا ملائم کر دیا کہ منڈی کا ہر آڑھتی اُسے اپنے ہاں کام پر رکھنے کی خواہش کرنے لگا۔ اُسے بھی گمنامی کی اِس زندگی میں انوکھی سی لذت آنے لگی تھی لیکن ایسی زندگی جس کا کوئی مقصد ہی نہ ہو اُس کے لیے ہر آنے والے دن کے ساتھ گزارنی مشکل ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اِس ''ہونے یا نہ ہونے'' کی کیفیت نے اُسے زندگی کے اِس نئے فلسفے سے روشناس کرا دیا تھا کہ زندگی کسی پہچان یا شناخت کے بغیر تو پھر بھی گزاری جا سکتی ہے مگر کسی مقصد کے بغیر نہیں۔ فیاض کی زندگی کا مقصد کیا تھا اِس کی سمجھ اُسے ابھی تک نہیں آ رہی تھی؟ مقصد بھلا دینا تو کہاں رہ گیا، شناخت کے لیے زندگی کو بے شناخت کر کے بھی نہ تو اُسے زندگی کے مقصد کا سراغ ملا اور نہ ہی کبھی اِس کا خیال آیا۔

اُس روز بھی دوپہر ڈھلی تو آڑھتیوں کے مُنشیوں نے دُکانیں بند کرنے کے لیے اجناس کی منہ کُھلی بوریاں اندر رکھوانی شروع کر دیں۔ پیاس لگی تو فیاض بھی تحصیل دروازے کی جانب چل دیا جہاں ایک بوڑھا مہاجر شربت بیچنے کے لیے پُشت پر بندھی ایک بہت بڑی تر ماؤ صراحی اُٹھائے پھرتا رہتا۔ پیٹ پر چمڑے کی کوئی پیٹی نما چیز کمر تک لپیٹی ہوئی جس میں شیشے کے لمبے لمبے گلاس اڑسے ہوئے۔ ''پی ایک آنے کا گلاس'' کی آواز لگاتا ہوا یہ سلو کا پوش کردار صبح سے شام تک کا وقت وہیں کھڑے کھڑے یا ہلکا ہلکا گھومتے ہوئے گزار دیتا۔ فیاض نے اُسے ایک آنہ دے کر شربت کا ایک گلاس لیا اور منڈی کی گزرگاہ کے سامنے جوتوں کی بڑی دوکان ''گلزار بوٹ ہاؤس'' کے تھڑے پر بیٹھ کر اسے چھوٹے چھوٹے گھونٹ کی صورت پینے لگا۔

بازار کے اژدھام اور شور شرابے میں کسی چھوٹے سے بچے کی درد سے رونے اور کراہنے کی آواز اِس طرح سے آ رہی تھی کہ جیسے اُس میں اونچی آواز میں رونے کی سکت ختم ہو چکی ہو۔ فیاض نے اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک دیہاتی لڑکی ''گلزار بوٹ ہاؤس'' کے تھڑے کی دوسری جانب گود میں کوئی سال بھر کا بچہ لٹائے اپنے دونوں گھٹنوں کو زور زور سے ہِلا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں سے تو جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے مگر اُس کے بچے کے سَر پر مکھیاں اِس طرح یلغار کئے

ہوئے تھیں کہ جیسے گُڑشکر کی بوری کُھلی رکھی ہو۔ یہ سب کچھ دیکھ کر فیاض کا جی متلانے لگا۔ بچہ ضرور بیمار تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ اُٹھ کر لڑکی سے بیماری کا احوال پوچھے مگر یہ سوچ کر لاغرض ہونے کی کوشش کی کہ نجانے وہ اِسے کیا سمجھے۔

اتنی دیر میں ایک گبھرو پریشان صورت، ہاتھ میں دوائی کی شیشیاں پکڑے اُس لڑکی کے پاس آن بیٹھا۔ اپنی جسمانی زبان سے وہ اُس لڑکی کا شوہر لگ رہا تھا۔ اُس کے آنے پر لڑکی نے بچے کے سَر سے ململ کا کپڑا اہٹایا تو معلوم ہوا کہ اُس کے سَر کی اوپری جلد گل کر بھات ہو چکی جس سے جگہ جگہ پیپ بہہ رہی تھی۔ اب تو فیاض سے نہ رہا گیا۔ وہ اُٹھا اور گبھرو کے پاس جا کر پوچھ بیٹھا کہ یہ تکلیف کب سے ہے۔ ہمدرد جان کر گبھرو نے اپنے بیٹے کی بیماری کی ساری حقیقت کھول سنائی۔ کون سی دوا اور کیسا علاج تھا کہ جو انہوں نے اب تک نہیں کیا تھا مگر ہر بار خرابی پہلے سے بھی سوا ہوتی گئی۔ آج بھی وہ بچے کو بخاری میڈیکل اسٹور کے بخاری صاحب کو دکھا کر لائے ہوئے تھے۔ بخاری صاحب نے بادلی کٹورے میں چھنگلی گھول کر پلائی اور بند شیشی بھی دی۔ آتے آتے دَم بھی کیا کہ ہوسکتا ہے کسی نے پُھل دھاگہ نہ کیا ہو۔ فیاض نے بند شیشی لے کر دیکھی تو سَر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ اِس دوا کا بھلا بچے کی بیماری سے کیا تعلق۔

''میری مانو تو اِس دوائی کو چھوڑو اِس سے آرام نہیں آنا۔ اِس کے سَر پر بُگن بوٹی کا لیپ کرو، اچھی طرح گھوٹ کر۔ اور جب لیپ خود ہی سوکھ جائے تو اُتار دیں۔ تین چار لیپ کے بعد بچے کے سر پر نئی جلد آنا شروع ہو جائے گی۔ تو پھر سب خیراں مہراں''۔

''بُگن بوٹی؟ .... یہ کہاں سے ملے گی''۔ گبھرو نے حیران ہو کر پوچھا۔

''عام مل جاتی ہے، کسی بھی نہر کنارے چلے جاؤ، جنگلی گھاس کی مانند اُگی ہوگی۔ اِسے کھود کر بوری بھر رکھو اور پھر دیکھو اِس دوا کا جادو''۔ فیاض نے نسخہ تو بتا دیا مگر اُن دونوں میاں بیوی کے چہروں پر کوئی تاثر ایسا نہیں تھا کہ جس سے اُن کا اعتبار جھلک رہا ہوتا۔ وہ وہاں سے لوٹا تو پھر سے آڑھتی کے پھٹے پر بیٹھنے کی بجائے اپنے چوبارے کی سیڑھیاں چڑھا اور اُداس ہو کر چٹائی پر

سویا نہیں، بلکہ دھم کر کے گر گیا۔ اُسے لگا کہ حکمت کا اچھا بھلا کسب سیکھنے کے بعد اُس کا اِس طرح سے پلے دار بن کر بوریاں ڈھونے پر لگ جانا خود اپنی زندگی کے ایک مقصد کی توہین تھی۔ کہاں خلق خدا کی تکالیف کو رفع کرنے کا ہنر اور کہاں محض اپنا پیٹ پالنے کے لیے خودغرضائی کی خجالت۔ حکیم رام لعل کے مطب اور ساری گزری گزران اُسے یوں لگی کہ جیسے کل کی بات ہو۔ کتنی عزت تھی کہ پردہ دار گھرانوں کی خواتین بھی اپنی کلائی اُس کے ہاتھ میں دے دیا کرتی تھیں اور کہاں آج کی یہ پلے داری کہ ہر آتا جاتا گالی بک کر جاتا ہے۔ واہ رے جرات کا فقدان کہ اب تو گلے سڑے سَر والے بچے کی ماں سے اتنا پوچھنے کی جرات بھی نہ رہی کہ بچے کو تکلیف کیا ہے! فیاض کا دِل چاہا کہ دھاڑیں مار کر رو دے۔ یہاں سے تھوڑے سے فاصلے پر ہاتھی بازار اور ہاتھی بازار کے قرب میں مڑھی اور مڑھی سے ملحقہ تُلسی کا گھر جو کا غذات کی حد تک اُس کا اپنا گھر بن چکا تھا مگر اُس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ جا کر اُس گھر کی کُنڈی کھڑ کا سکے۔ یہی حال ڈیرہ نواب کے بازار میں واقع مطب کا تھا۔ وہاں بھی فیاض کی جرات الوداع کہہ چکی تھی کہ مطب تو کیا، ڈیرے کی بازار میں سے بھی گزر سکے۔ دِل نے کہا کہ پھر سے حکمت شروع کر دے مگر جیب میں چار پیسے ہونے کے باوجود وہ حوصلہ کہاں سے لے آتا کہ جو اُسے دنیا کے سامنے سینہ تان کر زندگی بسر کرنے کی چابک دستی دے سکتا۔ جو جرات اور حوصلہ فیاض سے اُس کے والدین کی مخالفت، حکیم رام لعل کی شروع شروع کی بے رُخی، پاکستان بننے کے بعد کے دنوں کی حوصلہ شکن وارداتیں اور دس برس کی جیل نہ چھین سکی وہ سبھی کچھ محض چھ مہینوں کی بناوٹی لگاوٹ سے بیگم سلمیٰ بدرالدین نے اِس طرح نچوڑ لیا کہ اُسے خبر تک نہ ہو سکی۔

اگلے تین چار روز فیاض کام پر نہ گیا۔ آڑھتیوں اور پلے داروں نے بار بار پُچھوایا مگر فیاض کے پاس طبیعت خراب ہونے کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو کیا بتاتا؟ کوئی اپنی برہنگی بھی عیاں کرتا ہے۔ کیسے بتائے کہ ہاتھ پاؤں سلامت ہوتے ہوئے بھی دِل شکستہ کرے تو کیا کرے۔ اُس کے چوبارے کا بھائی وال پٹھان چوکیدار بھی الگ سے پریشان کہ اچھے بھلے

تگڑے مُسٹنڈے کو کیا ہو گیا ہے۔ دو چار دن اور گزرے تو اپنی بے وقعتی اور بے اوقاتی سے اُکتایا ہوا فیاض چوبارے سے اُتر کر قاضی صالح محمد آڑھتی کے پَتھارے پر آن بیٹھا۔ دس گیارہ بجے بھی اُسے بھوک تو تھی مگر ناشتہ کئے بغیر بھی کھانے پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ صبح کے مزدوری پر جُتے ہوئے پلّے دار بھی حبس سے پسینو پسینے ہو کر ہانپتے پھر رہے تھے۔ فیاض کو فارغ بیٹھا دیکھ کر لالو اور بلاول پلّے دار بھی بوریاں ڈھو کر اُس کے پاس دم لینے آن بیٹھے۔ اِس سے پہلے کہ حال احوال، بٹ کڑاک تلک جاتا ایک بچے والی زنانی اور اُس کے گھر والا فیاض کا اَتا پتا پوچھتے پچھاتے وہاں آئے اور اُسے پہچان کر اُس کے قدموں میں گر گئے۔ لڑکی تو روتی سو روتی اُس کا گھبرو بھی رو پڑا۔

فیاض اور اُس کے ساتھ بیٹھے ہوئے پلّے دار لالو اور بلاول پہلے تو پریشان ہوئے کہ ہو کیا گیا ہے مگر جب معلوم ہوا کہ دونوں میاں بیوی کا رونا خوشی کا رونا ہے تو پھر کہیں جا کر فیاض کے ساتھ ساتھ اُن کی بھی جان میں جان آئی۔ اُنہوں نے بتایا بھی سہی اور دِکھایا بھی سہی کہ بُکن بوٹی کے چند روز کے لیپ سے بچے کا گلا ہوا سَر کیسے بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ ساتھ بیٹھے ہوئے پلّے داروں کے لیے بھی یہ بات بڑی عجیب سی تھی کہ فیاضا پلّے دار اِتنا سیانا حکیم کب سے ہو گیا ہے؟ یہ رُولا کھولا دیکھ کر وہاں سے گزرتے ہوئے گاہک، آڑھتیوں کے مُنشی اور خود کئی آڑھتی بھی اکٹھے ہو گئے۔ اب جتنے مُنہ اُتنی ہی باتیں۔ کوئی حیران، کوئی مُسکے اور کوئی ٹھٹھہ مخول کرنے لگا۔

فیاض نے جلدی جلدی اُن میاں بیوی کو چلتا کرنے کی کوشش کی مگر وہ اُس کے واسطے لایا گیا نذرانہ دیے بغیر جانے کو تیار نہیں تھے۔ نذرانہ کیا تھا، کندورے میں لپٹی ہوئی مِٹھی ڈولی روٹی تھی اور اِس کے ساتھ کچھ نقدی۔ فیاض نے بہت زور لگایا مگر اُن کو کون ٹالے۔ جھولیاں اُٹھا کر دعائیں الگ اور نذرانہ دینے کی کوشش سوا۔ اِس صورت حال کو لوگوں نے تماشہ بنا لیا۔ اِس سے پہلے کہ گرم ہوتے دن کی حبس میں لڑکی کے بازوؤں میں اُٹھایا ہوا بچہ بے حال ہو جاتا، فیاض نے گھبرو کے ہاتھ میں جو کچھ بھی تھا، لے لیا اور چوبارے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

چھنبے ہوئے رومال میں چار ڈولی روٹی کے ٹکڑے اور ہاتھ میں ایک روپے کے

چُڑے مُچڑے نوٹ کی پڑی نما کوئی شکل تھی۔ فیاض کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔ اُس نے شکرانے کے انداز میں اوپر کی طرف دیکھا، اُس کے سَر پر نیلی چھت کی بجائے سرکنڈوں سے بنائی گئی پتلوں کی چھت تھی مگر سامنے رکھی چار میٹھی ڈولی روٹیاں آج سے اُسے اُس رزق کی علامت جیسی لگیں کہ جس کے تعاقب میں اِنسان کو خود نہیں دوڑنا پڑتا بلکہ وہ خود چل کر اُس کے پاس آتا ہے۔ اُس کی ہتھیلی پر پڑا ہوا ایک روپے کا چُڑوں مُچڑوں نوٹ بھی صرف نوٹ نہیں تھا بلکہ اُس کے ہونے کا ثبوت اور اُس کی خستہ حال، بھلی بُھلائی شناخت کا عکس تھا۔ فیاض دونوں ہاتھوں سے سَر پکڑ کر چٹائی پر بیٹھ گیا۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ لوگوں کا اُس پر ہنسنا اور اُس کے حکیم نہ ہونے کا مذاق اُڑانا ہی اُس کے سمجھدار حکیم ہونے کی دلیل بن گیا تھا۔

نجانے کب فیاض کی آنکھ لگ گئی اور وہ وہیں چٹائی پر ہی سو گیا۔ ایک مُدت کے بعد اُس پر اُسی نیند کا غلبہ ہوا تھا کہ جو بچپن میں ماں کی گود میں آیا کرتی تھی۔ خوابوں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ تھا کہ جو اُس کی نیند کو زینہ بہ زینہ گہرائی کی طرف لئے جا رہا تھا۔ اِس سے پہلے کہ عصر ہوتی، پٹھان چوکیدار نے اُسے ہلا جُلا کر جگا دیا۔

''اُٹھو مڑا حکیم صاب تمہارا مریض آئی ہے''۔ فیاض کو پہلے پہل تو کچھ نہ سوجھا مگر جونہی وہ حقیقی بیداری کی طرف پلٹا تو دیکھا کہ تین چار عورتیں، تین چار مرد چوبارے کے دروازے سے باہر سیڑھی میں کھڑے ہوئے تھے۔ پٹھان نے فیاض کو حیران دیکھا تو پھر بولا۔

''یہ سب تم سے اپنا علاج کرانے آئی ہے۔ ماڑا دیکھو ناں اِن کو۔ کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہے''۔ فیاض کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی کانوں پر۔ بچے کا ٹھیک ہو جانا تو محض اتفاق ہو گیا مگر دیکھتے ہی دیکھتے مریضوں کی قطار کا لگ جانا اُس کی سوچ سے باہر تھا۔ چلیں ٹھیک ہے وہ اُن کی نبض تو دیکھ ہی سکتا ہے، بیماری بھی جان لے گا مگر دوائی کہاں سے دے گا، اُس کے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ مگر پھر بھی باہر کھڑے مریضوں کے چہروں پر پھیلی ہوئی لاچاری اُس سے دیکھی نہ گئی۔ وہ اُٹھ کر اُن کے پاس آیا اور سمجھانے لگا کہ اگرچہ وہ ایک عرصہ پہلے حکمت

کیا کرتا تھا مگر اب ایسا کچھ بھی اُس کے پاس نہیں سب چھوڑ چکا ہے۔ نہ دوا نہ دُکان۔

''نبض بھی دیکھ لوں گا، بیماری بھی جان لوں گا مگر دوائی کہاں سے دوں گا۔ آپ لوگ کسی اور حکیم کے پاس جاؤ''۔ فیاض منہ پھیر کر واپس کمرے میں جانے لگا تو ایک بوڑھے مریض نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ فیاض زِچ ہو کر پیچھے کی طرف مڑا تو دیکھا کہ بوڑھے کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا چکی تھیں۔

''حکیم صاحبا! میری ایک ہی بیٹی ہے، چھ مہینے ہو چکے ہیں مگر اُس کا بخار نہیں اُتر رہا۔ میں علاج کرا کرا کر تھک گیا ہوں اور وہ ہڈیوں کی مُٹھ ہو کر رہ گئی ہے۔ نہ مَرتی ہے اور نہ ہی جینے کے قابل رہی ہے''۔ بوڑھے کے آنسو برسات ہوئے تو اُس کو ہچکیاں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ فیاض کو یوں لگا کہ اُس کا کلیجہ باہر آ جائے گا۔ اُس نے سیڑھیوں پر نگاہ دوڑائی تو نیچے تک مریض کھڑے ہوئے دکھائی دیے۔ دَر پر آئی خلقِ خدا کو دھتکارے تو کیسے دھتکارے۔ چُپ کر کے چٹائی پر بیٹھ رہا اور رُندھی ہوئی آواز میں چوکیدار سے کہا کہ اِن سب کو باری باری اندر بھیجتے جاؤ۔ وہ ایک مریض کو دیکھتا، اُس کا نام اور بیماری کاپی پر لکھتا اور اگلے روز دوائی لے جانے کا کہہ چھوڑتا۔ جسے دوائی کی بجائے محض پرہیز کی ضرورت ہوتی یا کسی کو غذا کی تبدیلی ہی سے شفا کا امکان ہوتا تو اُسے پرہیز یا کسی دیگر غذا کی تاکید کر دیتا۔ یونہی ایک گھنٹے کے لگ بھگ اُس نے سبھی مریض بُھگتا لیے۔ فیس لینے سے انکار کے باوجود اُس کے پاس گیارہ روپے اِکٹھے ہو گئے۔ پٹھان چوکیدار الگ حیران کہ یہ کملا اگر حکمت جانتا تھا تو پھر بوریاں ڈھو ڈھو کر اپنے آپ کو کیوں خوار کرتا رہا ہے۔ پٹھان کی حیرت سے قطع نظر فیاض اُٹھا کہ عطا محمد پنساری کی دوکان سے دوائیں لا کر، اُن کو کوٹ، چھان پھٹک کر مریضوں کے لیے پُڑیاں بنا رکھے۔

اگلی صبح فیاض کے چوبارے کے سامنے جہاں گذشتہ کل کے دوائی لینے والے مریض قطار بنا کر بیٹھے ہوئے تھے وہاں آج کے نئے مریض بھی کل سے دگنی تعداد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فیاض نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھیں اوپر کو اُٹھائیں تو اب بھی آسمان اور اُس کے

درمیان سرکنڈوں والی پتلوں کی چھت حائل تھی۔اُس نے نزان کئے بغیر ہی مریضوں کو بلانا شروع کردیا۔مریضوں کا بُلارا شروع ہوا تو شب بھر کا جاگا ہوا پٹھان چوکیدار آنکھیں مسلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔فیاض کی نئی شناخت اب ''چوبارے والا حکیم'' تھی۔چوبارہ......جو نہ زمین پر اور نہ اسمان پر۔

(32)

صدر ایوب خان نے اگر چہ وَن یونٹ کو اپنے بوٹوں کی دھمک کے ساتھ اچھے سے مضبوط کر چھوڑا تھا مگر جبر کی سیمنٹ اور خوف کی بجری سے تعمیر کئے گئے اِس مینار میں پہلی دراڑ اُس وقت در آئی کہ جب اُس نے بنیادی جمہوریت کے جھانپو کے ذریعے صدارتی الیکشن میں محترمہ فاطمہ جناح کو شکست کے گرداب میں دھکیل دیا۔ اِس میں دوسری دراڑ 1965ء کی جنگ کے بعد معاہدہ تاشقند اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کی ایوب مخالف تحریک کی صورت اُبھری۔ اِس تحریک کا مقصد چاہے جو بھی تھا مگر ایوب خان کی کرسی اُلٹانے کے لیے اندر خانے وہ سارے طبقات اِس میں شامل ہو چکے تھے کہ جو کسی ناں کسی شکل میں وَن یونٹ کے مخالف رہے تھے۔ ایوب خان کے اقتدار کے خاتمے کی صورت اُن کو وَن یونٹ ٹوٹتا دکھائی دے رہا تھا۔

جب کہ 30 نومبر 1967ء کو پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے ساتھ ہی مُلک میں دائیں اور بائیں بازو کی عملی سیاست کی لکیر کھینچ دی گئی تو وَن یونٹ کی حامی سبھی قوتیں اکٹھی ہو کر دائیں جانب کا مورچہ سنبھال کر بیٹھ گئیں۔ پاکستان کی کمزور کر دی گئی لِسانی ثقافتوں نے پہلی بار بڑے نام والے رہنماؤں کے چہروں سے فریب کے مکوٹھے اترتے ہوئے دیکھے تو اِس کے ردِ عمل

میں اِن کی مخالف پارٹی ، پاکستان پیپلز پارٹی کی جانب کھنچتے چلے گئے۔ اگر چہ وَن یونٹ کے بارے میں پیپلز پارٹی کا کوئی واضح موقف سامنے نہیں آیا تھا مگر پھر بھی دشمن کا دشمن آخر کو دوست ہی ہوتا ہے۔ تبھی وَن یونٹ کے خلاف ڈھکی چُھپی جدو جہد کرنے والے سبھی دانشور، وکیل، طالب علم، ڈاکٹر، مزدور، سیاسی کارکن اور کاشتکار اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے واسطے اِس پارٹی کے نام کے ساتھ جُڑتے چلے گئے۔

ایوب خان کا مارشل لاء لگتے وقت فیاض جیل میں تھا۔ اُس کے سمیت وَن یونٹ کے خلاف تحریک چلانے والے سبھی کارکنوں کو یقین تھا کہ ایوب خان نے جس طرح آتے ہی وَن یونٹ بنانے والے سبھی لیڈر رو کوتُن پور بَونجاہ پہنچایا ویسے ہی وہ اُن کو رہا کرے یا نہ کرے مگر وَن یونٹ ضرور توڑے گا لیکن کُرسی پر بیٹھنے کے بعد وہ سبھی کچھ بھول کر محض اپنی کُرسی بچانے کی کوششوں میں لگ گیا۔ جتنی نفرت فیاض کو ایوب خان سے اپنی آس کے ٹوٹنے کی تھی اُتنی تو اُن لوگوں سے بھی نہ تھی کہ جنہوں نے اُس کی ریاستی شناخت کو ملیا میٹ کر کے وَن یونٹ بنایا تھا۔

ایوب خان کے خلاف نفرت کا کوئی ایک دہانہ یا گزرگاہ نہیں تھی۔ لوگ جس چیز سے نالاں ہوتے اُس کا رخ نفرت کی علامت کے طور پر ایوب خان کی طرف موڑ دیتے۔ چینی چار آنے مہنگی ہوئی تو بُرا ایوب خان اور آٹا دو آنے مہنگا ہوا تو نفرین ایوب خان پر۔ 1967ء کے آتے آتے شہر شہر بستی بستی اچھے بھلے جلسے جلوس شروع ہو گئے۔ اِن کی شروعات سکول اور کالجوں سے ہوئی اور پھر یہ نفرت گلی گلی محلے محلے پھیلتی چلی گئی۔ اُن دنوں فیاض کی حکمت بھی چل نکلی تھی۔ اگر چہ اُس نے غلہ منڈی والا چوبارہ چھوڑ دیا تھا اور لاری اڈے کے قریب دکان بنالی تھی مگر اُسے اب بھی ''چوبارے والا حکیم'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ سیاست سے الگ تھلگ ہو کر رہنے کے باوجود وہ جب کبھی ایوب خان کے خلاف کسی جلسے جلوس کی خبر سُنتا تو جی چاہتا کہ دکان کو دفع کرتے ہوئے جلوس میں پہنچے اور ایسی تقریر کرے کہ لوگ اپنی راہ میں آنے والی ہر شے کو چیرتے پھاڑتے ہوئے سیدھے راولپنڈی پہنچیں اور ایوب خان کے ایوان صدر کو آگ لگا دیں جس نے پاکستان

کی چھوٹی ثقافتوں کی خاک ہوتی ہوئی شناخت کو بچانے کی بجائے اُلٹا راکھ کر چھوڑا تھا۔

مگر جب وہ صبح شام اپنی دکان کے سامنے بیٹھے مریضوں کی قطاروں کو دیکھتا تو سبھی جلسے جلوس، غصہ کھولاؤ اور نفرتوں کو بھلا کر اُن کے دُکھ درد اور تکالیف کی خبر گیری کے لیے دوا دارو میں مصروف ہو جاتا۔ اُسے لگتا کہ سیاست صرف خلقِ خدا پر عذاب نازل کرنے اور اُن کے حقوق کی تلفی کے لیے کی جاتی ہے، لوگوں کی شناخت مسخ و برباد کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ وہ خود بھی تو سیاست کا شکار تھا۔ بلکہ پوری ریاست بہاول پور ہی پاکستانی حکمران اشرافیہ کی سیاست کا شکار ہو چکی تھی۔ فیاض کو اِن مریضوں کی شکل میں اپنی اور اَپنی ریاست کی غصب شدہ شناخت کے آثار دکھائی دیتے۔ اُن کی نبض پر ہاتھ رکھنے سے اُسے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے اُس نے سوکھے ہوئے دریائے ستلج کی مَن پر ہاتھ رکھ دیا ہو کہ جس کا سودا ایوب خان نے صرف اپنے اطراف میں سازشیں کرتی ہوئی بیوروکریسی کو راضی اور خوش رکھنے کے لیے انڈیا سے کر لیا تھا۔ اِن مسکین لوگوں کی نبضوں میں اُسے گھاگھرا اور ستلج بہتے ہوئے محسوس ہوتے۔ وہ اِن کو چھوڑ کر اب کہیں اور نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ اِن کے پاس، اِن کے درمیان رہنا چاہتا تھا۔ اُس کی جان پہچان کا نئے سِرے سے پھلا پھولا ہوا پودا چھتنار ہونے کی جانب رواں ہو چکا تھا۔ فیاض اب اِس کی چھاؤں تلے زندگی گزار کر اِس کی جڑوں میں دفن ہونے کا خواہش مند تھا تاکہ اُس کے بدن کی مِٹی کبھی نہ چرائی جا سکنے والی شناخت بن کر ایسے روپ میں دھرتی سے رنگ نکالے جسے کوئی ون یونٹ نہ تو مِٹا سکے اور نہ ہی گم کر سکے۔

سابقہ ریاست بہاول پور میں فیاض جیسے قوم پرستوں کی عملی سیاست سے دامن چھڑائی کے باوجود جہاں 1967ء کا ایک برس ایوب خان کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھی ہوئی عوام دشمن بیوروکریسی کے حکومتی جبر کے پہرے میں گزرا وہاں 1968ء کی شروعات ہی مشرقی پاکستان میں بے چینی کی آگ کے بھڑکنے سے ہوئی۔ عوامی لیگ کے شیخ مجیب الرحمٰن اور چونتیس دیگر سیاسی رہنماؤں کے خلاف وطن سے غداری کے مقدمے ''اگرتلہ سازش کیس'' نے بنگالیوں کو یقین دِلا

دیا کہ جو بھی وَن یونٹ کے استحصالی عذاب کی مخالفت کرے گا اُسے عبرت کا نشان بنا دیا جائے گا۔ اگرتلہ سازش کیس کی سماعت نے مشرقی پاکستان سمیت مغربی پاکستان کی اُن سبھی لسانی ثقافتوں کو ڈرانے کی بجائے اپنا طریقہ کار بدلنے پر مجبور کر دیا جن کے وجود کی وَن یونٹ کے نام پر نفی کی جا رہی تھی۔ قوم پرستوں نے سامنے آئے بغیر وَن یونٹ اور مغربی پاکستان کی حکمران بیورو کریسی کے خلاف اپنی جدوجہد کو نئے سِرے سے منظّم کرنا شروع کر دیا۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی پاکستان کے کچلے ہوئے طبقے شیخ مجیب کے خلاف ایوب خان کی حکومت کے اِس مقدمے کو اپنے خلاف فردِ جرم سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔ اِس دوران فیاض کے کئی دوستوں نے اُسے تلاش کر کے رابطے بھی کیے کہ کسی نئی تحریک کی کوئی تنظیم سازی کی جائے مگر اُس نے صاف جواب دے دیا۔

''اب جی نہیں چاہتا کچھ کرنے کو..... اور اگر کرنا چاہیں بھی تو چند دل شکستہ اور عذاب یافتہ کر بھی کیا لیں گے۔ پھر کوئی غداری کا اور مقدمہ۔ اگرتلہ کی بجائے بہاول پور سازش کیس۔ ہمارا تو وکیل بھی کسی نے نہیں بننا۔ جن کا مقدمہ ہم نے لڑنا ہے، اُنھوں نے بھی ہمارے ساتھ کھڑے نہیں ہونا۔ ہمارا مقدر تو اندھیرے راستے اور گمنام قبرستان کی بے نشان قبریں۔''

فیاض کے دوست تو ناکام لوٹ گئے مگر ایک روز کچھ ایسا ہو گیا کہ جس نے اُسے بارِ دگر کسی اور انداز میں سوچنے کی راہ پر لگا دیا۔ اُس روز بھی کئی دنوں کی طرح احمد پور کے مرکزی چوک میں صادق عباس ہائی اسکول کے لڑکوں اور اُن کے ساتھ وکلاء نے صدر ایوب خان کے خلاف جلوس نکالا ہوا تھا۔ جلوس کی نعرہ بازی روکنے اور اِسے منتشر کرنے کے لیے پولیس نے ہائی اسکول کے لڑکوں پر اندھا دھند اور وحشیانہ لاٹھی چارج کیا۔ بانس کی لاٹھی کے ایک سِرے پر جڑی ہوئی لوہے کی موٹی ٹوپی کا وار جس پر اور جس جگہ ہوا، مقامِ ضرب کو تہس نہس کرتا ہوا گزر گیا۔ اسکول کے کئی لڑکے اور وہاں سے گزرنے والے راہگیر بھی سَر پھٹول کے بعد تحصیل ہسپتال پہنچے تو وہاں سے بھی اُنھیں دِھک دَھکا کر نکال باہر کیا گیا۔ اِن مضروبین میں سے ایک مضروب فیاض بھی تھا۔ اُس کا سَر تو پھٹنے سے بچ گیا مگر بائیں کلائی پر لاٹھی کے وار نے ہڈی کو کڑکا کر دو ٹکڑے کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد کلائی کی ہڈی تو جُڑ گئی مگر فیاض کا کرچی کرچی ہوا دل کہیں سے بھی نہ جُڑ سکا۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے اپنے بعد کی نسل کو ریاستی جبر اور تشدد کا شکار ہوتے دیکھا ہوا تھا اور وہ بھی کسی بغاوت یا احتجاج کا حصہ بنے بغیر۔ کیا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا نسل در نسل۔ کیا کبھی اِس کا بھی اَنت ہو گا۔ فیاض کو اِن سوالوں کے جواب میں سکوت اور مایوسی ملی تو اُس نے اُن سبھی دوستوں کو تلاشنا شروع کر دیا کہ جو اُسے نئی تنظیم سازی کا حصہ بنانے کے لیے آتے رہے تھے۔ اِس دوران مشرقی پاکستان میں حالات اتنے خراب ہو گئے کہ ایوب خان کی حکومت نے گھٹنے ٹیکتے ہوئے بائیس فروری 1969ء کو نہ صرف اگرتلہ سازش کیس واپس لے لیا بلکہ شیخ مجیب کو بھی دیگر چونتیس ملزمان سمیت بری کرتے ہوئے ایک طرح سے موقع دیا گیا کہ وہ قید سے نکلنے کے بعد سیدھا ریس کورس میدان پہنچے اور پوری گھن گرج کے ساتھ بنگالی قوم پرستی کی لُکی چُھپی تحریک کو جگ جہان کے سامنے چِٹا ننگا کر دکھائے۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے معاملے میں حکومت کا پچھواڑا لگنے کے بعد بلوچستان، سندھ، بہاولپور اور صوبہ سرحد کے قوم پرستوں کی سوئی ہوئی اینٹی وَن یونٹ تحریک کو بھی نئی زندگی مل گئی۔ فیاض نے ناں صرف احمد پور بلکہ بہاول پور میں ہونے والی میٹنگز میں شمولیت کو لازمی بنا لیا۔ ایک مدت کے بعد جہاں کئی دوسرے قوم پرست دوستوں سے مُلاقاتیں معمول بنیں وہاں وکیل ریاض ہاشمی کے ساتھ بھی دوبارہ سلام دعا شروع ہو گئی۔ اب فیاض ایک پرجوش اور اڑیل نوجوان کی بجائے پکّی عمر کی جانب گامزن سیانا سمجھدار اور معاشی طور پر مطمئن شخص تھا جسے وسیب کے چار لوگ جاننے بھی لگے تھے۔ اِسی لیے اُس کی بات پر توجہ دی جاتی اور خیالات کے اظہار کا پورا موقع ملتا۔

ایوب خان کے خلاف نئے سرے سے بیدار ہونے والی تحریک اگرچہ بنیادی طور پر اینٹی وَن یونٹ تحریک ہی تھی مگر اب تو اِس نے کئی کئی بھیس بدل کر کتنے ہی رنگوں کے لباس اپنے اوپر چڑھا لیے تھے جن میں ذوالفقار علی بھٹو کی اعلانِ تاشقند کے خلاف جدوجہد اور روزمرہ کے سامان خورد و نوش کی اشیاء کی مہنگائی کے بارے میں پُرتشدد احتجاجی جلسے اور جلوس نمایاں ترین تھے

جنہوں نے پورے مُلک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اِن تمام معاملات نے مل کر ایوب خان کی لڑکھڑاتی ہوئی حکومت کو اتنا ہراساں کیا کہ صدر صاحب نے کچھ دن اور کرسی سے چمٹے رہنے کی بجائے حکومت سے دامن چھڑانے میں ہی عافیت سمجھی اور مستعفی ہو کر گھر چلا گیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اسپیکر قومی اسمبلی حکومت سنبھالتا مگر بری فوج کے کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خان نے کُرسی سنبھال لی اور مُلک ایک بار پھر مارشل لاء کے بوٹوں تلے آ گیا۔

مارشل لاء لگا تو فیاض کئی دن تک پھر سے احمد پور کی غلہ منڈی میں پٹھان چوکیدار کے چوبارے میں چھپا رہا۔ پٹھان نے خیر خیریت جاننے کی بہت کوشش کی کہ وہ اچھی بھلی دکان کو تالا لگا کر اُس چھوٹے سے چوبارے میں کیوں گھسڑا ہوا ہے مگر فیاض اُسے ٹالتا رہا کہ کسی اَن دیکھے دُشمن سے واسطہ پڑ گیا ہے، اب کرے بھی تو کیا کرے۔ پولیس اُس کے سمیت سبھی اینٹی وَن یونٹ قوم پرستوں کے ٹھکانوں پر چھاپے مارتی پھر رہی تھی۔ اِدھر اِن سب کا یہی فیصلہ کہ اِس بار گرفت میں نہیں آنا، انڈر گراؤنڈ رہنا ہے اور تحریک کو مرنے نہیں دینا۔

اِس نئی تحریک میں فیاض کی حکمت کی دکان کا بالکل ہی بھٹہ بیٹھ گیا۔ نہ تو آمدنی کا سلسلہ رہا اور نہ ہی پریشان حال مریضوں کی دلجوئی کی کوئی تدبیر۔ اُس کا گزارہ اُسی جمع پونجی پر آن رہا جو گذشتہ کئی مہینوں کی آمدنی سے جوڑی گئی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ بالکل ہی زچ ہو جاتا کہ یہ کن چکروں میں پڑ گیا ہے۔ اچھی بھلی عزت بنی ہوئی تھی جسے رول کر وہ پھر سے مفرور ہوا پھرتا ہے۔ اُس نے کئی بار سوچا کہ گرفتاری دے کر آئے اور روز کے اِس خوف اور سراسیمگی کی کیفیت سے جان چھڑا لے۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا، سال چھ ماہ کی کی سزا ہو جائے گی، کوئی قتل تو نہیں کیا کہ جیل میں کوٹھی لگنا پڑے گا۔ مگر پھر یہی خیال آتا کہ انسانی زندگی میں کُلی طور پر ذات کی اہمیت نہیں ہوتی، کبھی کبھی اُس دھرتی کا مان بھی رکھنا ہوتا ہے کہ جس کی مٹی کی خوشبو دھرتی واس کی روح کی خوشبو بن چکی ہوتی ہے۔ اپنے لیے تو ہر کوئی جیتا ہے مگر دھرتی کے لیے صرف دھرتی زاد ہی جان کی بازی لگاتا ہے۔ یہی سوچ کٹھن وقت میں اُسے حوصلہ دیتی اور وہ ایک بار پھر اپنی شناخت کو اپنی

ریاست کی گم گشتہ شاخت میں نئے سرے سے تلاشنا شروع کر دیتا۔

ہر آنے والے دن کے ساتھ جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء کا تنتنا اور ہیبت کم سے کم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ایک جانب مغربی پاکستان میں مذہبی جماعتوں کا دوستانے سے بڑھ کر خوشامدانہ گھیرا اور دوسری طرف مشرقی پاکستان سے عوامی لیگ کے شیخ مجیب الرحمٰن کا کھڑکا دڑکا، اِن دونوں معاملات کے تنگ ہوتے ہوئے گھیرے میں آئے ہوئے پاکستان کے نئے حاکم کو کہیں کوئی چھپنے کی جگہ اگر ملتی تو سرور انگیز مہکتی ہوئی شبینہ محفلوں میں جو اِس طرح بتدریج دراز ہوئیں کہ رات اور دن کا امتیاز باقی نہ رہا۔ اِس صورت حال نے جہاں حکومتی گرفت کو کمزور کیا وہاں فیاض بھی پانچ چھ مہینے کی آنکھ مچولی کے بعد پھر سے حکمت کی دکان کھول بیٹھا۔ یہ وہ دور تھا کہ جس میں کم وبیش پورے پاکستان کے قوم پرستوں کو اپنی جدوجہد کے لیے کُھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ قوم پرستی کے اِس نئے منظرنامے میں اگر کہیں سے کسی خطرے کی کوئی دھمک آ رہی تھی تو وہ صرف ذوالفقار علی بھٹو سے کہ جس کی پیپلز پارٹی بہت تیزی سے سندھ اور پنجاب کے علاقوں میں جگہ بنا رہی تھی۔

یحییٰ خان کی حکومت کا پہلا برس ختم ہونے کو آیا تو مارچ 1970ء کے قریب وَن یونٹ ٹوٹنے کی بات چل نکلی۔ لیگل فریم ورک آرڈر کی رُو سے ایوب خان کے بنیادی جمہوریت کے نظام کو ختم کر کے ایک آدمی ایک ووٹ کے اصول موجب تین سو ممبروں کی قومی اسمبلی بنانے کا قدم اُٹھانا تھا کہ جس میں آبادی کے مطابق 160 نشستیں مشرقی پاکستان اور 138 مغربی پاکستان کے علاقوں کو دی جانی تھیں۔ باعث طمانیت یہ تھا کہ مغربی پاکستان کو تحلیل کرنے کے قانون کے تحت وَن یونٹ توڑ کر مغربی پاکستان کے کئی صوبے بنائے جانے مقصود تھے۔ یحییٰ خان کے اِس منصوبے نے فیاض سمیت ریاست بہاول پور کے سبھی قوم پرستوں کے دِلوں میں گھی کے چراغ روشن کر دیے کیونکہ سابقہ ریاست کی ایک صوبے کی صورت بحالی کی منزل اب اُن کے سامنے کھڑی تھی۔

لیکن جب 30 مارچ 1970ء کو یہ قانون نافذ ہوا تو ریاست بہاول پور کے لوگوں

کے ساتھ ایک بار پھر ہاتھ ہو گیا۔ وَن یونٹ ٹوٹا ضرور لیکن جہاں نیا صوبہ بلوچستان بنا وہاں بہاول پور کی وعدہ شدہ صوبائی حیثیت بحال کرنے کی بجائے اِسے صوبہ پنجاب میں ضم کر دیا گیا۔ سابقہ ریاست بہاول پور میں اِس کا ردِ عمل ایک بہت بڑے صدمے کے طور پر ہوا اور عام لوگائی نے اِسے دکھ اور مونجھ کی چادر بنا کر سَر پر تان لیا۔ فیاض جیسے قوم پرستوں کے لیے بھی وَن یونٹ کا اِس طرح ٹوٹنا، وَن یونٹ بننے سے کہیں زیادہ تکلیف دہ تھا۔ وَن یونٹ بننے کے بعد اُس کے ٹوٹنے کی کوشش میں اگرچہ ریاستیوں کی ایک نسل دنیا سے گزر گئی مگر ایک آس تو تھی کہ یہ طوق کبھی تو ٹوٹ کے رہے گا مگر ہمہ وقت شراب کے نشے میں مدہوش حاکم سے ایسا کاری وار کرالیا گیا کہ جس کے بعد وہ آس بھی ختم ہو کر رہ گئی۔ اُمید کے تنے کی جڑیں خشک کیا ہوئیں اِس کا بیج بھی گُرٹ ہو کر رہ گیا۔

وَن یونٹ ٹوٹنے سے پہلے سندھی، بلوچ، براہوی، بنگالی اور پشتون بھی بہاول پور کے ریاستیوں کے ساتھ اپنا دُکھ سانجھا سمجھتے ہوئے جُڑ کر کھڑے تھے مگر اب پاکستان کی پوری وحدت میں اُن کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ رہا تھا۔ اِن کو اَپنی شناخت کی لڑائی اب اکیلے ہی لڑنی تھی مگر اِن کے دونوں ہاتھ خالی، دِل شکستہ اور آنکھوں کے سامنے آسمان تک بلند گرد ہی گرد جس میں نہ تو کسی منزل کی نشاندہی اور نہ ہی کسی راستے کی لکیر۔

(33)

وَن یونٹ ٹوٹنے کے بعد ریاست کے قوم پرستوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اگر کوئی تھا تو صرف قیادت کا تھا۔ نواب صادق محمد خان کے بعد اگرچہ ولی عہد محمد عباس عباسی نے امیر آف بہاول پور کا لقب اختیار کرتے ہوئے علامتی نوابی سنبھال لی تھی مگر سرکاری طور پر اُن کی حیثیت ایک وظیفہ خوار سے زیادہ نہیں تھی۔ اِس پر بھی سوا یہ کہ عوامی سطح پر نہ تو کسی سے اُن کا کوئی میل ملاپ اور نہ ہی کوئی سنگ سنجوک۔ بے اعتمادی کی وسیع تر ہوتی ہوئی خلیج ایک جانب اور دوسری طرف نامعلوم خوف کا شکار یہ علامتی قیادت اپنی سابقہ رعیت کو کوئی روشن راہ دکھانے سے بھی قاصر لیکن اِس کے باوجود فیاض کی نسل کے لوگ ابھی تک نواب صاحب کو اپنا حاکم سمجھتے اور صادق گڑھ پیلس کا دَر کُھلنے کے منتظر رہتے تھے۔

اِس صورت حال میں ریاستی عوام تین حصوں میں بٹ گئے۔ ایک طرف پڑھے لکھے لوگ جو جلسے جلوسوں کی بجائے قانونی جدوجہد پر یقین رکھتے تھے اور دوسری جانب وہ جو ہر صورت نوابوں کی قیادت میں جلسے جلوس اور احتجاجی تحریک کے ذریعے بہاول پور کی صوبائی حیثیت بحال کرانا چاہتے تھے اور تیسری جانب اِن دونوں سے الگ ایک چھوٹی سی اقلیت جسے کسی بھی معاملے

سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُن کے تئیں بہاول پور جائے بھاڑ میں مگر اُن کا دال پھلکا چلتا رہنا چاہیے۔ پہلی قسم کے لوگوں میں وکیل ریاض ہاشمی جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ قوم پرست شامل تھے جب کہ دوسری تقسیم میں وہ جنھوں نے امیر آف بہاول پور محمد عباس عباسی سے اختلاف رکھنے والے اُس کے سوتیلے بھائی شہزادہ مامون عباسی کو اپنا رہنما بنالیا تھا۔ اِن دونوں طبقات کی پشت پر غیر محسوس طریقے سے ''بہاول پور متحدہ محاذ'' تھا کہ جس میں چوہدری فرزند علی، سیٹھ عبید الرحمٰن، سردار محمد خان اور میاں نظام الدین حیدر جیسے نئے پرانے سبھی ریاستی شرفاء شامل تھے۔ شہزادہ مامون الرشید عباسی کی لیڈرشپ جہاں جوش سے عبارت تھی وہاں ہوش کی کُنجی بہاول پور متحدہ محاذ کے پاس تھی۔

ریاستیوں کا یہ اکٹھ اتنی بڑی پر جوش تحریک بن کر سامنے آیا کہ ایک بار تو پوری حکومتی مشینری ہل کر رہ گئی۔ روزانہ کے جلوس، جلسے اور اخباری بیانات نے ماحول کو اِس طرح گرمایا کہ یوں لگتا تھا صوبہ بہاول پور کل کی بجائے آج ہی بن کے رہے گا۔ فیاض کی حکمت کی دکان کو ایک بار پھر تالہ لگ گیا اور وہ اپنا سب کچھ بیچ باچ کر بہاول پور منتقل ہو گیا۔ اب چوک فوارے کے نزدیک احمد پوری دروازے کے اندر ایک چھوٹا سا چوبارہ اُس کا نیا مسکن تھا جب کہ حکمت کے لیے جگہ تو اب صوبہ بننے کے بعد تلاش کرنا تھی۔ فیاض کی صبح اگر ماڈل ٹاؤن اے میں میاں نظام دین حیدر کی کوٹھی پر ہوتی تو دوپہر ریاض ہاشمی وکیل کے دفتر میں۔ دن ڈھلتا اگر شہزادہ سئیں کے ہاں تو عشاء سیٹھ عبید الرحمٰن کی کوٹھی کے احاطے میں۔ اِس دوران جہاں جلسہ وہاں فیاض موجود اور جہاں جلوس وہاں فیاض سب سے آگے۔

ایک انوکھا سُرور تھا، عجیب سا نشہ تھا کہ جس نے اُس کے وجود کو گراں بار کرنے کی بجائے ہلکا پُھلکا بنا دیا تھا۔ فیاض اب اپنے پاؤں پر نہیں چلتا تھا بلکہ ہوا میں اُڑتا تھا۔ ہر طرف صوبہ بہاول پور کی گفتگو، بحث مباحثے، پوسٹر، اشتہار اور وال چاکنگ۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے خلقت منزل کی جانب نہیں بلکہ منزل چل کر خلقت کی اُور آ رہی ہو۔ آئے روز کے تھرتھلی مچا دینے والے اخباری ایڈیشن، ہاکروں کی آوازیں اور چائے والے کھوکھا نما اسٹالوں پر چُسکیاں لیتے

ہوئے لوگوں کے بلند آواز میں بحث مباحثوں نے بازار، بیوپار اور سماجی میل ملاپ سمیت ہر شے کو پچھواں کر رکھا تھا۔

بہاول پور متحدہ محاذ کی قیادت نے تحریکی معاملات کو بھرپور طریقے سے چلانے کے لیے جہاں دیگر ورکروں کے ذمے کئی اور کام لگائے وہاں فیاض کے ذمے شہر کی دیواروں پر صوبہ بحالی کے نعروں کا لکھنا تھا۔ کام چونکہ نازک تھا اور تھوڑی سی بے احتیاتی کے سبب اب تک تین ورکر گرفتار ہو چکے تھے، اِس لیے فیاض آدھی رات کے بعد مُولھ مار کر محاذ کے دفتر میں سے نکلتا اور جب تلک بس چلتا، تحریک بحالی صوبہ کے نعرے لکھ لکھ کر فجر کی اذان سے پہلے اپنے چوبارے میں واپس پہنچ جاتا۔

گندم کی کٹائی اور گہائی کے اِس موسم میں بھی فیاض اُس شب کو شیر باغ کے عقب میں واقع پُرانی کوٹھی کی دیواروں پر نہایت عجلت میں نعرے لکھنے میں مصروف تھا کہ اُسی آن میں پہلے گرج چمک نے آسمان کو کسی آتش باز کے فن کا مظاہرہ بنا دیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ فیاض نے کوشش کی کہ کسی طور اُوٹ میں ہو جائے مگر دور دور تک کہیں سَر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ پھر بھی جس طرف کچھ ایسا سُجھائی دیتا وہ اُسی جانب دوڑ لگا دیتا۔ فیاض کے اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے میں ایک اُوپل کار اُس کے قریب آ کر رُکی۔ ایکدم اُس کا پچھلا دروزہ کُھلا اور کسی نے بارش میں شرابور ہو چکے فیاض کو گھسیٹ کر کار میں ڈال لیا۔ اِس سے پہلے کہ فیاض کچھ سمجھ پاتا، کار اچھی بھلی سپیڈ پکڑ چکی تھی۔

فیاض آنکھوں پر ہاتھ ہونے کے سبب یہی جان پایا کہ آج اُسے بھی پولیس نے پکڑ لیا مگر اب تک نہ تو اِس کا کوئی ثبوت مل رہا تھا اور نہ ہی شک کرنے کی کوئی دوسری معقول وجہ۔ مگر جب کار رُکی اور اُسے باہر نکالا گیا تو سب سمجھ آ گئی کہ اُسے کس نے سڑک سے اُٹھایا تھا۔ کار بیگم سلمیٰ بدرالدین کی کوٹھی کے پورچ میں تھی اور اُس کے سامنے رسول بخش میرانی کار کی ڈرائیونگ سیٹ سے اُتر کر کھڑا مسکرا رہا تھا جب کہ اُسے گھسیٹ کر گاڑی میں پھینکنے والا تگڑا نوجوان اُس کی یاداشت

میں کہیں موجود نہیں تھا۔ شاید کوئی نیا ملازم تھا۔

''فیاض صاحب! نہ دعا نہ سلام اور نہ ہی کوئی حال احوال..... اور اپنا یہ حال کیا کر رکھا ہے، ہاتھ کالے اور منہ بھی کالا، کپڑے میل کچیلے۔ بی بی صاحب کے سامنے پیش ہونا ہے، جاؤ اُدھر مہمان خانے، نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤ، میں کپڑوں کا جوڑا بھیجتا ہوں''..... میرانی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے کمرے کی جانب گیا مگر فیاض کے لیے اِس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ پھر سے مہمان خانے کی طرف قدم بڑھا لے۔ کیونکہ وہ تگڑا نوجوان کسی فولادی دیوار کی مانند اُس کے دوڑ بھاگنے کے راستے میں حائل اور سبھی امکانی گزرگاہیں روکے کھڑا تھا۔

(34)

فیاض کو جب سلمٰی بی بی کا بلاوا آیا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ بارش بدستور اتنی شدت سے ہو رہی تھی کہ جیسے آج ناں ہوئی تو کبھی ناں ہوئی۔ بی بی کا ملازم اُسے اُسی ڈرائنگ روم میں چھوڑ گیا کہ جہاں بی بی اُس سے ملا کرتی تھی مگر آج یہ کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تو وہیں رُکا رہا مگر جیسے ہی بیٹھنے کا سوچا سلمٰی بی بی کی ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی اور اُسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ فیاض کسی بھیڑ کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ دو طویل راہداریوں میں سے گزر کر ملازمہ ایک کمرے کے دَروازے پر پہنچی اور اُسے آہستہ سے تھپتھپایا۔ اندر سے آنے والی آواز یقیناً سلمٰی بی بی کی تھی مگر اِس کا مطلب وہی ملازمہ سمجھ سکتی تھی۔ اُس نے پیچھے مُڑ کر فیاض کو دیکھا اور آنکھ کے اشارے سے اُسے اندر جانے کا کہتے ہوئے واپس اُدھر چلی گئی کہ جہاں سے آئی تھی۔

فیاض کچھ جھجکا، پریشان ہوا اور اِسی کیفیت میں وہیں ساکت ہو گیا۔ ملازمہ نے جاتے جاتے گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا تو فیاض کو وہیں جھجکا ہوا دیکھ کر سختی سے اندر جانے کا اشارہ کیا اور پھر راہداری کا موڑ مڑ گئی۔ فیاض نے بھی دروازے پر تھوڑا سا دباؤ ڈالا تو وہ اپنے آپ ہی کھلتا چلا گیا۔ فیاض کا اگلا قدم اُسے سلمٰی بی بی کے بیڈ روم میں لے آیا تھا۔ وہ ایک بار پھر جھجکا

کہ اُس کے پاؤں کسی دبیز اور بھاری قالین میں اِس قدر دھنس کر رہ گئے تھے کہ اُٹھائے نہیں اُٹھ رہے تھے۔

''آؤ...... آجاؤ فیاض، آگے آجاؤ..... میں چار برس بعد اب بھی تم پر اعتماد کر رہی ہوں۔'' کمرے میں زیادہ اندھیرے اور کم روشنی کے باوجود فیاض نے دیکھ لیا تھا کہ سلمیٰ بی بی پلنگ کی بجائے آرام کُرسی پر نیم دراز تھی۔ فیاض تھوڑا سا آگے بڑھا مگر پھر رُک گیا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ سلمیٰ بی بی نے پورا لباس پہننے کی بجائے کسی بہت ہی باریک سیاہ رنگ کے کپڑے کا کوئی ڈِھیلا ڈھالا اور پنڈلیوں سے بھی اونچا فراک سا پہنا ہوا تھا۔ فیاض نے آنکھیں جھکا لیں۔ سلمیٰ بیگم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کبھی نہیں دیکھا عورت کو''۔ سلمیٰ بظاہر اُس کے شرمانے کا حظ اُٹھاتے ہوئے آرام کُرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور فیاض کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ فیاض کی آنکھیں کچھ اور بھی جھک گئیں۔ اُس کے ہاتھوں کو برف جیسا محسوس کرتے ہوئے سلمیٰ نے اپنے ہاتھوں کی گرفت اور بھی سخت کر لی اور یوں اُسے ہولے ہولے سے آرام کُرسی کے قریب لے آئی اور نرمی نرمی سے دھکیل کر کُرسی پر ویسے ہی لٹا دیا کہ جیسے چند ساعتیں پہلے وہ خود لیٹی ہوئی تھی۔ فیاض اُٹھنے کے لیے اوپر کو ہو کر کسمسایا مگر سلمیٰ کُرسی کی ہتھی پر چڑھ بیٹھی اور اپنے دونوں ہاتھ فیاض کے سینے پر اِس طرح رکھ دیے کہ وہ اُٹھنا تو کیا، کسمسا بھی نہ سکے۔

''اُوں ہونہہ..... یہاں سے اُٹھنا بہت مشکل بلکہ ناممکن۔ یاد ہے میں نے تجھ سے کہا تھا کہ نہ تو کسی کو دھوکہ دیتی ہوں اور نہ ہی دینے دیتی ہوں۔ مگر تم پھر بھی میرے ساتھ چترائی کر کے بھاگ گئے۔ بھاگنا ہی تھا تو کہیں دور بھاگتے۔ یہ احمد پور تک بس تیس میل کا دوڑنا کیا دوڑنا ہوا''۔

ہسٹیریائی انداز میں اپنے آپ بے تحاشا ہنستی ہوئی بیگم سلمیٰ بدرالدین اچانک ہی ساکت ہو کر رہ گئی۔ اُس کے چہرے کی مَلہار ایک لمحے میں اس طرح کی ہو گئی جیسے فیاض، انسان نہیں بلکہ بد بو کے بھبکے چھوڑتی کچرے کی کوئی ڈھیری ہے۔ ''تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔ ہائیں!!! کبھی دیکھا

بھی ہے خود کو آئینے میں۔ نجانے کیوں تم مجھے جیل میں پڑے ہوئے پسند آ گئے تھے۔ شاید بہت ہی مظلوم لگ بھی تھی تمہاری اور میں تم پر اعتماد کر بیٹھی۔ مگر اب تو تم میری ضد ہو، وہ ضد جس سے نفرت کی جاتی ہے، جس کے ساتھ دھوکہ کیا جاتا ہے''۔ سلمیٰ کی آنکھیں خفیف سے آنسوؤں سے بھر آئیں۔

''انتہا کا غصہ ہے مجھے تم پر، انتہائی غصہ......جی چاہتا ہے کہ توڑ پھوڑ کر رکھ دوں تمہیں، بوٹی بوٹی کر دو تمہاری، مسل کر رکھ دوں، لُپری بنا دوں تمہاری۔ مگر میں ویسے نہیں کروں گی کہ جیسے تم میرے ساتھ کر کے گئے تھے۔ ایک مہربان عورت کو ٹھوکر مار کر گزر جانا کہاں کی انسانیت ہے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ کتنی ذلت کتنی بے عزتی برداشت کی ہو گی میں نے۔ اپنے آپ سے آنکھ ملانا بھی ممکن نہ رہا''۔ سلمیٰ بیٹھنے کی بجائے اُٹھ کھڑی ہوئی اور پھر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ فیاض بھی کُرسی سے تھوڑا سا اوپر کو اُٹھ کر دم سادھے بیٹھ گیا۔

''تم کیا جانو ایک امیر کبیر اور سوسائٹی میں بلند سیاسی نام رکھنے والی بیوہ عورت پر کیا گزرتی ہے خاص طور پر جب اُس کے سَر پر والدین جیسی چھت بھی نہ ہو۔ کتنے کُتے اُس کے آگے پیچھے پھرتے ہیں اُس کا مال اسباب اور سیاسی شناخت لوٹنے کے لیے۔ کیا خیال ہے تمہارا، کوئی نہیں پھِرتا ہو گا میرے آگے پیچھے، دانہ ڈالنے کے لیے یا دُم ہلانے کے لیے، کیا کمی ہے مجھ میں، کیا نہیں ہے میرے پاس کہ جس پر کوئی بھی عورت، عورت ہونے کا مان کر سکتی ہو۔ میرے جیسی عورتیں اپنی سیاسی اور خاندانی شناخت بچانے کے لیے ہمیشہ کُند چھری سے ذبح ہوتی رہتی ہیں اور اِس کے بدلے میں اَپنی ایک چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتیں۔ وہ بھی جسم رکھتی ہیں، جسم کے تقاضوں کا ادراک بھی رکھتی ہیں۔ مگر وہ کسی ایسے مرد کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتیں کہ جس پر شک کا شائبہ تک بھی کیا جا سکتا ہو۔ اپنے آپ کو ہر سانس کے ساتھ قتل کرنے کے لیے اُنہیں تمہارے جیسے پلوں کی ضرورت رہتی ہے کہ جو ساتھ بھی لیٹے ہوئے ہوں تو کوئی ایسا ویسا شک نہ کر سکے''۔

سلمیٰ کی گفتگو سنتے ہوئے بھی فیاض اِسے سمجھنے سے قاصر دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ پتہ

نہیں چل رہا تھا کہ وہ کرنا کیا چاہتی ہے، کہنا کیا چاہتی ہے۔ وہ پھر سے اُس آرام کُرسی کی ہتھی پر چڑھ بیٹھی کہ جس پر ابھی تک فیاض نیم دراز تھا مگر حیرت، انجانے خوف اور انہونی کے امکانات تلے دم سادھے۔ کُرسی کے بائیں جانب اندھیرے میں تپائی پر ایک شراب کی بوتل اور آدھ پیا ہوا گلاس بھی دھرا تھا۔ سلمیٰ نے بیٹھے بیٹھے گلاس اُٹھایا اور ایک ہی سانس میں اُسے خالی کرنے کے بعد سَر کو زور سے چھنڈکا دیا۔ فیاض نے شراب کی بو محسوس کی تو نفرت سے ناک سکیڑ لی۔ کسی عورت کو تو کیا آج تک اُس نے کسی مرد کو بھی شراب پیتے نہیں دیکھا تھا۔ سلمیٰ کو یوں لگا کہ جیسے وہ اُس کا مذاق اُڑا رہا ہے۔ اُس نے بوتل کا ڈھکنا کھول کر آدھا گلاس شراب کا بھرا اور ایک گھونٹ لینے کے بعد باقی کی شراب ایک ہتک آمیز نفرت سے فیاض کے چہرے پر پھینک دی۔ فیاض کو اِس حرکت کی قطعی توقع نہیں تھی۔ شراب اُس کی آنکھوں میں گئی تو وہ مرچوں سے بھر گئیں جب کہ باقی کی اُس کے چہرے سے بہتی ہوئی گردن اور اوپری دھڑ کو شرابور کر گئی۔ فیاض نے پورے بدن کا زور لگا کر کرسی سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر سلمیٰ دونوں گھٹنے اُس کے پیٹ پر ٹکا کر اوپر چڑھ بیٹھی۔

فیاض کا دِل چاہا کہ وہ اُسے دِھکیل کر ایک طرف پھینکے اور چیخ چیخ کر بتادے کہ وہ چندری اور گھٹیا عورت خود اُس کے لائق نہیں۔ عورت اور مرد کا جسمانی سنجوگ جو اُس کے نزدیک عبادت تھا، اِس طرح ایک بے نام ونشاں گناہ نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ سلمیٰ کو بتادینا چاہتا تھا کہ عورت اور مرد کا ایک دوسرے کو جسمانی تسکین بہم پہنچانا کوئی راستے میں کھڑے ہوئے آوارگان کا خفی کھیل نہی بلکہ ایک دوسرے کو عزت اور احترام دینے کا وسیلہ ہے۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ آپسی شناخت راسخ کرنے کا ذریعہ ہے، شناخت ملیامیٹ کرنے کا حربہ نہیں۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ عورت کا احترام سامنے آگیا تھا۔ وہ اُسے کیسے بتاتا کہ تسکین کے لیے جسموں کا کاروبار نہیں کیا جاتا بلکہ اِس کے لیے تو دو ہاتھوں کی دو انگلیوں کا لَمس ہی کافی ہوتا ہے۔ وہ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا کہ خالص احساس کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا، دھوکہ دھوکے کو ہی دیا جاتا ہے۔

فیاض زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکا مگر اُس کی آنکھیں یہ سب کچھ اتنی توانائی سے کہہ رہی

تھیں کہ شاید زبان اِس طور نہ کہہ سکتی۔ سلمیٰ کو بھی فیاض کی آنکھوں میں اپنے لیے کراہت، حقارت اور نفرت دکھائی دے رہی تھی۔ اِس احساس نے اُس پر اس قدر جنون طاری کر دیا کہ وہ خود کو اُس کے منہ پر تھوکنے سے بھی باز نہ رکھ سکی۔ اِس سے پہلے کہ فیاض سلمیٰ کی اس حرکت کو سمجھ پاتا، اُس نے گریبان سے پکڑ کر اُسے اُوپر کو اُٹھایا اور ایک ہلکی سی کھیچ کے ساتھ اُس کی قمیض کا دامن کئی ٹکڑوں میں پھاڑ کر گھسیٹتی ہوئی بیڈ روم میں سے نکال کر ڈرائنگ روم کے باہر دھکیل آئی۔ فیاض باہر پورچ میں کھڑا حیران، پریشان اور ہکا بکا جب کہ سلمیٰ نے دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔

(35)

سلمیٰ بدرالدین کی کوٹھی سے جیسے تیسے باہر نکلنے کے بعد فیاض جب اپنے چوبارے پر پہنچا تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ بارش تھمتے ہی احمد پوری دروازے کی حلوہ پوری کی دوکانیں کُھلنے لگ گئی تھیں۔ چنے چھولے کی ریڑھیاں، دال مُنگ کے تھال اور آلو بھی کے چھابڑے بھی لگنا شروع ہو گئے۔ شناسا دوکانداروں سے آنکھ بچا کر ریلوے اسٹیشن سے پیدل آتا ہوا فیاض تیزی سے چوبارے کی سیڑھیاں چڑھ کر کمرے میں آیا اور بستر پر گرتے ہی ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ اُسے اپنے آپ سے کراہت ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اُس کی روح تک سلمیٰ کے لعاب دہن میں لتھڑ چکی ہو۔ ایک عورت کو احترام دینے کے قصور میں اُس کا پورا وجود گوڑے کا ڈھیر بنا دیا گیا تھا۔ لیکن اس تذلیل کے باوجود کہیں سے ایک چھوٹی سی لکیر اب بھی اُسے روشنی دکھانے کو تُلی ہوئی تھی۔ فیاض کو اپنے آپ پر مان ہوتا ہوا محسوس ہوا کہ نہ تو وہ اِس غلیظ راند کا حصہ بنا تھا اور نہ ہی کسی عورت کی تذلیل کا موجب ہوا۔

ہچکیاں تھمیں تو اُس کی سوچ سلمیٰ کی سوچ پر غالب ہوتی چلی گئی۔ اِس دوران فیاض کے اندر جاگنے والی تبدیلی نے کیا کرشمہ جگایا کہ اُسے اپنا وجود نہایا دھویا سا لگنے لگا جب کہ سلمیٰ

اُسے ایسی بدبودار اوڑی کی مانند لگنے لگی کہ جس پر خوشبو والی چادریں چڑھا دی گئی ہوں۔ ''کیا عزت اور عصمت صرف عورت کی ہوتی ہے۔ اس تصور کی توسیع مرد تک کیوں نہیں۔'' خیال بدلا، سوچ بدلی تو اُس کے اندر سکون کی ایک لہر سَر سے پاؤں تلک پھیلتی چلی گئی۔ چند لمحوں کے بعد جب اُس کی نیند سے بھری ہوئی آنکھیں اور بھی بھاری ہو کر موندی جانے لگیں تو فیاض سبھی کچھ بھول چکا تھا کہ گزری شب کے دوسرے پہر اُس کے ساتھ ہوا کیا تھا۔

فیاض بیدار ہوا تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔ وہ اُٹھا تو بوکھلا کر تھا مگر اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر سے آنکھیں مسلتے ہوئے بستر پر دَبک کر کے گر گیا۔ اب وہ سویا تو ہوا تھا مگر جاگ رہا تھا۔ اُس کے جاگنے سے بدن کا درد اور تروڑ بھی نئے سرے سے جاگ گیا۔ صبح سویرے محسوس ہونے والا سکون پھر سے کسی اَن دیکھی اور اَن سُونہی چُبھن میں بدلتا جا رہا تھا۔ گزری شب کی کہانی کسی اُلٹی لپیٹ دی گئی فلم کی طرح اُس کے دماغ کے پردے پر انتہائی بلند آواز کے ساتھ چیخ چلا رہی تھی۔ پھر کہیں سے تُھوتُھو کی آوازیں آئیں اور اُس کا پورا چہرہ لیس دار رطوبت سے لِتھڑ گیا۔

فیاض ایک ہی جست میں بستر سے اُٹھ بیٹھا اور جلدی جلدی دونوں ہاتھوں سے چہرے کو صاف کرنے لگا مگر وہ تو پہلے ہی سے خشک اور صاف تھا۔ اپنے آپ سے کراہت کا احساس کسی دورے کی طرح نئے سرے سے اُس کے سَر پر سوار ہو چکا تھا۔ اِس کیفیت سے نکل بھاگنے کے لیے اُس نے اُٹھ کر چوبارے کی وہ کھڑکی بھی کھول دی جو بازار کی طرف کھلتی تھی۔ دن ڈھلنے کے ساتھ ہی لوگوں کی چال میں تیزی آ گئی تھی۔ دفتروں کے ملازمین اپنے اپنے گھروں کی راہ لے چکے تھے اور دن چڑھے بازار میں آنے والی خواتین اپنے ٹوپی والے سادہ برقعوں سمیت واپس گھروں کی تنگنائیوں میں گھس چکی تھیں۔

''یہ عورتیں بھی عجیب ہیں۔ نجانے چاہتی کیا ہیں۔ کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو ٹوپی والے برقعے میں سے اپنا آپ دکھانے کے لیے منیاری والی دُکان پر آ بیٹھتی ہیں۔ صرف ہاتھ پیر دکھا کر باقی کے اندازے مرد ذات کے تصورات پر چھوڑ دیتی ہیں اور اگر کوئی اِن کو دیکھنا چاہے تو چھوٹی

اُنگلی کا ناخن دکھانے کو بھی تیار نہیں ہوتیں۔''

دروازے کی کُنڈی کھڑکی تو اپنی سوچ میں مگن فیاض چونک گیا۔''آج تک تو کوئی اُس کا جاننے والا یہاں نہیں آیا تھا...... یہ کون ہوسکتا ہے۔'' فیاض نے اسی اُدھیڑبُن میں سامنے سے پھٹی ہوئی قمیض اُتار کر ایک طرف پھینکی اور جلدی سے چارپائی پر پڑی ہوئی بنیان پہن کر دروازہ کھول دیا۔ باہر متحدہ محاذ کا ورکر ادریس کھڑا تھا۔ اُسے دیکھ کر فیاض نے دروزے کا دوسرا طاق بھی کھول دیا تاکہ وہ اندر آسکے۔

''میں نے بیٹھنا نہیں۔ بس ایک پیغام ہے قیادت کی طرف سے..... آنے والے جمعے یعنی اپریل کی چوبیس کو فرید گیٹ پر مُک مُکا کا پروگرام ہے''۔ ادریس اندر آئے بغیر وہیں سیڑھیوں میں کھڑے کھڑے ہولے سے بولا۔

''مُک مُکا''.... ؟؟؟.... فیاض نے حیران ہوکر اُس کی طرف دیکھا۔

''بہت بڑا جلسہ..... لاکھوں لوگوں کا۔ متحدہ محاذ کی پوری قیادت اکٹھی ہورہی ہے۔ اُس کے بعد وہاں سے جلوس نکلے گا جو پورے بہاول پور میں پھیل جائے گا کسی سمندر کی طرح۔ پھر دیکھتے ہیں کہ صوبہ کیسے نہیں بنتا۔ تم نے بس اتنا کرنا ہے کہ پورے شہر کی دیواروں پر اِس کا اعلان لکھا ہونا چاہئے۔ تین ورکر اور تمہارے پاس عشاء کے بعد آجائیں گے۔ بس ہمت کرنی ہے اب، صوبہ محض اگلے جمعے کی مار ہے۔ جمعہ 24 اپریل 1970ء۔'' یہ کہہ کر ادریس واپس مڑا اور سیڑھیاں اُتر کر باہر نکل گیا۔ جاتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں کامیابی کی چمک تھی۔ اِس کے برعکس فیاض پہلے تو وہیں کھڑے کھڑے کسی سوچ میں کھوسا گیا پھر نجانے دماغ میں کیا آیا کہ ماتھے پر موٹے موٹے بَل پڑ گئے، شاید کسی اَن دیکھی پریشانی کے سبب۔

(36)

چوبیس اپریل اُنیس سو ستر ۔ پوری ریاست کے دھرتی زادوں نے طے کر لیا تھا کہ بہاول پور متحدہ محاذ کی قیادت میں بہاول پور کے فرید دروازے پر طاقت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے جنرل یحییٰ خان کو بتا دیا جائے کہ یہاں کے لوگوں سے وعدہ خلافی کیا بھاؤ بکتی ہے۔ صادق آباد سے لے کر منڈی گنج میکلوڈ تک کے قافلے دو دنوں سے تسلسل کے ساتھ بہاول پور پہنچنا شروع ہو چکے تھے۔ اگرچہ سابقہ ریاست کے ہر شہر اور بستی کو رُکاوٹیں لگا کر بند کر دیا گیا تھا لیکن پھر بھی بہاول پور شہر کی سڑکوں پر ہر طرف خلقت ہی خلقت موجود تھی۔ بہاول وکٹوریہ ہسپتال کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ پولیس کی بے تحاشہ نفری کے باوجود چوک فوارے کی جانب سے لوگوں کے جتھے فرید گیٹ کی اُور رواں دواں۔ دوسری طرف شیر باغ، تیسری جانب بستی حمائتیاں اور چوتھی طرف کالی پُلی پر بھی وہی حال اور لوگوں کے جتھے ہی جتھے۔

پولیس نے اپنے تئیں اِن سبھی راستوں کو بند کرنے کی کوشش کی مگر کوئی بھی کُلی طور پر بند نہ ہو سکا۔ کالی پُلی اور بستی حمائتیاں والے راستے ڈی سی کے دفتر کے قریب آ کر ملتے تھے کہ جہاں ایس پی اور ڈی آئی جی کے دفتروں کے علاوہ کمشنر کا دفتر بھی راستے میں آتا تھا۔ اِن کی

حفاظت کے لیے اتنی پولیس اکٹھی کی گئی کہ یہ جگہ پولیس لائن بن کر گئی۔ فرید دروازہ خود تین بڑی سڑکوں کے ملاپ کی تکون ہے اور اِن میں سے ہر ایک سڑک کئی سڑکوں کی جُڑت کے بعد یہاں پہنچتی ہے۔ اس طرح یہ تکون ایک بڑا میدان بن کر ہزاروں لوگوں کے ہجوم کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے۔

اُس روز کی دوپہر تک کم از کم ساٹھ ستر ہزار لوگ صرف اس تکون میں سما چکے تھے لیکن خلقِ خدا کی آمد ابھی جاری تھی۔ ایک طرف سے شیر باغ تک اور دوسری جانب سے چوک فوارے تک۔ فرید گیٹ کا اندرون اور بازار کی طوالت متحدہ محاذ کی قیادت کی آمد کے لیے چھوڑ رکھے گئے تھے مگر پھر بھی اِس مقام پر ہزاروں کی تعداد میں ورکر موجود تھے کہ جنہوں نے دروازے سے باہر فوٹو پیلس کے نزدیک بنائے گئے اسٹیج کی حفاظت بھی کرنا تھی۔ فیاض اُس جتھے کا انچارج تھا کہ جس کی ذمہ داری میں اسٹیج کے علاوہ خواتین کے راستے کی نگرانی بھی شامل تھی کہ جہاں سے گزر کر وہ صبح ہی سے اطراف کی دوکانوں کی چھتوں پر چڑھ چکی تھیں۔ چھتیں بھر جانے کے باوجود خواتین کی آمد بھی ابھی تھمی نہیں تھی۔

جلسے کے باقاعدہ آغاز سے پہلے ہی کئی لیڈر صاحبان باری باری اسٹیج پر آتے اور صوبے کے حق میں پر جوش تقاریر کر کے اِدھر اُدھر ہو جاتے۔ اِس دوران ایک بہت بڑا جلوس فرید گیٹ کے اندر والے راستے سے باہر آیا۔ شنید تھی کہ اس کی قیادت کوئی قومی سطح کی معروف خاتون رہنما کر رہی تھیں۔ حاضرین کو پر جوش اور خوشگوار حیرت میں مبتلا رکھنے کے لیے اُن کا نام قصداً صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا۔ خاتون رہنما کے ہمراہ جلوس میں پیدل چلتی ہوئی دیگر خواتین رہنماؤں میں سب سے نمایاں بیگم سلمٰی بدرالدین تھی جس کے عقب میں میرانی کسی سائے کی طرح چلتا ہوا آ رہا تھا۔ سلمٰی نے تو سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا مگر فیاض کی نگاہ میرانی کے ساتھ ٹکرا ہی گئی۔ میرانی کے ہونٹوں پر در آنے والی مخصوص مُسکراہٹ فیاض کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ اُس نے آگے بڑھ کر سلمٰی بی بی کے کان میں کوئی مُخبری سی کی۔ سلمٰی نے بھی مُسکرا کر سَر کو اِس طرح سے جنبش دی

کہ جیسے یہ خبر کسی رَدی اخبار میں سے پڑھ کر سُنائی گئی ہو۔

''آخ تھو......''

فیاض کو یوں لگا کہ اُس کا چہرہ پھر سے کسی لیس دار رطوبت سے لتھڑ گیا ہے۔ اُس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے مُنہ کو صاف کیا مگر وہاں تو اب بھی کچھ نہیں لگا ہوا تھا۔ فیاض نے گردن موڑ کر اُن دونوں کو ایک بار پھر دیکھنے کی کوشش کی مگر ایک دم ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ عجیب سے دھوئیں کے گولے اُس کے چاروں جانب گر رہے تھے کہ جن میں سے نکلنے والا سفید دھواں مُنہ سَر پر سُرخ مرچوں کا لیپ کیئے جا رہا تھا۔ آنکھوں میں سے بہتا ہوا مسلسل پانی اور کھانسی سے سینہ پھٹ رہا تھا۔ لوگوں نے چیخنا چلانا شروع کیا کہ پولیس نے بے محابہ آنسو گیس چلانی شروع کر دی ہے۔

پہلے تو لوگوں میں ابتری پھیلی مگر حالات کا ادراک کرتے ہوئے مظاہرین نے بھی آنسو گیس کے وہی شیل پولیس کی جانب پھینکنا شروع کر دیے جو انہیں مارے جا رہے تھے۔ باقی تین اطراف کی پولیس تو دور دور تھی مگر پولیس کا وہ دستہ جو فرید گیٹ کے اندر سے نکلا اُس نے لوگوں کو سنبھلنے تک کا موقع بھی نہ دیا کہ وہ جان سکیں یہ آنسو گیس آ کہاں سے رہی ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب سُرت آئی تو لوگوں نے اینٹوں کے ٹوٹے اُکھیڑ کر فرید گیٹ کے اندر کا رُخ کر لیا۔ پولیس نے اتنی بڑی تعداد میں خلقت کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ایکدم اُن پر سیدھا فائر کھول دیا۔ اِس کے بعد کیا ہوا، کتنے مرے اور کتنے زخمی ہوئے، کون گنتا اور کس کے لیے گنتا۔ ساٹھ ستر ہزار لوگوں پر کتنی دیر تک اندھا دھند گولی چلی مگر سرکاری اعلان صرف دو لوگوں کے مرنے کا ہوا۔

(37)

25اپریل 1970ء ___ صبح سویرے سورج نکلنے سے بہت پہلے قلعہ ڈیراور سے کئی میل آگے ریت کے ٹیلوں کے درمیان ایک پُرانا ٹرک کھڑا تھا جس کے ساتھ ایک پولیس کی جیپ اور جیپ میں سے شکن آلود وردیوں اور رَت جگے سے نُچڑی ہوئی شکلوں والے دس بارہ سپاہی بھی اُتر کر کھڑے ہوئے تھے۔اُن کے ہمراہ کچھ مزدور نوجوان بھی تھے جن کے کپڑوں پر جا بجا انسانی خون کے خشک ہو چکے داغ صاف دکھائی دے رہے تھے۔کندھوں پر کدال رکھے، سوکھے ہوئے چہروں والے ونگار پر بلائے گئے یہ مزدور کسی حکم کے انتظار میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔اُن کے پیاسے ہونٹوں پر چھلکوں کی طرح اُترتی ہوئی باریک جلد خود بتا رہی تھی کہ وہ کئی گھنٹوں سے بھوکے اور پیاسے ہیں۔

کُچھ دیر کے بعد تھانیدار کی وردی میں ملبوس اَفسر نے اُن کو ٹیلوں کے درمیان قدرتی طور پر بنی ہوئی پیالہ نما جگہ کو کچھ اور کھودنے کا اشارہ کیا تاکہ کل فرید دروازے پر کی جانے والی فائرنگ کے مقتول ریاستیوں کو آج کا سورج اُبھرنے سے پہلے گمنام تدفین کی نذر کر دیا جائے کہ جو صوبہ مانگنے کی جدوجہد میں مرنے کے بعد بھی مقتولین کی گنتی میں شمار نہیں کیے گئے تھے۔کھدائی

ابھی ایک ایک فٹ بھی نہ ہوئی تھی کہ اندر سے پرانے سوکھے ہوئے انسانی ڈھانچے ظاہر ہونے لگے۔ مزدور ڈر کر اِدھر اُدھر ہونے لگے تو تھکاوٹ سے اَدھ مرا ہوا تھانیدار بھی ہنس دیا۔

''کھودو کھودو بہن بھنکو...... یہ تو بنی بنائی قبر ہے۔ یہیں دفن کرتے ہیں ان بہن تڑیکوں کو''۔ مزدوروں نے ڈرتے ڈرتے کچھ اور صفائی کی تو نیچے سے پانچ انسانی پنجر اپنے آخری لباس سمیت نکل آئے۔ لباس سے لگ رہا تھا کہ اِن میں سے تین مرد اور دو عورتیں رہی ہوں گی۔

''ہڈیاں ہیں تو بہت پرانی مگر یوں لگتا ہے کہ یہ راستہ بھول کر پیاس سے مر گئے ہوں گے اور پھر ہوا نے اِن پر ریت لاد کر یہاں ٹیلا بنا دیا ہوگا''۔ تھانیدار نے اپنے طور پر تفتیش مکمل کرتے ہوئے مزدوروں کو ایک بار پھر تین چار گالیاں اکٹھی دیں کہ جلدی جلدی ٹرک میں رکھی لاشیں نکال کر گڑھے میں ڈالیں۔ مزدوروں نے بھی مزید کھدائی کئے بغیر ٹرک میں سے لاشیں نیچے گھسیٹنی شروع کر دیں اور اُتنی ہی تیزی سے ایک ایک کر کے گڑھے میں ڈالنے لگے۔

سب سے پہلی لاش تمام عمر اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں رہنے والے فیاض کی تھی۔ اُسے اُٹھا کر پھینکا گیا تو وہ ایک نسوانی ڈھانچے کے ساتھ جُڑ کر جا گری کہ جس کے گلے میں بڑے بڑے سُرخ موتیوں کی دہری مالا دور سے بھی صاف دِکھائی دے رہی تھی۔ دونوں کے دائیں ہاتھ کی اُنگلیاں اِس طرح ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی تھیں کہ جیسے ایک دوسرے کی تکریم کر رہی ہوں۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ دونوں ایک ہی منزل کے مسافر رہے ہوں اور آج پھر کسی نئے سفر پر روانہ ہونے کے لیے اکٹھے ہو گئے ہوں۔ باری باری تمام لاشیں ایک دوسرے کے اوپر گرا دی گئیں۔ مزدور ابھی اِن کے اوپر ریت گھسیٹ کر ڈالنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ہر طرف دھوں اندھار ہو گیا۔ شدید آندھی تھی یا کوئی واجھلورا لیکن جو کچھ بھی تھا اُس کی شدت نے وہاں موجود لوگوں کو حواس باختہ کر دیا۔ سبھی پولیس والے اور سارے مزدور مُنہ سَر لپیٹ کر کسی مناسب پناہ کی تلاش سے پہلے جہاں کھڑے تھے وہیں بیٹھ گئے۔

آدھے گھنٹے کے بعد آندھی رُکی تو گڑھے والی جگہ پر نئے سرے سے ریت کا نیا ٹیلہ

وجود میں آ چکا تھا۔ کوئی نہ جان سکا کہ دوسرے کئی اُدھ اُدھورے لوگوں کی مانند اپنی اور اپنی دھرتی کی شناخت کے متلاشی فیاض کی تلاش کا سفر صرف یہیں تک تھا یا یہیں سے آغاز ہو رہا تھا۔

اسلام آباد: 22 مارچ 2018ء

ترجمہ: 19 نومبر 2018ء

وَن یونٹ پاکستان کی سیاسی تاریخ کا سیاہ باب کہ جس کے سبب حکمران ذہنی ساخت نے بیک جُنبشِ قلم محکوم لِسانی ثقافتوں سے اُن کی تمام تر تہذیبی، تاریخی اور جغرافیائی پہچان سازشاً چھین کر اپنی غاصبانہ تحویل میں لے لی۔ صدیوں سے اِس خطے میں رہنے والے کروڑوں لوگ شب بھر میں اپنی شناخت کے بحران میں یوں مبتلا کیے گئے کہ زندہ رہنے کا ہُنر تک بُھلا بیٹھے۔ ''اَدھ اَدھورے لوک'' پتا ہے ریاست بہاول پور میں جنم لینے والے فیاض جیسے اُن بدقسمت کرداروں کی، جن کی زندگی محض اِس لیے کبھی نہ پوری ہونے والی خواہشوں کی بھینٹ چڑھ گئی کہ وہ تقسیم ہند کے مضمرات میں سے گزرتے ہوئے وَن یونٹ جیسی سیاسی جکڑ بندی کے ٹوٹنے اور بہاول پور صوبہ بحالی کی اُمید میں اپنی غصب شدہ پہچان تلاشنے کے سفر پر نکلے تھے۔ سرائیکی میں تحسین اور پذیرائی کے بعد اب یہ ناول اُردو زبان میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ملتان انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اینڈ ریسرچ، ملتان

email: insafond@yahoo.com

ISBN: 978-969-9782-17-6

9 789699 782176

Price: Rs. 400.00